''چہارسُو''

...... ایک سچی اور کھری شاعری ......

میں پروین شیر کو ذاتی طور پر بہت کم جانتا ہوں۔ برسوں پہلے شکاگو کی ایک کانفرنس میں ان کی ایک جھلک دیکھی تھی اور پھر ٹورونٹو، کینیڈا میں بڑے بیٹے ڈاکٹر ارون کی ایک بھرپور پارٹی میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر ارون کو اردو شاعروں اور ادیبوں سے ملنے کا اشتیاق ابھی تک ہے اور وہ ان کی قدر بھی کرتے ہیں۔ اس نے مجھ سے ٹورونٹو کے تمام ادیبوں اور شاعروں کے نام لیے اور نہایت دلجمعی اور احترام سے ان کو مدعو کیا۔ اسی اجتماع میں پروین شیر بھی تشریف لائی تھیں۔ وہ شعر بھی کہتی ہیں اور بنیادی طور پر ایک آرٹسٹ بھی ہیں۔ نہایت ذہین، شائستہ اور خاموش الطبع۔ کاش میری ان سے ملاقات پہلے ہوئی ہوتی۔

کچھ برس پہلے پروین شیر دہلی بھی تشریف لائی تھیں۔ چونکہ یاداللہ ان سے ہو چکی تھی ان کا فون آیا کہ میں ان کی اگلی کتاب کو دیکھوں۔ میرے پاس ہر سال سیکڑوں کتابیں آتی رہتی ہیں۔ اس عمر میں ہر چیز کا پڑھنا محال ہے۔ چند ہی روز بعد ایک بڑا لفاف ملا جس میں نظمیں تھیں۔ میں نے لفافہ کھولا تو بے خبری سے ان نظموں کو پڑھتا چلا گیا۔ اور حیرت یہ کہ ان کے سحر میں کھو گیا۔ پروین شیر اتنی اچھی اور کھری شاعر نکلیں کہ میں دنگ رہ گیا۔ تخلیقیت اور دل سوزی میں ڈوبی ہوئی ایسی پُر اثر آواز جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ مجھے نہیں معلوم کسی نے ان کی صحیح قدر افزائی کی ہو۔ نظموں میں یورپی اور فرانسیسی اثرات نے کچھ جادو سا گھول دیا ہے۔ میں سکتے میں رہ گیا۔ پروین شیر بے شک جینوئین شاعر ہیں۔ اکثر رسالوں میں ادھر ادھر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن نئی بستیوں کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ وہ شاعر جو اصلاً نا شاعر ہیں لیکن انھیں پی آر کی شاطری آتی ہے وہ ہی شاعروں میں دندناتے پھرتے ہیں۔ اور اگر کوئی غیرت مند اور سچا اور کھرا شاعر ہے اور اتفاق سے خاتون بھی ہے تو پھر اس کی پذیرائی ہو نہ ہو یہ محض اتفاق ہے۔

آج میں علی الاعلان لکھ رہا ہوں کہ پروین شیر سچی اور کھری تخلیقیت اور دل گداختہ رکھتی ہیں۔ میں تو ان کی صحیح قدر نہ کر سکا لیکن مجھے یقین ہے کہ آنے والی نسلوں میں جو صاحبان نظر ہیں اور پوری دل سوزی سے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں ان سے پروین شیر کی تخلیقیت ضرور خراج تحسین وصول کرے گی۔ انھیں نظم کے تقاضوں کو نبھانے کا اور شاعری کا حق ادا کرنے کا پورا سلیقہ ہے۔ وقت اگرچہ بے رحم ہے لیکن سب سے بڑا منصف بھی ہے۔ اس کی کسوٹی کبھی گمراہ نہیں کرتی۔ من نہ کردم شما حذر بہ کنید۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا تازہ مجموعہ ''بے کرانیاں'' شوق سے پڑھا جائے گا۔

گوپی چند نارنگ

متاعِ چہارسو

☆

قرطاسِ اعزاز
ڈاکٹر بیگ احساس
کے نام

سرمئی شام کا اُجالا

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

نام : محمد بیگ
قلمی نام : بیگ احساس
والد : مرزا خواجہ حسن بیگ
وطن : حیدرآباد دکن
تاریخ پیدائش: 10 ر اگست 1948ء

پتہ:

8-1-398/PM/416، یاسر انکلیو، فلیٹ نمبر 401، پیراماونٹ ہلز، ٹولی چوکی، حیدرآباد 008 500

فون : 9849256723

تعلیم:

بی۔اے، عثمانیہ یونیورسٹی، 1975ء
ایم۔اے (اردو) عثمانیہ یونیورسٹی، 1979ء
پی۔ایچ۔ڈی (اردو)، یونیورسٹی آف حیدرآباد، 1985ء

شادی: 22 ر دسمبر 1975ء

اولاد: فرح تزئین، مرزا خاور حسن بیگ، شیبا سمین، ثوبیہ نوشین، مرزا کاشف حسن بیگ، مرزا اعماد بیگ

مشاغل، ملازمت:

لکچرار، عثمانیہ یونیورسٹی، 1984ء
ریڈر، عثمانیہ یونیورسٹی، 1992ء
پروفیسر، عثمانیہ یونیورسٹی، 2000ء
پروفیسر یونیورسٹی آف حیدرآباد، 2006ء
صدر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، 2006-2000ء
صدر شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد، 2013 - 2007

مدیر: ماہنامہ ’’سب رس‘‘ حیدرآباد

مطبوعات:

۱۔ خوشۂ گندم (افسانوی مجموعہ)، انجمن معمار ادب، 1979ء
۲۔ حنظل (افسانوی مجموعہ)، مکتبہ شعر و حکمت، 1993ء
۳۔ کرشن چندر: شخصیت اور فن (تحقیق)، شعر و حکمت، 1999ء
۴۔ شورِ جہاں (تنقیدی مضامین)، مکتبہ شعر و حکمت، 2005ء
۵۔ ہزار مشعل بکف ستارے (انتخاب)، 2005ء
۶۔ مرزا غالب (تعلیم بالغان)، 2004ء
۷۔ بوجھ کیوں بنوں (تعلیم بالغان)، 2004ء
۸۔ شاذ تمکنت (مونوگراف)، ساہتیہ اکیڈیمی، نئی دہلی، 2010ء
۹۔ دکنی فرہنگ (بہ اشتراک، ڈاکٹر ایم۔کے۔کول)، 2012ء
۱۰۔ دَخمہ (افسانوی مجموعہ)، عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2015ء

کہانیوں کا انگریزی ترجمہ:

Twilight of the Mind (Selected Short Stories of Baig Ehsas)

ٹوٹن مکھرجی، 2009ء

اداروں سے وابستگی:

۱۔ ممبر مشاورتی بورڈ برائے اردو، ساہتیہ اکیڈیمی، نئی دہلی، 2001 - 1998، 2006 - 2002، 2017 - 2013
۲۔ رکن تخلیقی پینل، کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2015ء سے
۳۔ ممبر گورننگ بورڈ، مرکز برائے تعلیم بالغان، 2004 - 2002، 2006 - 2005
۴۔ ممبر بھارتیہ گیان پیٹھ ایوارڈ، انتخاب برائے اردو زبان، 2012 - 2005
۵۔ ممبر ریویو کمیٹی، اردو پروگرام، اردو نیوز بلیٹن، پرسار بھارتی، دوردرشن کیندر، حیدرآباد 2009 - 2008
۶۔ رکن عاملہ، ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، 2010ء سے
۷۔ رکن عاملہ، مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، 2010ء سے
۸۔ رکن مجلس مشاورت، ’’دریافت‘‘ تحقیقی مجلّہ، یونیورسٹی آف موڈرن لنگویجس، اسلام آباد 2013 - 2006
۹۔ رکن مجلس مشاورت، ’’تخلیقی ادب‘‘ یونیورسٹی آف موڈرن لنگویجس، اسلام آباد 2013 - 2006
۱۰۔ رکن مجلس ادارت ’’ادب و ثقافت‘‘ تحقیقی مجلّہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد 2017ء سے
۱۱۔ رکن مجلس ادارت ’’ترسیل‘‘ تحقیقی و تنقیدی مجلّہ، نظامت فاصلاتی تعلیم، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، کشمیر 2016ء سے
۱۲۔ صدر، انجمن ترقی پسند مصنفین، حیدرآباد، 2017ء سے
۱۳۔ صدر، حیدرآباد لٹریری فورم 2016 - 2013ء
۱۴۔ ایڈیٹر ’’اقبال ریویو‘‘ اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد کا ترجمان 2002 - 2000
۱۵۔ معتمد مجلس علمیہ، اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد 2004 - 2000

بیرونی ممالک کا سفر:

۱۔ پاکستان 1989ء

۲۔ لندن 2005ء

۳۔ ریاض 2008ء

انعامات واعزازات:

۱۔ بیسٹ ٹیچر ایوارڈ، آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی 2002ء

۲۔ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی، 2013ء

۳۔ بیسٹ رائٹر ایوارڈ، تلنگانہ اسٹیٹ 2016ء

۴۔ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ (افسانوی مجموعہ ''دخمہ'')، 2017ء

دیگر سرگرمیاں:

۱۔ نہرو سنٹر، لندن کے زیر اہتمام منشی پریم چند کے 125ویں یوم پیدائش کے موقع پر منعقدہ سمینار میں شرکت

۲۔ ہندوستانی بزم اردو، ریاض کی جانب سے منعقدہ ''بیگ احساس کے ساتھ ایک شام'' میں شرکت، فن اور شخصیت کے بارے میں ڈیجیٹل، سوینیر کی رسم اجراء

۳۔ قومی اور بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کی اور قومی بین الاقوامی سمینار اور ورک شاپس کا اہتمام کیا۔

۴۔ گلبرگہ یونیورسٹی اور گری راج کالج، نظام آباد کے نصاب میں افسانوں کو شامل کیا گیا۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن:

۱۔ گزشتہ چالیس برس میں ریڈیو اور ٹی وی کے مختلف پروگراموں اور مذاکروں میں حصہ لیا۔

۲۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لیے ''انتظار حسین'' سے انٹرویو لیا۔

۳۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لیے ''اردو ادب اور ہندوستانی سنیما'' کے عنوان سے ویڈیو پروگرام میں حصہ لیا۔

۴۔ بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کے لیے بے شمار ویڈیو اسباق تیار کیے۔

فن اور شخصیت پر تحقیقی کام:

۱۔ ''بیگ احساس کے افسانوی مجموعہ ''حنظل'' کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان پر محمد اشرف نے ایم۔فل کا مقالہ لکھ کر جموں یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی۔

۲۔ محمد یحییٰ نے ''بیگ احساس، فکر و فن'' کے عنوان سے پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ساگر یونیورسٹی میں داخل کیا۔

۳۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں بیگ احساس کے فن پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔

خصوصی گوشہ:

۱۔ ماہ نامہ ''سب رس'' حیدرآباد، جنوری 2002ء

۲۔ سہ ماہی ''استعارہ'' دہلی، ستمبر 2003ء

بقیہ: دخمہ

''پارسی ڈشس بنوائی ہیں آپ کے لیے۔۔۔''

ہم کھانے کی میز پر آ گئے۔ زندگی میں پہلی بار پارسی ڈشس کھانے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ اس لیے بھی زیادہ انکار نہ کر سکے۔

''یہ براؤن رائس ہے۔ یہ دَھن سَک یہ ساس اِن مچھی اور یہ کچومر سلاڈ''

براون رائس باسمتی چاول کی عمدہ ڈش تھی جس میں چینی اور کالی مرچ شامل تھی۔ دَھن سَک تور کی دال' مونگ کی دال اور اُڑد کی دال' انڈے ٹماٹر اور کھیرے سے بنائی گئی ڈش تھی۔ ساس اِن مچھی میں بہترین پمفرٹ تھی ساتھ میں کرارے چکن پارچہ بھی تھے۔ کھانا واقعی لذیذ تھا۔ آخر میں موامی بوئی نام کا مچھلی کا میٹھا پیش کیا گیا۔ ہم نے بہت سیر ہو کر کھایا۔ سہراب کی مہمان نوازی نے ہمیں بہت متاثر کیا۔

اور آج اطلاع ملی کہ سہراب مر گیا۔

مجھے بار بار یہی خیال آتا تھا کہ ''مئے کدہ'' کے بند ہو جانے کا اس پر بہت اثر ہوا ہوگا۔ اس لیے شاید وہ زیادہ جی نہ سکا ہو۔ میں Guilty محسوس کر رہا تھا۔ اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔ دور کے رشتے دار اور چند احباب تھے۔

پارسی باہر آ رہے تھے۔ سہراب کی برہنہ نعش کو دَخمہ کی چھت پر چھوڑ دیا گیا ہوگا۔ میں بار بار آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ بہت سے پارسی بھی رک گئے تھے۔ اگر گدھ نہ آئیں تو؟ کیا سہراب کی نعش دھوپ میں سوکھتی رہے گی؟ کاش سہراب نے الکٹرک بھٹی کو ترجیح دی ہوتی میں سوچ رہا تھا۔

میں نے غیر ارادی طور پر آسمان کی طرف دیکھا۔ مجھے بچپن کا وہ منظر دوبارہ نظر آنے لگا۔ گِدھوں کا ایک جھنڈ تیزی سے دَخمہ کی طرف آ رہا تھا۔ پارسیوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ بیس برس بعد یہ منظر لوٹا تھا۔

''پتہ نہیں کہاں سے آئے ہیں؟'' وہ ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے۔

''اگر فرش پر چینی گر جائے تو چیونٹیاں کہاں سے آتی ہیں؟'' کوئی میرے کان میں پھسپھسایا۔

آگ کا دریا

پروفیسر بیگ احساس

جب ہم لکھنے بیٹھتے ہیں تو تکنیک خود بخود دوارد ہوتی ہے۔اس کے لیےضروری نہیں کہ لکھنے والا اس پر پہلے سے سوچے۔ایک موسیقار کے ساتھ تو یہ مشکل ہے کہ ایک راگ کے لیے خواہ وہ تکنیک میں تبدیلی کرے بنیادی اصولوں سے انحراف ممکن نہیں لیکن میرے لیے یہ مشکل نہیں ہے۔کوئی بھی مختصر سا منظر یا کوئی امیج جو میری یادوں میں موجود ہو مجھے تحریک دیتا ہے اور میں لکھنا شروع کر دیتی ہوں۔تکنیک خود بخود پیدا ہوجاتی ہے۔(طلوع افکار،کراچی،مئی ۱۹۸۸ءقرۃالعین حیدر سے انٹرویو،سکریتا پال)

تکنیکی اعتبار سے قرۃالعین حیدر کے جس ناول کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی وہ ''آگ کا دریا'' ہے۔اس ناول پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ قرۃ العین حیدر نے ورجینیا وولف کے ناول Ornaldo سے تاثر قبول کیا ہے جب کہ قرۃالعین حیدر نے ''آگ کا دریا''(۱۹۸۹ء) کے دیباچے میں اس بات کی وضاحت کی کہ انھوں نے ورجینیا وولف کا ناول ''Ornaldo''، ''آگ کا دریا'' لکھنے کے بعد پڑھا۔حقیقت جو بھی ہو لیکن قرۃالعین حیدر نے ''وقت'' کے ساتھ جو تجربہ کیا ہے وہ اردو ناول نگاری میں پہلی کامیاب کوشش ہے۔لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس ناول سے تیس پینتیس برس قبل عالمی ادب میں ''وقت'' پر عظیم ناول لکھے جاچکے تھے۔شعور کی رو کے بے شمار تجربے کیے جاچکے تھے۔تجربہ کرنے والوں میں برداش،کونراڈ،ہنری جیمس،جیمس جوائس،ڈورتھی رچرڈسن،ورجنیا وولف اور ولیم ولکز وغیرہ اہم ہیں۔ان کے بعد Gertrude، Serin،Robbe-Grillet،Michael Butor تھالی سروت نے نئے تجربے کیے اور ناول کے روایتی انداز کو توڑا۔ان ناول نگاروں نے ''وقت'' کے ساتھ جو ناول کی ساخت میں تبدیلی کی اس کا سرچشمہ برگساں ہے۔

Wyndham Lewis نے پنی کتاب Time & Western Man میں لکھا ہے کہ ٹائم فلاسفی کا نھا بیج اگر برگساں نہ لگاتا تو نہ پولیس ہوتی اور نہ (ہراوست کی) A La Recher Che Der Temps Pesdu ہوتی ہے۔کرستیوا کہتا ہے کہ کوئی بھی ادبی کتاب Isolated Phenomenon نہیں ہوتی بلکہ وہ Absorption and Transformation of another ہوتی ہے۔اس لیے ایک دوسرے کے اثرات سے انکار کرنا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔

بیسویں صدی میں ''وقت'' پر جو تجربے کیے گئے اس کے باعث Time Novel جیسی اصطلاح رائج ہوئی۔ J.A. Cuddon نے ٹائم ناول کی یہ تعریف کی ہے جس میں شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہو اور جس میں وقت ایک اہم تھیم کی حیثیت سے ابھر کر آتا ہے۔''آگ کا دریا'' کو بھی ہم ''ٹائم ناول'' قرار دے سکتے ہیں کیوں کہ اس میں شعور کی رو کی تکنیک کا بھرپور استعال کیا گیا ہے۔

رابرٹ ہمفری نے شعور کی رو کو پیش کرنے کے چار بنیادی طریقے بتائے ہیں:''راست داخلی کلام(Direct Interior Monologue)، بالواسطہ داخلی کلام(Indirect Interior Monologue)، ہمہ بین مصنف کا بیان(Ominiscient Authro's Description)اور خودکلامی(Soliloquy) ہے۔

قرۃالعین حیدر نے ان طریقوں کو فنکارانہ انداز میں برتا ہے۔خاص طور پر''ہمہ بین مصنف کا بیان والی تکنیک'' کا بخوبی استعمال کیا ہے۔اس میں بیان کی ساری ڈوریاں مصنف کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ Ominiscient کا مطلب سب کچھ جاننا ہے۔اس تکنیک میں مصنف اپنی رو میں اپنے کردار کی شعور کی رو کو بیان کرتا ہے اور بالواسطہ داخلی کلام میں وہ صرف کردار کے شعور کی رو کو پیش کرتا ہے۔اس تکنیک کے لیے Third Person کا استعمال ہوتا ہے۔یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''شام کو وہ چند کاغذات لینے کے لیے سرل کے کالج گئی۔رات کی ٹرین سے بہت سے ساتھی اپنے اپنے ملکوں کو لوٹ رہے تھے۔سینور کارلوس برازیل جارہا تھا۔اس سے اس کی تکرار رومن کیتھولک فلسفے پر ہوتی تھی۔لڑکیاں اورلڑکے بارش سے بچنے کے لیے پھاٹک کے اندر کھڑے تھے۔پھاٹک کا بھاری پندرہویں صدی کا چوبی دروازہ اب آخری بار کھل کر بند ہوگیا۔اس کے بعد جب وہ یہاں آئیں گے تو سب کچھ تبدیل ہو چکا ہوگا۔بارش اور زور سے ہونے لگی۔پورٹر ٹیکسیاں لے کر آرہے تھے۔لڑکوں نے برساتیوں کے کالر کان تک اٹھالیے تھے۔لڑکیاں چھتریاں کھول رہی تھی۔سب خاموش تھے۔اب بات کیا کرنا کس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔مثلاً ڈورس سے یہ کہنا کہ جب میں اسٹیٹ آئی تو تم سے ملنے نارتھ ڈیکوٹا ضرور آؤں گی۔یامنیٹ یہ کہہ سکتی تھی کہ جب نیوزی لینڈ آؤ تو میرے ہاں ہی آکر ٹھہرنا۔یہ سب کس قدر مسخرے پن کی بات تھی۔اگر یہ آخر وقت خدا حافظ کہنے کا سلسلہ نہ ہوا کرے تو انسان کس قدر زبردست کوفت سے بچ جائے مگر نہیں۔کھڑے ہیں بے ربط،بے تکے جملے ادا کیے جارہے ہیں،نظریں بچا بچا کر آنسو پیے جارہے ہیں۔لاحول ولاقوۃ۔ٹیکسیاں آئیں اور سب ایک ایک کر کے اس میں بیٹھ گئے۔پھاٹک بند ہوگیا۔ایک بار اس نے گھوم پھر کر سنسان کواڈ رینگل کا کر لگایا''(ص۸۵۔۴۸۴)

ہم تمام تر بیان کے دوران چمپا کے ذہن میں رہتے ہیں اور چمپا کے نقطہ نظر سے کالج کی گہما گہمی دیکھتے ہیں۔چمپا کے ان جذبات کو محسوس کرتے ہیں

جسے اس نے Speech Level پر اظہار نہیں کیا۔اس میں Third Person کا استعمال ہے اور یہ بیانیہ تکنیک ہے۔

خود کلامی کا مطلب اپنے آپ سے باتیں کرنا ہے۔اپنے خیالات یا محسوسات کا باآواز بلند اظہار ہے۔خود کلامی ایک طرح سے کردار کے ذہن کی Live Commentary ہے۔''آگ کا دریا'' کا یہ اقتباس ہے دیکھئے:

''سامنے دیودار کا جنگل ہے۔سرخ پتوں نے چاروں اور آگ لگا رکھی ہے۔وادی میں ترمینس مکانوں کے پیچھے الگنیوں پر پھیلے کپڑوں میں سے لہراتی اُتر کی اور جارہی ہیں۔پارک میں زرد پتے اڑ رہے ہیں۔جھیل میں ایک کشتی ڈولتی ہے۔آرام کرسیوں پر عسرت زدہ پنشن یافتہ بوڑھے اپنی بے یارومددگار آنکھوں کے سامنے دھند دیکھتے ہیں اور کانپتے ہاتھوں سے کاغذی لفافوں میں سے بن نکال کر کھا رہے ہیں۔آج کا دن ایک اور دن ہے۔پل پر سے انسانوں کے گروہ یونیورسٹی لاکورٹس سٹی کو جارہے ہیں۔میں کون ہوتی ہوں کہ اس اہمیت میں شامل رہنے سے انکار کروں ہاں یہ بالکل صحیح ہے مجھے ڈر لگتا ہے روشن نے سوچا'' جنگل کی سرخ روشنی میں چھپ گیا۔اس جنگل میں بھی گزری ہوں۔ہم سب گزرے ہیں۔میں نے اس میں ہیدر کے چھوٹے چھوٹے شگوفے جمع کیے تھے۔(طلعت نے کہا)،(ص۴۰۲)

یہ دو کرداروں روشن اور طلعت کی خود کلامی ہے۔روشن سے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ ''روشن نے سوچا'' گویا جو کچھ بیان کیا گیا وہ روشن کی سوچ ہے۔طلعت کے لیے توسین میں لکھا گیا ہے کہ طلعت نے کہا Speech Level پر کہا یا نہیں یہ نہیں کہا جا سکتا۔یہاں طلعت کسی سے مخاطب بھی نہیں ہے۔یہ طلعت کے ذہن میں چل رہی سوچ ہے۔اسے پڑھتے وقت طلعت کے کردار اور ہمارے بیچ مصنف موجود حائل نہیں ہے اور ہم براہِ راست روشن اور طلعت کی شعور کی رو میں شامل ہو جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر اپنے کرداروں کے شعور کے کچھ تاریک گوشوں پر روشنی ڈالتی ہیں لیکن ان گوشوں کو پوری طرح Expoose نہیں کرتیں انھیں سنسر کر کے اور باضابطہ Decorate کر کے پیش کرتی ہیں۔ہمیں اس ناول میں سنسر شدہ زیریں گفتگو جگہ جگہ بکھری پڑی ملتی ہے۔

''آگ کا دریا'' میں اکثر جملے Abstract نوعیت کے ہیں۔یہاں بعض اوقات ایسی گفتگو کی گئی ہے جو حقیقت میں وقوع پذیر نہیں ہوئی بلکہ کرداروں کے بیچ ایک زیریں لہر چل رہی ہے:

''سندیشور؟ روشن بھاگتے بھاگتے تھک کر ایک پگڈنڈی پر بیٹھ گئی، تمہاری حقیقت دھند لکے میں چھپی ہے۔عامر رضا نے انگلی اٹھا کر واضح کیا، میں اس کے سفر میں شامل رہوں؟ اس نے کہا اور گھاس پر بیٹھ کر غور و فکر میں ڈوب گیا''(ص۴۱۵۔۴۱۴)

شعور کی رو کے سلسلے میں کبھی کبھی کسی پیچیدہ نفسیاتی مرحلے کو پیش کر کے مصنف کوئی نظم یا آزاد نظم یا Droggered تحریر کرتا ہے۔آگ کا دریا میں قرۃ العین حیدر نے دانستہ طور پر نثر میں آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔چھوٹے چھوٹے فقروں پر مشتمل پیراگراف تحریر کیے ہیں۔اس میں انھوں نے Hyphen (خط فاصل) لگائے ہیں۔اگر یہ خط فاصل نکال دیئے جائیں تو وہ پیراگراف اس طرح پڑھا جا سکتا ہے:

ان بیتوں کو جگمگانا ہے سدا
ان کھیتوں کو لہلہانا ہے سدا
ہم، کیا گورے کیا کالے
سب ایک ہیں۔ایک ہیں
ہم موت پر ہنسنے والے سب ایک ہیں
ایک ہیں، کہہ رہے ہیں ہم ہیں شکتی مان
اور وشوامانت پہ ست گان
خطرہ ہو بلیدان کا
خطرہ ہو بلیدان کا
جوانیاں ہیں گا رہی
ہنسی خوشی منا رہی
دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان
نوجوان (ص۴۱۵)

ان چھوٹے چھوٹے فقروں کے آہنگ سے انھوں نے بیک وقت کئی Stream یا روئیں پیدا کی ہیں۔ہر رو کسی کردار کے شعور سے تعلق رکھتی ہے۔بیک وقت کئی روؤں کو اس طرح پروجیکٹ کیا گیا ہے کہ ہم ان کرداروں کو شناخت نہیں کر سکتے۔اس طرح کی ایک اور مثال ہے جس میں آہنگ صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

آج کا دن اور دن ہے
پل پر سے انسان کے گروہ
لاکورٹس سٹی کی اور جا رہے ہیں
میں کون ہوتی ہوں کہ
اس اہمیت میں شامل رہنے سے انکار کروں
ہاں یہ بالکل صحیح ہے
مجھے ڈر لگتا ہے
چوزے کے سرائے میں وہ سب
سرخ میزوں کے گرد جمع
باتوں میں مصروف ہیں
یہ کون لوگ ہیں؟
کیا یہ Zero Hour ہے؟

مجھ سے بہت فاصلے پر
لڑائیاں جاری ہیں
اور سال یہاں ختم ہوا جاتا ہے
کیا یہ صحیح ہے کہ
ایک کرائسس آ کر گزر گیا؟
میں کیوں فکر کروں
جب کہ آج کی تہلکہ خیز خبریں
کل رڈی میں بکتی ہیں؟ (ص۴۰۲)

فکشن میں شعور کی رو کو قابو میں رکھنے کے لیے آزاد تلازم کا استعمال کیا جاتا ہے۔ آزاد تلازمے کے بارے میں سبھی ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ نفس یا Psyche ایک مسلسل کیفیت ہے۔ یہ زیادہ عرصے تک کسی ایک چیز پر قانع نہیں رہتا۔ چوں کہ شعور کو کچھ نہ کچھ مواد چاہیے، یہ اسے آزاد تلازم کے ذریعہ مل جاتا ہے یعنی ایک چیز کسی دوسری چیز کی طرف لے جاتی ہے، دوسری چیز کسی اور چیز کی طرف۔ یہ چیزیں ایک دوسرے سے اس لیے رشتہ قایم کر لیتی ہیں کہ یا توان میں کچھ مشترکہ خصوصیت ہوتی ہیں یا یہ بالکل ایک دوسرے کے برعکس ہوتی ہیں۔ یا ان میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو بے ساختہ دوسرے کی یاد دلاتی ہے اس کو آزاد تلازم کہتے ہیں۔ رابرٹ ہمفری تلازم کو قابو میں رکھنے کے لیے تین چیزیں ضروری سمجھتا ہے:

(۱) یادداشت (۲) احساس اور (۳) تصور

''آگ کا دریا'' میں قرۃ العین حیدر نے آزاد تلازم کی تکنیک کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے۔ انھوں نے آزاد تلازم کے ذریعہ رو یعنی Stream کو جس عمدگی سے پیش کیا ہے اس کی ایک مثال دیکھئے۔ واقعہ یہ ہے کہ گوتم مڈہرسٹ کے ایک سینی ٹوریم میں زیر علاج نرملا کی مزاج پرسی کے لیے آتا ہے۔ یہاں پر ایک گوتم وہ ہے جو کہ خارجی سطح پر نرملا کے سامنے بیٹھا ہے۔ اس سے باتیں کر رہا ہے لیکن حقیقی گوتم وہ ہے جس کے شعور میں اس وقت ہلچل جاری ہے:

''گوتم ڈوبتے دل سے اس کے قریب بیٹھ گیا مگر وہ بہت خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب وہ اس سے حسبِ معمول لندن کے تازہ ترین اسکینڈل سنانے کی فرمائش کرے گی۔ دوستوں کے جم غفیر کی فرداً فرداً خیریت دریافت کرے گی۔ بات بات میں جرح کرے گی نرملا 'تو' جس کا میں نے کبھی نوٹس نہ لیا تھا۔ اب تو میری روح میں شامل ہے۔ مگر وہ دولڑکیوں کو بیک وقت کس طرح چاہ سکتا ہے، یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا اور یہ لڑکی جس میں چمپا والی کوئی خطرناک خصوصیات موجود تھیں، سیدھی سادی خوش خلق معصوم لڑکی۔ چمپا جو 'ومن آف دی ورلڈ' بن چکی تھی ہمیشہ مردوں کو اپنی خطرناک کشش سے رجھاتی آئی تھی۔ تجربہ کار تھی اور زمانے کی اونچ نیچ دیکھے ہوئے مگر اس کے باوجود بے بس تھی اور اس کی توجہ کی منتظر تھی جو بستر مرگ پر پڑی تھی۔ گھریلو ناتجربہ کار، اس کی توجہ کی منتظر۔ وہ چمپا کو یکسر بھول جائے گا۔ کس قدر کوشش کے بعد پچھلے پانچ برسوں میں اس نے چمپا کو اپنے خیالوں کے دیس سے نکالا دے دیا تھا۔ ایک ملک اور دوستوں کے حلقے میں رہنے کے باوجود اس نے بڑی کامیابی سے احتراز کیا تھا۔ مگر اب چمپا کی پکار سے مقابلہ کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ یہ پکار میڈرڈ اور روم اور وی آنا میں بجتے آکسٹراز میں سنائی دیتی ہے، بارش کی پھواریں بازاروں اور طعام خانوں کی چہل پہل میں، اطلانتک کی لہروں میں، نیویارک کے شور وشغف میں، ہر جگہ یہ پکار اس کا پیچھا کرتی آ رہی تھی۔ آوازوں کے ظلم سے وہ عاجز آ گیا تھا۔ شاید سناٹا اس کے مقدر میں نہ تھا۔ چمپا آواز تھی۔ نرملا سناٹا۔ چمپا نے اس سے طرح طرح کی باتیں کی تھیں۔ لکھنو کے شاہ باغ میں کئی سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے، کوہی نگر کے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر سے گزرتے، ہوٹل کے ڈرائنگ رومز میں بیٹھے ہوئے، پلنگوں میں اودھم مچاتے ہوئے، اسے وہ سب باتیں یاد تھیں۔ وہ سب شامیں، دوپہریں، لمحات وہ سب سروں کا ایک تسلسل قایم تھا، اٹل اور مضبوط، کیوں کہ جب گیت ختم ہوئے تب بھی سُر فضا میں موجود رہتا ہے۔ نرملا خاموش تھی۔ برسات کی دوپہر کا سکون، جب بارش ہو کر کھلی ہو، کہر آلود سرسوں کے کھیتوں کا سناٹا۔ نرملا نے اس سے کبھی شخصی باتیں نہ کی تھیں۔ چمپا کے ہر لفظ ہر انداز کے ذریعہ دوسرے انسان سے ایک غیر مرئی Mystic رشتہ قایم ہو جاتا تھا۔

اسے یاد آیا مدتیں گزریں، جب وہ پہلی مرتبہ لکھنو گیا تھا۔ اس نے سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھ کر اپنی اس وقت کی محبوبہ شانتا نیلمبر کو خط میں لکھا تھا کہ گو مجھے آفیشیل طور پر بردکھوے کے لیے یہاں بلایا گیا ہے مگر میری منگیتر نرمل رانی کو اپنی الٹی سیدھی بحثوں ہی سے فرصت نہیں جو میری طرف توجہ کریں۔ ہاں نرملا میں بڑی شان اور تمکنت تھی۔ اس میں خود سپردگی کا انداز کبھی نہ آیا۔ وہ علاحدہ رہی تھی۔ غیر شخصی اور خاموش۔ دیبی کی طرح بلند اور اُتم، دیبی کی طرح سکون بخشنے والی اب مجھے تھوڑا سا سکون بخش دے۔ اس نے نرملا پر جھک کر دل میں کہا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''گوتم!''

''ہاں.....بی بی.....'' (ص۸۹۔۴۸۸)

یہاں سین کٹ ہو جاتا ہے۔ اس کٹنگ کے ساتھ ہی گوتم Speech Level پر واپس آ جاتا ہے اور کچھ ہی دیر میں وہ نرملا کی فرمائش پر سریکھا کے فلیٹ کا جغرافیہ بیان کرتا ہے۔ اس طویل اقتباس میں یادداشت احساس اور تصور کے ذریعہ آزاد تلازم کو قابو میں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

گوتم چمپا کے قریب بیٹھا ہے..... محسوس کرتا ہے کہ وہ خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ نرملا سے متعلق اندازہ قایم کرتا ہے کہ وہ حسب معمول

لندن کے تازہ ترین اسکینڈل وغیرہ سنانے کی فرمائش کرے گی۔محسوس کرتا ہے کہ نرملا اس کی روح میں شامل ہے اسی کے ساتھ اسے تعجب ہوتا ہے کہ وہ دولڑکیوں کو کس طرح چاہے گا۔اس کے ساتھ ہی اسے چمپا یاد آتی ہے۔اسے چمپا کی خطر ناک کشش یاد آتی ہے۔وہ نرملا کی طرف لوٹ آتا ہے جو چمپا کے برعکس ہے۔وہ سوچتا ہے کہ چمپا کو بھول جائے اس کے ساتھ ہی اپنے گزشتہ پانچ برس کے تجربات یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس نے چمپا کو بھولنے کی کوشش کی۔وہ تصور کرتا ہے کہ کس طرح چمپا کی پکار اس کا پیچھا کرتی ہے۔وہ چمپا کو آواز اور نرملا کو سناٹا تصور کرتا ہے۔وہ چمپا کی باتیں یاد کرتا ہے (وہ سارے مقامات اسے کسی نیوز ریل کی طرح یاد آتے ہیں جہاں پر وہ چمپا سے ملا تھا) لکھنو کے بادشاہ باغ کی سڑکیں، کوسی نگر کے کھیتوں کی پگڈنڈیاں، گلفشاں اور سنگھاڑے والی کوٹھی۔ پروفیسر بنرجی کا گھر کیلاش کے ہوٹل کے ڈرائنگ روم، پلنگیں۔وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ تمام یادیں سروں کی تسلسل کی طرح قایم ہیں۔

وہ پھر نرملا کی طرف لوٹ آتا ہے۔نرملا کے لیے خاموشی کا پیکر تراشتا ہے۔گومتی کی خاموشی۔ برسات کی دوپہر کا سکون جب بارش ہوکر کھلی ہو۔ کہر آلود سرسوں کے کھیتوں کا سناٹا۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ نرملا نے اس سے کبھی شخصی باتیں نہیں کی تھیں۔شخصی باتوں کے ساتھ اسے چمپا یاد آتی ہے۔اسی کے ساتھ وہ زمانہ یاد آتا ہے جب وہ پہلی بار لکھنو گیا تھا۔اسے وہ واقعہ یاد آتا ہے جب اس نے اپنی اس وقت کی محبوبہ شانتا نیلمبر کو خط لکھا تھا۔خط میں اس نے نرمل رانی کے متعلق لکھا تھا، اس لیے وہ پھر ماضی سے حال میں آجاتا ہے یعنی شانتا نیلمبر سے نرملا کی طرف۔نرملا کی موجودگی کو محسوس کرتا ہے۔وہ نرملا کو ایک ایسی دیبی تصور کرتا ہے جو بلند اور اتم ہے اور سکون بخشتی ہے۔وہ داخلی خود کلامی کرتے ہوئے نرملا کے ماتھے کو چومتا ہے۔ان تمام تر واقعات کے دوران گوتم کا یہ پہلا فزیکل ایکشن ہے۔نرملا کے پکارنے اور گوتم کے جواب دینے کے ساتھ ہی گوتم کے شعوری منظر کی کٹنگ ہوتی ہے۔

شعور کی رو میں Cinematic Devices کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔فلم چوں کہ غیر متحرک چیزوں کو بھی متحرک کرنے کی طاقت رکھتی ہے اور اس سے نئے معنی وضع کرنے میں مدد ملتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے بھی غیر متحرک کو متحرک یا In-Animate کو Animate کرنے کی تکنیک سے استفادہ کیا ہے۔دو مثالیں دیکھئے:

لائبریری کی چھت پر سے ایک اکیلا چنڈول اڑتا ہوا نکل گیا۔ کتابوں کے الفاظ جلوس بنا کر چاروں اور پھیل گئے۔لاطینی، فرانسیسی، انگریزی کے بے معنی الفاظ کے معنی اگیا بھتال کی مانند منہ چڑا رہے تھے۔بہت سے الفاظ ٹیرس پر رکھی ہوئی توپ پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور اپنی پتلی پتلی، کالی کالی ٹانگیں ہلانے لگے۔توپ نے گرج کر اطلاع دی ''میرا نام لارڈ کارنوالس رکھا گیا تھا اور میں سرنگا پٹنم میں استعمال کی گئی تھی'' ٹیرس پر بیٹھے ہوئے پتھر کے شیر اور اوپر چھت کے منڈیر پر ایستادہ مجسمے زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔(ص۳۳۴)

کتابوں سے نکلے ہوئے الفاظ، پتھر کے شیر اور مجسمے متحرک ہو جاتے ہیں۔الفاظ ٹیرس پر رکھی توپ پر چڑھ کر اپنی اپنی پتلی پتلی کالی کالی ٹانگیں ہلاتے ہیں Cinematic Devices کی تشکیل فیڈ آوٹ، سلو اَپ، ملٹی پل ویو، مونتاژ، فلیش بیک، پانوراما، کلوز اپ اور کٹنگ سے ہوتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے ان سب کا بخوبی استعمال کیا ہے۔مونتاژ کے اس استعمال کو دیکھئے جو اردو ناولوں میں ایک انوکھا تجربہ ہے۔قرۃ العین حیدر نے اپنے اس ناول میں شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ ماسٹر مونتاژ تشکیل کیا ہے:

سرجو کی موجیں گوتم نیلمبر کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں۔ابوالمنصور کمال الدین نے کنارے پر پہنچ کر اپنا شیام کرن گھوڑا برگد کے درخت کے نیچے باندھا اور چاروں اور نظر ڈالی۔(ص۱۱۶)

یہ اقتباس دو مختلف Visual Shots پر مشتمل ہے:

شاٹ نمبر(۱) سرجو کی موجیں گوتم کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں

شاٹ نمبر(۲) ابوالمنصور کمال الدین نے کنارے پر پہنچ کر اپنا شیام کرن گھوڑا۔

ان دونوں شاٹس کو تسلسل کے ساتھ پیش کر کے قرۃ العین حیدر نے زمانہ قدیم سے زمانہ وسطیٰ میں کود لگائی ہے۔اس مدت کے گزر جانے کا نہ انھوں نے کوئی بیان کیا اور نہ کوئی وضاحت۔اس ناول میں فلمی تکنیک کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

''آگ کا دریا'' میں شروع سے آخر تک مختلف ادوار میں ہمیں کئی چہرے نظر آتے ہیں اور سب مختلف اور منفرد چہرے گویا متحد ہو کر دنیا کے ازلی اور ابدی انسان کی تشکیل کرتے ہیں۔کبھی کبھی یہ کردار ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں:

کیوں کہ جذبات اور خیالات کی سب سے اونچی چوٹی پر ہمیشہ وہی اکیلا کھڑا رہ جاتا ہے۔تنہا ازلی اور ابدی انسان جس کا نام گوتم ہے اور مائیکل اور ہری اور سرل اور کمال رضا۔اس کی تنہائی ان امٹ ہے۔(ص۵۴۷)

یہاں انسان ساری فضا میں کسی خوشبو کی مانند بکھرا پڑا ہے۔مختلف ادوار، مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں اور مختلف چہرے والا یہ انسان شاید ایک ہی چہرے کے مختلف عکس لیے گھومتا پھرتا ہے۔کبھی کبھی اسے اپنی شناخت کے درمیان الجھن کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے:

میں رادھا ہوں، میں سیتا ہوں، میں مریم گلولن ہوں، میں زرین طاہرہ ہوں۔ (۵۳۸)

اسی ناول کے ایک اور حصے میں مختلف ملکوں کے کردار یکجا ہوتے ہیں اور پھر وہ اپنے اپنے ملک میں ٹرانسفر ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر گوتم، روشن، مائیکل، سرل اور ڈینس وغیرہ دراصل ہندوستان، پاکستان، اسرائیل، امریکہ اور انگلستان میں جاتے ہیں اور اب وہ ایک دوسرے سے انفرادی سطح پر گفتگو

نہیں کرتے بلکہ اپنے اپنے جغرافیائی خطوں کے نمائندے بن جاتے ہیں۔

مسلسل وقت کے پیٹرن میں زندگی کے لیے کوئی خاص حد مقرر نہیں ہوتی۔ یہاں زندگی ہمیشہ سبک رفتاری سے بہتی رہتی ہے۔ یہاں زندگی جینے کے لیے کوئی خاص Life Span کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ مختلف دور آتے جاتے ہیں لیکن زندگی اسی طرح قایم رہتی ہے۔ وقت کی اسی پیٹرن میں انسان اپنی جڑیں بہت گہری محسوس کرتا ہے گویا وہ صدیوں سے جیتا آ رہا ہو:

"چمپا تمہاری عمر کتنی ہے"؟

"کئی سو سال..... اتنے سو سال کہ مجھے یاد بھی نہیں رہا"۔ اس نے ہنس کر کہا۔

قرۃ العین حیدر کے ہاں تیز روشنی ٹرانسپرنسی کی علامت ہے۔ ان کے کردار احساس کی منزلوں پر پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ ایک دوسرے کو آر پار دیکھ سکیں، کیوں کہ ہر انسان حقیقتاً بے حد Exposed ہے یا دوسرے معنی میں غیر محفوظ ہے۔ اس لیے کہ روشنی تیز ہے۔ تیز روشنی شعور کی اس کیفیت کی علامت ہے جہاں پہنچ کر ذہن اک دم شفاف ہو جاتے ہیں اور جن سے خیالات چھن کر دوسرے ذہنوں تک جا پہنچتے ہیں۔ اس شعوری ربط کے لیے کسی زبانی رابطے یا اظہار کی ضرورت نہیں رہتی۔

سرل میں اتنی تیز روشنی میں ہوں جتنی تم نے ابھی ظاہر کی؟ ہم یہاں بھی Exposed ہونا ایک المیے سے کم نہیں۔ (ص ۴۳۲)

اب گوتم پر چاروں طرف سے تیز روشنی پڑ رہی تھی جس طرح وہ خود گوتم کے سامنے تیز روشنی کی زد میں تھی لیکن دیکھو کیا ہوا کہ گوتم نے بڑھ کر دفعتاً سوئچ بند کر دیا۔ (ص ۴۳۲)

"آگ کا دریا" میں ہمیں وقت کے مختلف پیٹرن ملتے ہیں۔ ناول کے ابتدائی حصے میں ماضی پر زور دیا گیا ہے۔ وسطی اور خاص طور پر جدید ہندوستان کے پس منظر میں Polyphonic پیٹرن اپنایا گیا ہے۔ یہ پیٹرن اس وقت گہرا ہو جاتا ہے جب ناول کے کردار انگلستان میں وارد ہوتے ہیں۔ ان کرداروں کا اپنا اپنا ماضی ہے۔ وہ اپنا پس منظر ایک دوسرے کو سمجھانے سے قاصر ہیں اور ایک غیر واضح مستقبل کا سامنا کر رہے ہیں۔

اس ناول کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں Time Montage اور Space Montage دونوں ہی استعمال کیے گئے ہیں۔ Time Montage کے تحت کردار یا Subject اپنی جگہ یعنی Space پر قایم رہتا ہے اور اس کا شعور "وقت" میں آزادی سے گھومتا ہے جب کہ Space Montage میں وقت اپنی جگہ قایم رہتا ہے اور دیگر عناصر تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ناول کے اس حصے میں جو جدید ہندوستان کو پیش کیا گیا ہے اس میں بیک ورڈ اور فارورڈ مومنٹ کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ واقعات کی کوئی Chronological Sequence نہیں ہے۔ انھیں پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر برگساں کے اس نظریے سے متاثر ہیں کہ وقت مسلسل حال ہے۔

شعوری وقت Consciousness Time کو لے کر اس ناول میں ایک بہت خوب صورت Episode ہے جس میں غازی الدین حیدر، جنرل مارٹن کی ہندوستانی بیگم، نواب قدسیہ محل نصیر الدین حیدر وغیرہ۔ اس ناول کے کردار سے مکالمہ کرتے ہیں، یہ سب وقت کے سحر کے تحت ممکن ہے۔ قرۃ العین حیدر نے دراصل حال اور ماضی کو ایک ساتھ Fuse کر کے شعوری وقت کی تشکیل کی ہے۔

"آگ کا دریا" کے کرداروں کا اپنا اپنا انفرادی ماضی ہے جو انھیں بے حد عزیز ہے لیکن وہ سب وقت کی شعبدہ بازی سے حیران ہیں:

"دیکھو" اس نے کمال سے کہا۔ "میں نے آج محسوس کیا ہے کہ میرا ماضی صرف میرے لیے اہمیت رکھتا ہے"۔

"لیکن ماضی حال ہے۔ ماضی میں شامل ہے اور مستقبل میں بھی۔ وقت کی اس شعبدہ بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے"۔ طلعت نے کہا "میں وقت کے ہاتھوں عاجز آ چکی ہوں۔ تم میں سے کوئی میری مدد کیوں نہیں کرتا" (ص ۵۳۹)

لیکن آخر کار قرۃ العین حیدر برگساں کے نظریے سے متفق ہو جاتی ہیں:

"وقت برابر موجود ہے۔ وقت مسلسل حال ہے" (ص ۵۳۶)

قرۃ العین حیدر کے ہاں وقت کے عظیم اور معتبر پیٹرن میں بکھرے ہوئے ان کرداروں کے مخصوص امیجز ہیں جن کی بنا پر انھیں شناخت کیا جا سکتا ہے۔ گوتم ہندو دیو مالا کے مختلف بدلتے ہوئے روپ دیکھتا ہے۔ سناٹا کمال کا وہ امیج ہے جو اس کے شعور کو الجھائے رکھتا ہے۔ "بلیک اور سفید چہرے" چمپا احمد کا امیج ہے۔ مجمع چمپا احمد کی ایسی الجھن ہے جس میں وہ رہنا بھی چاہتی ہے اور اسے وحشت بھی ہوتی ہے۔

وقت ایک ایسا امیج ہے جو "آگ کا دریا" میں تقریباً تمام کرداروں میں مشترک ہے۔ ان سب کے پاس وقت ایک بہتا ہوا دریا ہے۔ وقت کے بہاؤ میں زندگی کھو دینے کا ڈر ان سب کے پاس موجود ہے:

ہم وقت اور اندھیرے سے خوف زدہ ہیں کیوں کہ وقت ایک روز ہمیں مار ڈالے گا اور اندھیرا ہماری آخری جائے پناہ ہوگا۔ طلعت نے کہا۔

ولیم جیمس کہتا ہے کہ دریا اور دریا کی رو وہ اشارے ہیں جن کے ذریعے شعور بیان کیا جا سکتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا" ایک ایسا ناول ہے جو انفرادی اور اجتماعی شعور میں ایک تسلسل یا روانی پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ اس ناول کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کے ذہن میں یہ Concept واضح تھا کہ اس ناول کی نوعیت کیا ہوگی۔

باقی صفحہ ۲۱ پر ملاحظہ کیجیے

براہِ راست

''کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے'' انگریزی کے اس مقولے کو پیشِ نظر رکھا جائے تو گذشتہ ۲۷ برسوں میں کچھ نہ کچھ ایسا ہوا ہے جو بہت کچھ نہ ہونے کے باوجود مفید اور لائقِ توجہ ہے۔

کیا اردو ادب کی وہ سینکڑوں شخصیات لائقِ توجہ نہیں جن کی بابت گذشتہ ۲۷ برسوں میں قرطاسِ اعزاز کی محفل رچائی گئی۔

سوال کا جواب اثبات میں ہے تو یقیناً آج کے میرِ محفل محترم ڈاکٹر بیگ احساس اپنی وجاہت، ادب آداب اور خدمات کے حوالے سے ہماری بہت ساری توجہ، اشتیاق اور محبت کے مستحق ہیں جن کی تمام عمر علم و ادب کی ترویج و ترقی میں صرف ہوئی ہے۔

ہمیشہ کی مانند محفل کو سجانا، سنوارنا اور آپ کی خدمت میں پیش کر کے قطعی غیر جانبدار ہو جانا ہمارا مزاج رہا ہے۔ سو آج بھی ہم ہمیشہ کی مانند اس خاص محفل کی نسبت آپ کی رائے کے بصد احترام منتظر بھی ہیں اور مشتاق بھی!!!

گلزار جاوید

☆ یہ تو تسلیم، اجداد اورنگ زیب کے زمانے میں افواج کے ساتھ حیدر آباد دکن تشریف لائے۔ اب یہ آپ بتلایئے کس ملک اور شہر سے آئے اور کس سبب آئے؟

☆☆ اورنگ زیب نے اکتوبر 1687ء میں گولکنڈہ پر حملہ کیا تھا۔ میرے اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا اس لیے دوسرے فوجیوں کے ساتھ وہ بھی آ گئے۔ ملک تو ہندوستان ہی ہے۔ دلّی یا اطراف دلّی کا کوئی شہر ہوگا جہاں سے وہ آئے تھے۔ میں وثوق سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میرے والد کا نام خواجہ حسن بیگ تھا۔ جب میں آٹھ برس کا تھا ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے والدین کے اکلوتے فرزند تھے۔ ان کا کوئی بھائی تھا اور نہ بہن! خود میری ولادت سات بہنوں کے بعد ہوئی۔ اکلوتا لڑکا ہوں۔ میری بڑی بہن مجھ سے کئی برس بڑی تھیں ان کی لڑکی مجھ سے صرف ایک برس چھوٹی ہے۔ بچپن میں اتنا ہوش نہیں تھا کہ آباء و اجداد کے بارے میں سوال کرتا۔ جب ہوش آیا تو کوئی بتانے والا نہ رہا۔ اتنا ہی پتہ چل سکا کہ اجداد اورنگ زیب کے ساتھ حیدر آباد آئے تھے۔ والد صاحب لمبے قد کے قوی الجثہ آدمی تھے لیکن فوج میں نہیں گئے۔ محکمہ کروڑ گیری میں ملازمت اختیار کی ترقی کرتے کرتے ناظم کے عہدے تک پہنچے۔ دادا اور پڑدادا فوج میں تھے۔ والد صاحب کے پاس ایک شجرہ بھی تھا جو شب برأت کے موقع پر نکالتے تھے۔ ان کی بے وقت موت کے بعد شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ کرایے کے مکانوں کی بار بار تبدیلی کے باعث امّی اس کی حفاظت نہ کر سکیں۔

☆ بہ طور طالب علم آپ کے استاد، ہم جماعت بالخصوص پردہ نشیناں آپ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

☆☆ ابتدائی تعلیم ضلع نظام آباد میں ہوئی۔ یتیمی کے احساس کی وجہ سے اسکول میں سہما سا رہتا تھا۔ ہائی اسکول میں دوست بنے۔ کرکٹ کھیلی۔ میٹرک کرنے تک تمام بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ بہنوں کے اصرار پر والدہ کے ساتھ حیدر آباد منتقل ہو گیا۔ بہنوں کی شدید خواہش تھی کہ آگے پڑھوں۔ لیکن میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ میں نے ملازمت کو ترجیح دی۔ ملازمت کرتے ہوئے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہر مرحلے پر مشفق اساتذہ ملے۔ آج جو بھی ہوں وہ اساتذہ کا فیض ہے۔ پردہ نشینوں کی توجہ کا مرکز بھی رہا۔ اب عمر کے اس پڑاؤ پر تفصیلات کا موقع نہیں ہے۔ اساتذہ میں پروفیسر گیان چند جین (جن کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی تکمیل کی)، پروفیسر مجاور حسین رضوی (ابن سعید)، پروفیسر مغنی تبسم نے متاثر کیا۔ سینئر کولیگس میں پروفیسر اشرف رفیع ہمیشہ میری ترقی کے لیے کوشاں رہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم میرے رول ماڈل رہے۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ میری استاد ہی نہیں بلکہ ماں جیسی تھیں۔ ان ہی کی وجہ سے پیشہ تدریس سے وابستہ ہو سکا۔ جن دنوں ایم اے کر رہا تھا ڈاکٹر زینت ساجدہ آخری کلاس لیتی تھیں۔ اکثر وقت ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ پڑھاتی رہتیں۔ ایک لڑکی جو ہندی سے ایم۔ اے کر رہی تھی میری گہری دوست تھی۔ اپنی کلاس ختم ہونے کے بعد وہ میری کلاس کے باہر کھڑی میرا انتظار کیا کرتی۔ زینت آپا کی نظر پڑتی تو کہتیں ''آپ جا سکتے ہیں میری طرف سے اجازت ہے۔ کیوں کہ اب آپ کا دل پڑھائی میں نہیں لگے گا''۔ اس کے بعد اپنا لکچر سمیٹ لیتیں اور کلاس ختم کر دیتیں۔ یونیورسٹی آف حیدر آباد میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے داخلہ لیا تو ڈاکٹر مجاور حسین رضوی کو خاص ہدایت فرمائی کہ وہ لڑکیوں پر کڑی نظر رکھیں اور خیال رکھیں کہ میرے قریب نہ آنے پائیں۔ ایسی تھیں زینت آپا! میں نے پیشہ تدریس کو خوب انجوائے کیا۔ کسی ترقی کے لیے ترسنا نہیں پڑا سب کچھ وقت پر مل گیا۔ بلکہ وقت سے پہلے صدر شعبہ ہو گیا۔ میں اپنے دور کا سب سے کم عمر صدر شعبہ رہا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں چار برس اور یونیورسٹی آف حیدر آباد میں چھ برس تک صدر شعبہ اردو رہا۔ یونیورسٹی کے ساتھی بھی جان چھڑکنے والے تھے۔ طلبہ کا پیار بھی ملا۔ میں نے جب پڑھانا شروع کیا تو جن طلبہ نے مجھ سے پہلی بار پڑھا ان میں سے اکثر آج تک ربط قایم رکھے

ہوئے ہیں۔ان میں کئی لکچرراور ریڈر بھی ہوگئے ہیں لیکن اسی طرح عزت کرتے ہیں۔ادبی حلقوں میں بھی بہت چاہا گیا۔حاسدین کی بھی کمی نہیں لیکن محبت کرنے والے زیادہ ہیں۔اللہ کا خاص کرم ہے۔

☆ آپ جیسے شائستہ انسان کو دیکھ کر ذہن میں شاعر کا تاثر اُبھرتا ہے۔ افسانے کی پُر پیچ گلیوں نے اس مشکل کام کے لیے آپ کو کیوں کر منتخب کرلیا؟

☆☆ اچھے شعر پر داد ضرور دیتا ہوں۔شاعری پڑھائی بھی لیکن شاعری کرنے پر کبھی دل مائل نہیں ہوا۔ ہمیشہ فکشن سے دلچسپی رہی۔شائستگی کا تعلق شاعری یا فکشن سے نہیں ہوتا فطرت سے ہوتا ہے۔ادیبوں اور شاعروں کی مخصوص ہئیت اختیار کرنے کو کبھی جی نہیں چاہا۔

☆ بہ قول ممتاز مفتی افسانہ بڑا بدمعاش ہوتا ہے۔آپ جیسے شریف آدمی سے یہ خود کو کس طور پر لکھواتا ہے؟

☆☆ ممتاز مفتی کے قول پر اعتبار کرلیا جائے تو بدمعاش عموماً شریف آدمی کو ہی زیادہ تنگ کرتے ہیں۔ یہ بدمعاش جب بھی آتا ہے چوبیس گھنٹے سر پر سوار رہتا ہے۔کسی معاملے میں جلد مطمئن نہیں ہوتا خوب محنت کرواتا ہے۔بار بار خود کو لکھواتا ہے۔تدریس کی وجہ سے اس بدمعاش کا بہت نقصان ہوا۔ورنہ یہ خوب گل کھلاتا۔

☆ ابتداء میں احباب کا تاثر کیا رہا اور کیا کسی دوست نے سنجیدگی سے آپ کی رہنمائی کو ضروری جانا؟

☆☆ احباب نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔حیدرآباد میں ان دنوں بے شمار ادبی انجمنیں تھیں۔ہم نے بھی ایک انجمن بنائی تھی۔ادبی اجلاسوں میں مدعو کیا گیا۔شروع میں مقبول رسائل میں لکھا کرتا تھا۔اس لیے شہرت ہوگئی۔یہ رسائل اتنے مقبول تھے کہ افسانہ چھپتے ہی سب کو خبر ہوجاتی۔ ہر ملنے والا مبارک باد دیتا۔ بے شمار خطوط وصول ہوتے۔ان ہی دنوں اتفاق سے میری ملاقات اقبال متین صاحب کے صاحب زادے سے ہوئی جو دوستی میں بدل گئی۔تب تک کئی افسانے شائع ہوچکے تھے۔اقبال متین صاحب کے پاس ہندوستان اور پاکستان کے بے شمار ادبی رسائل پڑھنے کو ملے۔ان ہی کے مشورے پر محمد بیگ احساس کی بجائے بیگ احساس کے نام سے لکھنے لگا۔ادبی رسائل کی جانب راغب ہوا۔کتاب، تحریک اور شاعر میں افسانے شائع ہونے لگے۔لیکن کبھی اصلاح نہیں لی۔

☆ آپ دماغ کے بائیں حصے یعنی اکتسابی کے بجائے دائیں حصے اسطوری سے کام کیوں لیتے ہیں؟

☆☆ پہلے تو آپ کا شکریہ! کہ آپ نے اس بات کو محسوس کیا۔ پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے دوران میں نے بے شمار افسانے پڑھے۔افسانے کے اسرار اور رموز سے واقفیت حاصل کی۔مختلف ادوار کے افسانوں کے مزاج اور عصری تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔تمثیل وعلامت کے استعمال اور افادیت کا علم ہوا۔میرا مزاج کبھی اکتسابی نہیں رہا۔کسی کی تقلید نہیں کی حالاں کہ ان دنوں لوگ چیستاں قسم کے افسانے لکھ کر ''شب خون'' میں شائع ہوکر راتوں رات نقادوں کی فہرست میں شامل ہو رہے تھے۔''شب خون'' ایسا رسالہ تھا جسے فن کاروں کو اسٹابلش کرنے پر قدرت حاصل تھی۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ ''شب خون'' میں شائع ہوئے بغیر اپنی شناخت بناؤں گا۔ میں نے خود اپنا اسلوب وضع کرنے کی کوشش کی۔اس میں زیادہ محنت لگی اور وقت بھی...! میں نے پامال راہوں سے ہمیشہ گریز کیا۔

☆ جمع کے صیغے کے بجائے واحد میں لکھنے کی وجہ کیا ہے۔احباب اسے جدید بیانیے سے بجا طور پر منتھی کرتے ہیں؟

☆☆ ابتدائی دور سے ہی افسانہ واحد کے صیغے میں لکھا جاتا رہا۔جدید افسانے میں تو کرداروں اور مقامات کے نام نہیں لیے جاتے تھے تا کہ افسانہ آفاقی کہلائے۔بستی کا معمر آدمی، بابا، داڑھی والا اور کبھی تو ا۔ب۔ج۔د۔وغیرہ۔واحد کے صیغے میں لکھے گئے افسانے میں مشاہدات اور تجربات کے تفصیلی بیان کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے۔اگر احباب اسے جدید بیانیے سے منتھی کرتے ہیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔تحریکیں اور رجحانات ختم ہوجاتے ہیں لیکن ان کی مثبت قدریں روایت کا حصہ بن جاتی ہیں۔

☆ جدیدیت کی تحریک سے اختلاف کسی سینئر کی پیروی میں ہوا یا آپ کی افتادِ طبع نے اسے قبول نہ کیا؟

☆☆ جدیدیت سے اختلاف نہیں رہا۔جدیدیت کے مفید اثرات بھی پڑے۔کہانی میں تہہ داری آئی۔تجربے کیے گئے، امکانات تلاش کیے گئے۔ترقی پسند افسانہ جس جگہ پہنچ گیا تھا وہاں سے تبدیلی ضروری تھی۔جدیدیت کے نام پر کہانی کے سٹرکچر کے ساتھ جو کھلواڑ کیا گیا اس سے اختلاف رہا۔کہانی اور شاعری کی حدیں مٹائی جانے لگیں، ریاضی کے فارمولے، اشکال، زائچے کیا کیا نہیں ہوا۔اب نقاد حضرات اس کی تشریح اور تفہیم بھی کررہے ہیں اس میں وجودیت کا فلسفہ تلاش کیا جارہا ہے۔وہ تحریریں کچھ بھی ہوسکتی تھیں لیکن افسانہ نہیں تھیں۔کسی سینئر کی پیروی کا سوال ہی نہیں تھا۔اس وقت سب جدیدیت کے ساتھ تھے۔ آہستہ آہستہ فضا تبدیل ہونے لگی۔پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایک مضمون ''نیا افسانہ: روایت سے انحراف اور مقلدین کے لیے لمحہ فکریہ'' لکھا۔وارث علوی نے جدیدیت اور علامتی و تمثیلی افسانے پر سوال قایم کیا۔''جواز'' اور ''اوراق'' میں بحثیں ہوئیں۔پروفیسر مغنی تبسم نے بھی ''شعر و حکمت'' کے ذریعہ جدیدیت سے بے زارگی کا اظہار کیا اور مابعد جدید تھیوری پر مضامین شائع کرنے لگے۔ دراصل مغنی تبسم صاحب کا بھانجا ٹیری ایگلٹن کی نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی کررہا تھا۔مغنی صاحب نے کئی مضامین کا ترجمہ کروایا۔نارنگ صاحب نے اپنی پوری

توجہ مابعد جدیدیت پر لگادی۔لیکن یہ سب بعد میں ہوا۔

☆ آپ کے خیال میں جدیدیت میں ایسی کیا خرابی تھی کہ ستر کے دہے کے ایک دو نہیں درجنوں افسانہ نگاروں کو نگل گئی؟

☆☆ کہانی فیشن اور فارمولا بن گئی تھی۔علامتیت اور تجریدیت کو حرف آخر سمجھا جانے لگا۔کہانی کا اخراج، بے معنی، بے مصرف تجریدیت، پیچیدہ اور مرعوب کرنے والی زبان کا استعمال، انشائیے اور افسانے کا فرق مٹ جانا، ذہین سے ذہین قاری یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ان تحریروں سے کیسے معنی اخذ کرے۔ افسانہ نگاروں کی شناخت اور شہرت کا دارومدار نقادوں کے رحم و کرم پر ہو گیا۔تخلیق تنقید کے پیچھے چلنے لگی۔ایک طرف ایسی تحریروں کو شائع کر کے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جارہی تھی افسانے کو نقصان پہنچایا جارہا تھا دوسری طرف افسانے کی حمایت کے نام پر اسے کمتر درجے کی صنف قرار دیا جارہا تھا۔نقادوں نے فن کا روں کو پہلے تو ہتھیلی میں جنت دکھانا شروع کیا پھر اچانک ہاتھ کھینچ لیا۔جدیدیت نے بڑے نقاد اور اچھے شاعر تو پیدا کیے لیکن اہم افسانہ نگار پیدا نہ کر سکی۔

☆ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کوشش کے باوجود ستر کی دہائی سے باہر نہیں آسکے؟

☆☆ کوئی ایسا کہتا ہے تو غلط کہتا ہے۔میرے دوسرے مجموعے ''حنظل'' میں کچھ تمثیلی اور علامتی کہانیاں ضرور ہیں لیکن میں نے کہانی کے تقاضوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔مجھ پر لکھنے والوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ میں نے کہانی کے اکہرے پن اور ابہام سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے اپنی کہانیوں میں ایسے عناصر کو جگہ دی جو کہانی میں مفہوم کی کئی سطحیں پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوئے۔موضوعات کے تنوع کا بھی سبھی نے اقرار کیا۔

☆ مرزا حامد بیگ نے آپ کو ستر کی دہائی کے افسانہ نگاروں سے مختلف گردانتے میں اس قدر زور کیوں صرف کیا؟

☆☆ کیا آپ نے ایسا محسوس کیا؟ مرزا حامد بیگ کا مضمون اس طرح شروع ہوتا ہے ''دخمہ کے سارے افسانے، افسانہ نگار کی اس انوکھی تدبیر کاری کی عطا ہیں جسے بیسویں صدی کے ساتویں دہے سے مخصوص جدیدیت کی تحریک کے رد میں اٹھنے والی آوازوں کا ردعمل بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔اور تخلیقی سطح پر جینے کا جتن بھی'' اس کا کیا مطلب ہوا؟ میں مرزا حامد بیگ کو ایک مخلص و ایماندار فن کار اور افسانے کا پارکھ سمجھتا ہوں۔وہ جو بھی لکھتے ہیں پورے دلائل کے ساتھ لکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے انھوں نے کوئی زور صرف نہیں کیا۔اگر آپ سمجھتے ہیں ایسا کیا ہے تو کوئی بات تو ہوگی جس نے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔اختلاف کا حق سب کو ہے۔

☆ آپ نے علامت، استعارہ تجرید کے بجائے جو تکنیک برتیں وہ کس مکتبہ فکر سے مستعار ہیں؟

☆☆ کسی مکتبہ فکر سے مستعار نہیں۔یہی میری انفرادیت ہے۔

☆ دو مختلف واقعات کو جوڑ کے کہانی بننے کی خاص وجہ؟

☆☆ افسانے کی ضرورت کے تحت واقعات جوڑے جاتے ہیں۔کوئی بھی واقعہ غیر متعلق اور پیوند نہیں لگنا چاہیے۔افسانہ غیر ضروری بوجھ اٹھانے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

☆ آپ کے ہاں خاص طرح کی پردہ داری کہانی کو ڈھکا چھپا رکھتی ہے اس سے قاری کو اکثر گومگوں کی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے؟

☆☆ میں اس پردہ داری کی شعوری کوشش کرتا ہوں۔انتظار حسین کے مطابق ''افسانہ اور عورت دونوں میں کشش اسی صورت میں رہتی ہے کہ کچھ دکھائے کچھ چھپائے....'' کہانیوں کے انجام میں مختلف نتائج کی گنجائش اور قاری کی شمولیت کو بھی ضروری سمجھتا ہوں۔''دھار''، ''نمی دانم کہ''، ''شکستہ پر'' اور ''رنگ کا سایہ'' کا اختتام دیکھ لیجئے۔

☆ ایک بھارتی شہری کو ہندی زبان وادب پر دسترس تو سمجھ میں آتی ہے مگر آپ نے ویدوں کا حوالہ بھی برتا ہے؟

☆☆ ہندی پر میری کوئی خاص دسترس ہے اور نہ ویدوں کا علم ہے۔ بھارتی شہری ہی کیوں پاکستان کے اکثر فن کار ہندی کا دانستہ طور پر استعمال کرتے ہیں۔یہ تو کہانی کی ڈیمانڈ پر منحصر ہے۔

☆ آپ کی کہانیوں میں دیو مالائی رنگ اکتساب ہے، اجتہاد ہے یا تقاضائے وقت؟

☆☆ نہیں! اجتہاد نہیں ہے مجھ سے قبل بے شمار افسانہ نگاروں نے اس رنگ میں بہترین افسانے لکھے۔اکتساب بھی نہیں ہے کیوں کہ میرا انداز مختلف ہے تقاضائے وقت اس لیے نہیں ہے کہ فن کار وقت کے بہاؤ کے مخالف سمت میں سفر کرتا ہے۔البتہ جیسی کہانی ہوگی ویسے عناصر سے کام لیا جائے گا۔

☆ دخمہ نے دوسرے افسانوں کو سنبھال رکھا ہے یعنی دوسرے افسانے اعلیٰ پائے کے نہیں ہیں؟

☆☆ ''دخمہ'' سے قبل ہی میری شناخت قائم ہو چکی تھی۔بیشتر نقاد مجھ پر دخمہ سے قبل لکھ چکے تھے۔مختلف افسانوں کے انتخاب میں بھی میرے افسانے شامل رہے۔لیکن ''دخمہ'' میرے لیے وہی اہمیت رکھتا ہے۔جو غلام عباس کے لیے ''آنندی'' اشفاق احمد کے لیے ''گڈریا'' اور حسن عسکری کے لیے ''چائے کی پیالی'' کی اہمیت ہے۔کبھی کسی تخلیق کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔تخلیق کار اپنی تخلیقات پر یکساں محنت کرتا ہے۔آپ خود افسانہ نگار ہیں اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔اب ''دخمہ'' کو شہرت مل گئی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسری تخلیقات اعلیٰ معیار کی نہیں ہیں۔

☆ تعلق آپ کا حیدرآباد دکن سے ہے افسانوں میں آپ جا بجا

علاقائی حوالے اور نسبتیں شامل کرتے ہیں؟

☆☆ علاقائی حوالے اور نسبتیں پریم چند سے لے کر آج تک کئی فن کاروں کے یہاں ملتے ہیں۔ میں نظام دکن کے دور کی ریاست حیدرآباد کے اضلاع سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ویسے آج کے دور میں مرکزیت کے مقابل مقامیت کو زیادہ اہمیت دی جارہی ہے۔

☆ پروفیسر وارث علوی نے آپ اور منٹو کے ایجاز کو ہم آہنگ کر کے زیادہ رسک نہیں لے لیا؟

☆☆ یہ ان کی محبت ہے۔ وارث علوی صاحب ہر فن کار کو منٹو اور بیدی کے پیمانے سے جانچتے ہیں۔ منٹو کا انھوں نے بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ وارث علوی صاحب نے لکھا ''ان کے ایجاز اور منٹو کے ایجاز میں بڑی مماثلت ہے۔ لیکن ایجاز کا یہ سبق انھوں نے منٹو سے سیکھا ہوا ایسا نہیں لگتا کیوں کہ سبق سیکھنے کے لیے کم از کم افسانہ کے کینوس میں مماثلت ضروری ہے۔ بیگ احساس کا افسانہ خود اپنا ہے اس پر ان کی انفرادیت کی چھاپ بھی ہے'' ویسے وارث علوی صاحب نے جدیدیت کے بعد والے فن کاروں کے ساتھ ویسا برتاؤ نہیں کیا جیسا جدید افسانہ نگاروں، کرشن چندر یا قاضی عبدالستار کے ساتھ کیا۔ نسبتاً مروت اور شفقت سے کام لیا۔

☆ علوی صاحب کی یہ رائے مبالغہ پر مبنی نہیں کہ جتنے مختصر جملے بیگ احساس نے لکھے اردو کے کسی افسانہ نگار نے نہیں لکھے؟

☆☆ آپ جانتے ہیں وارث علوی صاحب مبالغہ سے کبھی کام نہیں لیتے۔ اکثر تعریف کرنے میں بھی بخالت کرتے ہیں۔ انھوں نے جو بھی لکھا وہ ان کی بے لاگ رائے ہے۔

☆ پروفیسر وارث علوی نے افسانہ ''دھار'' کے آخری حصے کو تضحیک کا نشانہ کیوں بنایا؟

☆☆ آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی۔ انھوں نے ''دھار'' کے آخری حصے کو تضحیک کا نشانہ نہیں بنایا۔ بلکہ تعریف کی ہے۔ میں ان کے الفاظ درج کر رہا ہوں۔ ''انجام کی ایک دلچسپ مثال بیگ احساس کا افسانہ ''دھار'' ہے.... باپ کو اب شیونگ کٹ کی ضرورت نہیں کیا وہ دوسرا خرید لے گا یا داڑھی بڑھا لے گا اور داڑھی بڑھ گئی تو شراب نوشی ترک کر دے گا؟ نماز روزے کا پابند ہو جائے گا؟ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے انجام یہاں امکانات سے بھرا ہوا ہے''۔ اس میں تضحیک کا پہلو کہاں ہے؟

☆ ''خس آتش سوار'' کے گرودیو سے آپ کی ملاقات کب، کہاں اور کیسے ہوئی اور گرودیو نے آپ کو کھینچ تان کر انتظار حسین کے ''زرد کتا'' کے قریب کیوں کر دیا؟

☆☆ گرودیو دراصل یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ میں نے صرف ماحول کو تبدیل کر دیا۔ سارے کردار جیتے جاگتے ہیں اس میں ''زرد کتا'' بالکل نہیں ہے۔ انتظار حسین کا ''زرد کتا'' طمع دنیا کی علامت ہے۔ جو تین دن فاقے سے مجبور ہو کر ایک لقمہ حرام کھاتے ہی زندگی بھر کے لیے ساتھ ہو گیا۔ ساری زندگی ''وہ'' کشمکش میں مبتلا رہا اور اس سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔ ''خس آتش سوار'' میں تو ''وہ'' بھگوان سے بغاوت کر کے آشرم چھوڑ دیتا ہے۔ وہ سیدھے سادھے انسان کی زندگی جینا چاہتا ہے۔

☆ افسانہ ''سنگ گراں'' میں نسوانی بیالوجی کے حوالے سے آپ کو فحاشی کی زد میں کیوں کھڑا کیا گیا؟

☆☆ نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا کسی نے فحاشی کی بات نہیں کی۔ یہ افسانہ ماہ نامہ ''شاعر'' میں شائع ہوا تھا۔ کئی قارئین بشمول افسانہ نگار علی امام نقوی نے خط لکھ کر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ایک قاری نے لکھا تھا افسانہ پڑھ کر میں اور میری بیوی رو پڑے۔ اپنی کہانیوں کے دفاع میں کچھ کہنا بڑا عجیب لگتا ہے۔

☆ باپ بستر مرگ پر اور بیٹا اسی کمرے کے باتھ روم میں بیوی کے ساتھ استراحت کرے، ہمارے ماحول سے مطابقت نہیں رکھتا۔ انگریزی سے ماخوذ ہو تو دوسری بات ہے؟

☆☆ نہیں! یہ انگریزی سے ماخوذ نہیں ہے۔ ایک غریب آدمی کا رپوریٹ ہاسپٹل کے پرتعیش کمرے میں پہنچ کر اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتا۔ مہدی جعفر نے لکھا ''بیگ احساس کے افسانے ''سانسوں کے درمیاں'' میں ایک نئی تکنیک استعمال ہوئی ہے جو شعور کی رو کے مشابہ ہے۔ زمانہ حال کی چبھن فرد کے دماغ پر تناؤ، دباؤ اور ذمہ داری کا بوجھ سب ایک طرح کی ذہنی رو میں بدل جاتے ہیں جس میں مدوجزر Up heaval موجود ہے۔ افسانوی پلاٹ کے ساتھ یہ تکنیک ٹریٹمنٹ میں بدل جاتی ہے''۔

☆ حیدرآباد دکن میں نوابین کے دور کی کہانیوں کو جس طرح واجدہ تبسم نے آشکار کیا آپ اس طرح نہیں کر سکے بلکہ آپ کے ہاں تو اس حوالے سے درگزر کی پالیسی نظر آتی ہے؟

☆☆ واجدہ تبسم ایک اچھی افسانہ نگار تھیں۔ سلیمان اریب کے ''صبا'' نے انھیں پہچان دی تھی۔ وہ لٹ پٹ کر حیدرآباد آئی تھیں۔ افسانہ ''اترن'' کی کامیابی کے بعد ایک کمرشیل رسالے کی ایما پر ایسے چٹخارے دار افسانے لکھنے لگیں جن کا حیدرآبادی تہذیب و ماحول سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ یہ افسانے ان کی ذہنی اختراع تھے۔ پیسہ تو انھیں مل گیا لیکن ان کی امیج بہت متاثر ہوئی۔ اقبال متین، جیلانی بانو، عوض سعید اور آمنہ ابوالحسن کا بھی اسی دور سے تعلق تھا کسی نے اس طرح کے افسانے نہیں لکھے۔

☆ جو لوگ آپ کے ناسٹلجیا کا ذکر کرتے ہیں ان کا اشارہ کسی خاص سمت میں ہوتا ہے؟

☆☆ میرا ناسٹلجیا حیدرآباد کی پرانی تہذیب، پولیس ایکشن کے سانحے، جدوجہد کے دونوں کی یادوں تک محدود ہے۔ آپ کے ذہن میں کوئی خاص سمت ہے تو میں سمجھ نہیں پایا۔ میری پوری زندگی آئینے کی طرح ہے۔

☆ آپ کی کچھ کہانیوں میں فلمی رنگ نظر آنے کے پیچھے کیا راز ہے؟

☆☆ فلموں سے میری گہری دلچسپی کی ایک وجہ ہے۔ میں نے فلمی رسائل میں کام بھی کیا۔ فلمی اداکاروں سے انٹرویو لیے۔ فلموں کی شوٹنگ دیکھی۔ پروڈیوسر آدرش کی ایک فلم کی اسکرپٹ اور مکالمے بھی لکھے۔ ممکن ہے فلموں میں بحیثیت کہانی نویس یا مکالمہ نگار چلا جاتا لیکن جدوجہد کرنے کی ہمت نہ تھی۔ یونیورسٹی میں کیریر بنانا زیادہ باعزت اور آسان لگا۔

☆ تخلیق کاروں پر ایسا وقت اکثر آتا ہے جب تلاش و بسیار کے باوجود تخلیق کا سرا ہاتھ نہیں آتا ایسے وقت میں آپ کہانی کو کس طرح تلاش کرتے ہیں؟

☆☆ میں انتظار کرتا ہوں۔ کہانیاں تلاش نہیں کرتا۔ اسی وقت لکھتا ہوں جب کہانی دستک دیتی ہے۔ اس لیے بہت کم لکھا۔

☆ آپ کے مزاج میں وہ کون سا عنصر ہے جس کے باعث آپ کے افسانوں کا اختتام اکثر حزنیہ ہوتا ہے؟

☆☆ بچپن میں یتیم ہو جانا۔ خواہشات کا سہم جانا۔ لوگوں کے ساتھ نیکی اور اچھا سلوک کرنے کے بعد ان کا پلٹ کر وار کرنا۔ بہت سے ساتھیوں کی اچانک موت۔ شاید یہی عناصر ہیں۔

☆ اگر آپ اپنے متن کو طبع زاد نہیں مانیں گے تو کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ مفت میں مغز ماری کرتا پھرے؟

☆☆ جو متن طبع زاد ہوتا ہے اسے طبع زاد مانتا ہوں۔

☆ نورالحسنین صاحب کس پولیس ایکشن کی بات کر رہے جسے آپ نے بھی بھوگا ہے؟

☆☆ وہی پولیس ایکشن جس کا ذکر ابراہیم جلیس اور ظفرالحسن نے کیا اور مجتبیٰ حسین کرتے ہیں۔ بڑی لمبی کہانی ہے سقوط حیدرآباد کی۔ مختصر یہ کہ ریاست حیدرآباد کو ہندوستان میں ضم کرنے کے لیے آپریشن پولو کے نام سے فوج نے چڑھائی کر دی۔ نظام دکن کی فوج نے کوئی مقابلہ نہیں کیا۔ اس کارروائی کے نتیجے میں دو لاکھ سے زیادہ مسلمان مارے گئے۔ کئی بے گھر اور کنگال ہو گئے۔ یہ سب کچھ پُرامن طریقے سے بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد تو دنیا ہی بدل گئی۔ پولیس ایکشن کو ہمارے بزرگوں نے بھوگا جس کے اثرات ہماری زندگیوں پر بھی پڑے۔

☆ انڈیا سے ایک ہندوستانی ادیب پاکستان تشریف لائے تو انہیں انڈو پاک میں کوئی فرق نظر نہیں آیا مگر جب یہ ہی صاحب حیدرآباد دکن گئے تو وہاں کالے برقعے، کالے ڈھاٹے، کالے موزے اور کالے دستانے دیکھ کر اسے منی پاکستان سے موسوم کردیا؟

☆☆ حیدرآباد پر مسلمانوں نے برسوں حکومت کی۔ اس کا اثر یہاں کی تہذیب پر آج بھی موجود ہے۔ یہاں شرفا شروع سے پردہ کرتے ہیں۔ ہاں اب بھی عورتیں اور لڑکیاں برقعہ اوڑھتی ہیں۔ بازار، سنیما ہال، پارک ہر جگہ برقعے نظر آتے ہیں۔ لڑکیاں برقعہ پہن کر ہی یونیورسٹی بھی آتی ہیں۔ بعض مسلمان لڑکیاں پردہ نہیں بھی کرتی ہیں۔ صرف برقعوں کے استعمال کی وجہ سے منی پاکستان تو نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ حیدرآباد میں ہندو مسلمان، شعیہ، سنّی مل جل کر رہتے ہیں۔ یہاں رمضان المبارک روایتی دھوم دھام سے گزارا جاتا ہے۔ ہندو بھائی حلیم بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ رات بھر بازار کھلا رہتا ہے عام دنوں میں بھی مغلائی اور دکنی کھانوں کے ہوٹلوں میں ہندو، مسلمان برابر کی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ صبح کے وقت اڈلی، دوسہ کی ہوٹلوں میں بے شمار مسلمان جاتے ہیں اور ناشتہ کرتے ہیں۔ رمضان اور دیوالی کے موقع پر جوڈسکاؤنٹ دیا جاتا ہے اس سے ہندو مسلمان دونوں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ خریدنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ دکان ہندو کی ہے یا مسلمان کی۔ بہتر چیز تلاش کرتے ہیں۔ یہاں عورتیں خود کو محفوظ سمجھتی ہیں۔ اب ہندو لڑکیاں بھی منہ پر ڈھاٹا باندھنے لگی ہیں۔

☆ اب جب کہ سعودی عرب میں امریکہ کی ہدایت پر انتہا پسندی کے خلاف سنٹر کھل گیا ہے جو نئے اسلامی نصاب کے ساتھ اساتذہ کی تربیت بھی نئے انداز میں کریگا۔ ان حالات میں یہ مذہبی انتہا پسندی کیا رُخ اختیار کرے گی؟

☆☆ ساری دنیا مذہبی انتہا پسندی کا شکار ہو رہی ہے۔ مسلکی افتراق پر مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ فرانس میں حجاب کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ ٹرمپ کا اقتدار میں آنا امریکیوں کے ذہنی رجحان کی غمازی کرتا ہے۔ ایک ایک کر کے مسلمان حکومتیں ختم کی جا رہی ہیں۔ جارحانہ وطن پرستی اور مذہبی انتہا پسندی دنیا کو تباہ کر دیں گے۔

☆ بیگ احساس کی نظر میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ ان کی نظر کے بغیر حیدرآباد دیکھا ہی نہیں جا سکتا وہ خاص بات ہمیں بھی بتلایئے؟

☆☆ ہو سکتا ہے دوستوں نے حیدرآباد کے خاص مقامات، کچھ اچھی ہوٹلیں میرے توسط سے دیکھی ہوں۔ اچھے لوگوں سے ملاقات کی ہو۔ جو مقامی آدمی ہوتا ہے وہی شہر کے بارے میں زیادہ جانتا ہے۔

☆ حیدرآباد شہر کا برانڈ ایمبیسڈر کہنے والے ان خدمات کا ذکر نہیں کرتے جس کے بدلے میں یہ اعزاز بخشا گیا؟

☆☆ برانڈ ایمبیسڈر کا اعزاز بخشا ایک طرح سے خدمات کا اعتراف ہی تو ہے۔

☆ آپ کے بیان کے مطابق قرۃ العین حیدر کے ناول سے پہلے بھی

اردوادب میں بہت سے معیاری ناول تحریر کیے گئے اگر ہم آپ کے بیان کی روشنی میں ''آگ کا دریا'' کا مقام اور معیار دریافت کریں تو آپ کیا کہیں گے؟

☆☆ ہاں! قرۃ العین حیدر سے قبل بھی ناول کی روایت مضبوط رہی۔ ابن الوقت، امراؤجان ادا، فردوس بریں، گئو دان، گریز، لندن کی ایک رات، ٹیڑھی لکیر، ایک چادر میلی سی وغیرہ آگ کا دریا سے قبل لکھے جا چکے تھے۔ آگ کا دریا پہلا ٹائم ناول ہے۔ پہلی بار قرۃ العین حیدر نے ڈھائی ہزار سال کی تاریخ کا احاطہ کیا ہے۔ اپنے موضوع، ٹیکنک اور ٹریٹمنٹ کی بنیاد پر اس ناول نے نئی بلندیوں کو چھوا ہے۔ گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے بھی اس کی اہمیت ہے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال اردو تو کیا دوسری زبانوں کے ادب میں بھی نہیں ملتی۔ ناول کا اختتام بڑا معنی خیز ہے۔ انسان تنہائی، شکست اور تھکاوٹ کے باوجود پُر امید ہے۔ انسان جو خدا میں ہے اور خدا ہے۔ قرۃ العین کو نوبل پرائز دیا جاتا تو اس پرائز کی توقیر میں اضافہ ہوتا۔ بلاشبہ وہ اردو کی سب سے بڑی ناول نگار ہیں۔

☆ بہ طور نقاد آپ قرۃ العین حیدر کے اس بیان کو کس نظر سے دیکھتے ہیں کہ انہوں نے ورجینا وولف کا ناول آگ کا دریا کے بعد پڑھا؟

☆☆ مجھے ان کی بات تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ میں نے اپنی ایک اسکالر (جو انگریزی کی بھی ایم۔ اے تھی) سے قرۃ العین حیدر اور ورجینا وولف کے تقابلی مطالعے پر کام کروایا۔ دونوں میں بے پناہ مماثلت ہے۔ حتیٰ کہ بعض اقتباسات تک حیرت انگیز طور پر ملتے جلتے ہیں۔

☆ اردو زبان آپ کے خیال میں اپنے انجام کے کس مرحلے میں ہے بالخصوص ہندوستان کے سیکولر معاشرے کے ضعف کے بعد اردو ادب و شاعری کہاں نظر آتے ہیں؟

☆☆ اردو زبان تو باقی رہے گی۔ اس کے انجام کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے بعض سیاسی لیڈروں کے بے تکے بیانات، تشدد کے بعض واقعات کی وجہ سے ہندوستان میں سیکولر معاشرے کا ضعف محسوس کیا جارہا ہے عام آدمی آج بھی اتنا ہی سیکولر ہے جیسا پہلے تھا۔ ہندوستان میں ''ریختہ'' اور ''جشن ادب'' کی سرگرمیوں سے آپ واقف ہی ہوں گے ان دونوں تنظیموں کے سربراہ غیر مسلم ہیں۔ ''ریختہ'' کی ڈیجیٹل آن لائن لائبریری ہے جس میں ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ اردو آج بھی ہندی اور انگریزی اسکرپٹ میں خوب فروخت ہو رہی ہے۔ اردو ادب اور شاعری روبہ زوال ہیں۔ حیدرآباد میں بھی اردو کے سارے دانشور ختم ہو گئے ہیں۔ جیلانی بانو، پروفیسر انور معظم اور پروفیسر یوسف سرمست نے محفلوں میں آنا چھوڑ دیا۔ کافی ضعیف ہو چکے ہیں۔ لے دے کے ہمارے کرم فرما مجتبیٰ حسین رہ گئے ہیں جو ذہنی طور پر پوری طرح چاق و چوبند ہیں۔ پاکستان میں بھی یہی صورت حال ہے۔ شاعروں اور دانشوروں کی کہکشاں بکھر چکی ہے۔ غزل کے فن کاروں کی اب وہ اہمیت باقی نہیں رہی۔ ٹی۔ وی پروگراموں کے معیار سے زوال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تقریباً یہی صورت حال تمام زبانوں کی ہے۔ امید افزا بات یہ ہے کہ اردو رسم الخط کو کمپیوٹر نے قبول کر لیا، فیس بک اور واٹس آپ پر اردو لکھی جارہی ہے۔ سمارٹ فونز میں اردو کا Option ہے۔ اس لیے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

☆ ہندوستان میں بڑھتی ہوئی تشدد کی لہر نے اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو جس طرح عدم تحفظ کے احساس سے دوچار کیا ہے اس کے ردِّ عمل میں مسلم قوم کا مستقبل کیسا نظر آتا ہے؟

☆☆ پہلے کے مقابلے میں عدم تحفظ کا احساس زیادہ ہو گیا ہے۔ اب سب کچھ کھلے طور پر ہو رہا ہے پہلے وہی سب کچھ چوری چھپے کیا جاتا تھا۔ بی جے پی اگر اقتدار پر آئی ہے تو کانگریس کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے آئی ہے۔ ملک پر کانگریس نے طویل عرصے تک حکومت کی اور ساری خرابیاں اسی کی وجہ سے در آئی ہیں۔ ملک میں تشدد کی لہر چل رہی ہے لیکن اس کا شکار صرف مسلمان ہی نہیں سیکولر ہندو بھی ہو رہا ہے۔ کلبرگی، پنسارے، دابھولکر اور گوری لنکیش سیکولر ہندو تھے جنھیں قتل کیا گیا۔ میڈیا کے بک جانے کے باوجود ایمان دار صحافی اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ مسلمان ملک کا حصہ ہیں۔ انھیں نظر انداز کر کے ترقی نہیں کی جا سکتی۔ صرف کانگریس کو الزام دے کر حکومت نہیں کی جا سکتی ہے کیوں کہ پارلیمنٹ میں آپ کو مکمل اکثریت حاصل ہے۔ ہمارا جمہوریت پر ایقان ہے اس لیے موجودہ دور کو ایک عارضی وقفہ سمجھتے ہیں۔ مہنگائی، بے روزگاری، جہالت اور مفلسی، معاشی بحران کا شکار ہندو مسلمان دونوں ہیں اس لیے مستقبل سے ہم مایوس نہیں ہیں۔

☆ کیا بھارت کے موجودہ حالات کو کسی طور پر روہنگیا، کشمیر، فلسطین، افغانستان، ایران، عراق، شام، ترکی اور پاکستان سے جوڑا جا سکتا ہے۔ اگر جواب ہاں میں ہے تو اس کے نتائج؟

☆☆ ہندوستان کے موجودہ حالات کو روہنگیا، فلسطین، افغانستان، ایران، عراق، شام، ترکی اور پاکستان سے بالکل نہیں جوڑا جا سکتا۔ حالات اتنے ابتر نہیں ہیں۔ ہر غیر ذمہ دار بیان کے بعد صفائی بھی پیش کی جاتی ہے۔ ناخوش گوار واقعات دہرائے نہیں جا رہے ہیں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ ہر ریاست کا ماحول مختلف ہے۔ جنوب میں بی جے پی کا کوئی اثر نہیں ہے۔ بنگال اور پنجاب پر نہیں ہے۔ یہ ریاستیں نسبتاً پُرامن ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں الگ الگ کلچر ہے۔ مثلاً حیدرآباد میں اشرافیہ گائے کا گوشت کھانا پہلے ہی سے پسند نہیں کرتی۔ صرف غریب اور نچلے متوسط درجے کے افراد گائے کا گوشت کھانے کے عادی تھے۔ تمام ہوٹلوں میں بکرے کا گوشت استعمال ہوتا ہے یا پھر چکن...!! یوپی، بہار کے لوگ بڑے جانوروں کے گوشت کے عادی ہیں۔ جنوب والے نہیں ہیں۔ حالات کتنے ہی بدتر ہوں متذکرہ ملکوں کی طرح ابتر نہیں ہو سکتے۔

بیگ احساس تم ہی ہو؟

مجتبیٰ حسین
(حیدرآباد،دکن)

وقت بھی کیا ظالم چیز ہے، پروفیسر بیگ احساس جیسے سدا بہار جوان رعنا کو بھی بالآخر ریٹائر کردیتا ہے حالانکہ بیگ احساس اور ریٹائرمنٹ دو متضاد باتیں ہیں۔ جو لوگ بیگ احساس کو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے پروفیسر کی حیثیت سے جانتے ہیں وہ تو اُن کے پروفیسر ہونے کے سانحہ کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں لیکن جو لوگ اُنھیں شخصی طور پر نہیں جانتے وہ یونیورسٹی کے ماحول میں بیگ احساس کو دیکھ کر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ موصوف یقیناً ایم فل یا پی ایچ ڈی کے طالب علم ہیں۔ میری زندگی میں دو ہی دوست ایسے ہیں جنھیں قدرت نے تھرموس میں رکھ کر پیدا کیا ہے، ایک تو میرے زمانہ طالب علمی کے دوست وہاب عندلیب ہیں جن پر عہدِ طفلی کچھ ایسے پُر شباب اور پُر استقلال انداز میں نازل ہوا کہ حلیے، ڈیل ڈول اور قد و قامت کے اعتبار سے آج بھی طفلِ مکتب کی طرح ہی نظر آتے ہیں۔ حالانکہ خیر سے اب اسّی (80) برس کے ہو چکے ہیں۔ دوسرے بیگ احساس ہیں جن پر عہدِ طفلی کے بعد نوجوانی تو ضرور نازل ہوگئی لیکن اوپر سے بڑھاپے کے نازل ہونے میں تاخیر ہوتی چلی جارہی ہے۔ غالباً یہ بڑھاپا مرکزی حکومت کی زیرِ نگرانی نازل ہو رہا ہے تبھی تو تاخیر ہوتی چلی جارہی ہے۔ میں نے بیگ احساس کو چالیس، پینتالیس برس پہلے حیدرآباد میں دیکھا تھا، جب وہ غالباً رسالہ ''فلمی تصویر'' میں ایک نوجوان صحافی کی حیثیت سے کام کیا کرتے تھے۔ یقین جانیئے اس طویل مدت میں مجھے تو اُن کی ذات میں بظاہر کوئی نمایاں تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ ایک پاکستانی شاعر کا شعر ہے:

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کر اُس کو لیکن
عمر بھر کون حسیں کون جواں رہتا ہے

یہ شعر مجھے یہاں اس لئے یاد آیا کہ بیگ احساس کی سالم شخصیت اس شعر کے خلاف ایک ''تردیدی بیان'' کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ خوش شکل، خوش جمال، خوش باش، خوش پوشاک، خوش اطوار، خوش اخلاق، خوش سلیقہ اور خوش آثار بیگ احساس کو دیکھنا بھی ایک خوشگوار تجربہ سے کم نہیں ہے۔ اُنھیں دیکھ کر دِل کے فسردہ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو سراسر خوش ذوقی، خوش مذاقی، خوش دلی، خوش سلیقگی اور خوش مزاجی کا پیکر ہیں۔ پچھلے دنوں ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا تھا کہ بیگ احساس کس چکی کا پسا ہوا آٹا کھاتے ہیں کہ ہر دَم تر و تازہ اور چاق و چوبند دکھائی دیتے ہیں؟۔ اس پر میں نے کہا تھا: ''مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہ آٹے کے ساتھ تھوڑی سی چکی بھی ضرور کھا لیتے ہیں، اور یوں بھی اُن کا ہاضمہ اور حافظہ دونوں غضب کے ہیں۔'' دلچسپ بات یہ ہے کہ بیگ احساس اپنے آپ کو جوان برقرار رکھنے یا ظاہر کرنے کی خاطر کسی ایسے بھاری بھر کم میک اَپ کو بھی اختیار کرنے کے قائل نہیں ہیں جس سے گذر کر آدمی جوان کم اور جوکر زیادہ نظر آنے لگتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اپنے بالوں کو بڑے جتن کے ساتھ خضاب سے رنگتے ہیں۔ یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ صرف بالوں کی سفیدی ضعیفی کی علامت نہیں ہوتی۔ مجھے اس وقت احمد ندیم قاسمی مرحوم یاد آ گئے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ اُن کے سر کے بال جوانی میں ہی سفید ہو گئے تھے، اور اُنھوں نے اپنی جوانی سفید بالوں کے ساتھ ہی گذار دی۔ تاہم بہت بعد میں بعض دوستوں کے مشورے پر اُنھوں نے اپنے بالوں کو خضاب سے رنگنا شروع کر دیا۔ ایک محفل میں احمد ندیم قاسمی کے ایک دوست نے ایک صاحب کا تعارف احمد ندیم قاسمی سے کرانے کی کوشش کی تو اُن صاحب نے کہا: ''حضور! آپ احمد ندیم قاسمی کا تعارف مجھ سے کیا کرائیں گے، میں تو اُنھیں اُس وقت سے جانتا ہوں جب اُن کے بال سفید ہوا کرتے تھے۔''

معاف کیجئے، بیگ احساس کی وجاہت اور دیدہ زیبی کا ذکر کچھ طویل ہوگیا۔ کہا جاپان کا ڈر ہے کہا جاپان تو ہوگا والا معاملہ ہے۔ یوں بھی جب میں نے بیگ احساس کے بارے میں کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو دل سے آواز آئی ''میاں برخوردار! تم نے زندگی بھر اپنی تحریروں میں اُردو کے پروفیسروں کا مذاق اُڑایا ہے۔ اب کس مُنہ سے بیگ احساس کے مُنہ پر خود اُن کے مُنہ کی تعریف کروگے'' بیشک میں نے اُردو کے اُن ہی پروفیسروں کا مذاق اُڑایا ہے جنھیں اُردو سے محبت نہیں ہے، اور وہ اپنے پیشہ اور اُس کی حُرمت کا لحاظ نہیں رکھتے۔ ایک دن میں نے اُردو کے ایک پروفیسر کے گھر جا کر کال بیل بجائی۔ جواب میں اُن کے آٹھ سالہ بیٹے نے دروازہ کھولا تو میں نے پوچھا: ''کیوں میاں تمہارے والد صاحب قبلہ گھر پر ہیں؟۔'' اس پر معصوم و مظلوم بچے نے وہیں سے اپنا مُنہ پلٹا کر بہ آواز بلند اپنی ماں سے پوچھا ''ممی! کیا ہمارے گھر میں کوئی والد صاحب قبلہ بھی رہتے ہیں؟۔'' اُس کے اس معصوم سوال پر میں دل مسوس کر رہ گیا۔ افسوس ہوا کہ اُردو کے پروفیسر ہونے کے باوجود خود پروفیسر صاحب نے کبھی اپنے بیٹے کو یہ نہیں بتایا کہ وہ انگریزی میں اس کے ''ڈیڈی'' ہونے کے علاوہ اُردو میں اُس کے ''والد صاحب قبلہ'' بھی کہلائے جاتے ہیں۔''

اُردو کے ایک پروفیسر کا کوئی کام کسی محکمہ میں رُکا پڑا تھا، بہت پریشان تھے۔ اتفاق سے میں اس محکمہ کے سربراہ کو جانتا تھا۔ مجھ سے دست بستہ گذارش کی کہ اس بارے میں ایک سفارشی خط اس محکمہ کے سربراہ کے نام لکھ دوں۔ چنانچہ میں نے اِدھر خط لکھا اور اُدھر اُن کا کام ہوگیا۔ اس کے جواب میں پروفیسر موصوف نے خوشی سے سرشار ہو کر شکریہ کا جو بے مثال خط اپنی بے مثال اُردو میں لکھا، اُس کے چند جملے من و عن ملاحظہ فرمائیے۔'' عالی جناب! آپ کی عنایت، کرم فرمائی،

بندہ نوازی اور غرباء پروری کا بے حد شکریہ کہ آپ کی مصلحت پسندیوں، اِفترا پردازیوں اور موقع پرستیوں کی بدولت میرا کام پورا ہوگیا۔ پھر ایک بار شکریہ۔'' اُردو کے اساتذہ کی غلطیوں کی مثالیں پیش کرنے پر اُتر آؤں تو صفحے کے صفحے سیاہ کرسکتا ہوں۔ ہے ادب شرط مُنہ نہ کھلوائیں۔

مثل مشہور ہے کہ لوہا ہی لوہے کو کاٹتا ہے۔ جب میں نے اُردو کے پروفیسروں کے خلاف بہت کچھ لکھ دیا تو ایک دن میرے کرم فرما حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر احتشام حسنین نے مجھے اپنی یونیورسٹی میں دو سال کی مدت تک کے لئے خود اُردو کا وزیٹنگ پروفیسر بنادیا۔ اُردو کے پروفیسروں کے خلاف میں نے ماضی میں جو کچھ لکھا تھا اُس پر مجھے ملال یا پچھتاوا تو نہیں ہوا، البتہ انجانے طور پر اُردو کے پروفیسروں اور اساتذہ کے تئیں میرے دل میں ہمدردی اور یگانگت کے جذبات پروان چڑھتے چلے گئے۔ میں اس سے پہلے بھی کئی سمیناروں میں شرکت کر چکا تھا مگر اَب بہ اندازِ دگر شرکت کرنے کا موقع ملا۔ اساتذہ، ریسرچ اسکالروں اور طلبہ سے جوں جوں تبادلۂ خیال بڑھتا گیا مجھے احساس ہونے لگا کہ اُردو کے اساتذہ کو کتنی پیچیدہ صورت حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام میں اُردو کی جڑیں بڑی تیزی سے کٹتی چلی جارہی ہیں۔ پہلے تو اُردو کے طلبہ کی نئی نسل آ ہی نہیں رہی ہے اور جو آرہی ہے اُس کی علمی استعداد بڑی مشکوک ہے۔ لگتا ہے پرائمری سے لے کر ہائر سکینڈری سطح تک ابتداء میں ہی ان طلبہ کی کوئی قابل لحاظ تربیت ہو نہیں پارہی ہے۔ اب بی اے اور ایم اے میں بھلا اچانک ان کی تربیت کیونکر ہو پائے گی۔ بیشک کچھ مخصوص علاقوں سے آنے والے اور خاص طور پر مدرسہ کی بیک گراؤنڈ رکھنے والے طلبہ کی تعلیمی استعداد بہتر ہوتی ہے لیکن اس سے تعلیم کے عمومی معیار میں کس طرح یکساں اضافہ ہوسکتا ہے۔ ایسے میں یونیورسٹی میں بیٹھا ہوا اُردو کا استاد اُردو کے لئے کچھ کرے تو کیا کرے اور کتنا کرے۔

معاف کیجئے مجھے بیگ احساس کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے اور میں اُردو کی تعلیم اور اُردو اساتذہ کے پھیر میں اُلجھ گیا۔ بیگ احساس کو میں نے اُردو کے نہایت تجربہ کار اور منجھے ہوئے پروفیسر کے روپ میں پایا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ ایک سحرالبیان مقرر ہیں مگر جب بولتے ہیں تو نہایت نپے تلے انداز میں کسی بھی موضوع کے حتی الامکان سارے گوشوں کا احاطہ کرتے ہوئے خیال کی گرہوں کو رفتہ رفتہ کھولتے چلے جاتے ہیں۔ وہ لفظوں کے طوطا مینا نہیں بناتے بلکہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنیٰ و مطالب کو ادا کرنے کا ہُنر جانتے ہیں۔ کم آمیز، کم گو، شائستہ اور مہذب بیگ احساس کی یہی سب سے اہم انفرادیت ہے۔ اُنھوں نے تدریسی سفر میں سینکڑوں ریسرچ اسکالروں کی ذہنی تربیت کی ہے۔ بے شمار سلیکشن کمیٹیوں اور سمیناروں میں شرکت کی غرض سے ملک کے مختلف شہروں کے سینکڑوں سفر کرنے کے علاوہ بیرون ملک بھی جاچکے ہیں۔

جہاں ایک پروفیسر کی حیثیت سے اُن کی اہمیت مسلمہ ہے وہیں تخلیقی سطح پر اُنھوں نے اپنا لوہا منوایا ہے۔ میری شخصی رائے ہے کہ عصرِ حاضر کے اگر پانچ بڑے افسانہ نگاروں کی کوئی فہرست مرتب کی جائے تو اُس میں بیگ احساس کا نام ضرور شامل رہے گا۔ وہ محقق اور نقاد تو ہیں ہی، فنِ افسانہ نگاری میں بڑی اہم، معتبر اور مستند شناخت رکھتے ہیں۔ وہ نہایت مخلص، سچے اور ایماندار افسانہ نگار ہیں۔ چنانچہ وہ اپنا ہر افسانہ نہایت ڈوب کر لکھتے ہیں۔ نہ صرف افسانہ میں ڈوب جاتے ہیں بلکہ افسانہ کے کرداروں میں ڈوبنے کے علاوہ افسانہ کی جزئیات اور اُس کے پلاٹ میں بھی ڈوب جاتے ہیں۔ تاہم اپنے قاری پر اتنا کرم کرتے ہیں کہ وہ ڈوبنے نہ پائے۔ ذرا دیکھیئے کتنا خیال رکھتے ہیں اپنے قاری کا۔ افسانہ کے تئیں اُن کے اہتمام اور انصرام کا یہ عالم ہے کہ ایک بار ''نمی دانم کہ'' کے زیرِ عنوان پیری مُریدی کے موضوع پر کوئی افسانہ لکھنے کا ارادہ کیا تو مختلف پیروں کے مزاروں پر حاضری دینے کے علاوہ درگاہوں اور خانقاہوں کے پھیرے لگانے شروع کردیئے۔ پہلے رنگ کا صوفیانہ لباس تک پہننا شروع کردیا اور قوالیوں میں اپنے اوپر وجد کی کیفیت بھی طاری کروانے لگ گئے بالآخر جب اُن کا افسانہ چھپا تو مجھے اُن کے افسانہ میں پوشیدہ اصلی زندگی کے کرداروں کو پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ جتنی محنت وہ خود افسانہ لکھنے میں کرتے ہیں اُتنی ہی محنت وہ اپنا افسانہ پڑھنے والے قاری سے بھی کراتے ہیں۔ کم از کم مجھ جیسے کم علم سے تو محنت ضرور کرواتے ہیں۔ جب سے میری عمر کے اسّی برس کے قریب تک پہنچنے کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں، میں نے اپنی ساری ڈکشنریوں کو اُٹھا کر الماری کے سب سے اوپر والے شیلف میں رکھوا دیا ہے۔ بھلا اب اس عمر میں کسی لفظ کے معنیٰ جان کر میں کیا کروں گا، اور اگر معنیٰ سمجھ میں بھی آگئے تو اُن پر عمل پیرا کیونکر ہوسکوں گا۔ تاہم بیگ احساس نے کم از کم دو مرتبہ مجھ جیسے ضعیف آدمی کو مجبور کیا کہ میں سیڑھی لگا کر جیسے تیسے اُن ڈکشنریوں کو نیچے اُتاروں۔ اصل قصہ یہ ہے کہ اُن کے ایک افسانہ کا عنوان تھا ''حنظل''۔ اب میں پریشان کہ یہ 'حنظل' کیا بلا ہے۔ تلاش بسیار کے بعد ڈکشنری دیکھی تو پتہ چلا کہ کڑوے پھل کو کہتے ہیں، بتایئے میں تو صبر کے پھل کے انتظار میں ہوں اور بیگ احساس نے میری خدمت میں کڑوا پھل پیش کردیا۔ ایک اور افسانہ کا عنوان تھا ''دَخمہ'' اس بار پھر وہی سیڑھی کی کشاکش اور محنت سے گذر کر معنیٰ دیکھے تو معلوم ہوا ''پارسیوں کے قبرستان'' کو کہتے ہیں۔ اب بھلا بتایئے عمر کی اس منزل میں اگرچہ قبرستان کا خیال اکثر آتا ہے لیکن میں پارسیوں کے قبرستان کو لے کر کیا کروں گا۔ مگر جب افسانہ پڑھا تو اُس کے انوکھے بیانیے اور طرزِ ادا کو پڑھ کر جی خوش ہوگیا۔ چلو ڈکشنریوں والی کڑی محنت اکارت تو نہیں گئی۔

حضرات! بیگ احساس سے میرے تعلقات کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ میں اُنھیں بے حد عزیز رکھتا ہوں، اور میری بے حد عزت کرتے ہیں۔ ان دو ''بے حدوں'' کی وجہ یہ ہے کہ میں اُن سے عمر میں کم وبیش پندرہ برس بڑا ہوں۔ اُنھوں نے از راہِ عقیدت اب تک مجھ ناچیز کے بارے میں تین طول طویل مضامین لکھے

ہیں۔ دوسری طرف میری کوتاہی ملاحظہ فرمایئے کہ میں پھر بھی خاموش رہا۔ سوچتا رہا کہ اگر میں خدانخواستہ کچھ ایسا ویسا لکھ گیا تو کہیں اُن آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے جو مجھے بہت عزیز ہیں۔ دو ڈھائی برس پہلے مجھے جب حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی میں دو برس کی مدت کے لئے وزیٹنگ پروفیسر بنادیا گیا تو مجھے سرکاری طور پر صدر شعبہ اردو پروفیسر بیگ احساس کی ماتحتی میں کام کرنے کا موقع بھی ملا۔ مگر اللہ رے پروفیسر بیگ احساس کی شان بے نیازی کہ میں جب بھی اُن کے کمرے میں گیا، ہزار مصروفیت کے باوجود ہمیشہ اپنی کُرسی سے اُٹھ کر ملے، اور میں جب بھی اُن کے کمرے سے نکلتا تو ہمیشہ مجھے رُخصت کرنے کے لئے غالباً محض اس ڈر سے باہر تک آجاتے تھے کہ میں کہیں واپس نہ آجاؤں۔

بیگ احساس جیسے وضعدار، روادار، طرح دار، مونس وغمخوار، نفیس، شائستہ، مہذب اور سلیقہ مند نوجوان کے بارے میں لکھنے پر آؤں تو لکھتا ہی چلا جاؤں گا حالانکہ کہنے کو بہت سی باتیں باقی رہ گئی ہیں۔ تاہم مجھے خاکہ کی طوالت کا نہ صرف احساس بلکہ بیگ احساس تک ہورہا ہے۔ سماجی محفلوں میں خود بیگ احساس نہایت کم آمیز اور کم گو واقع ہوئے ہیں۔ البتہ خانگی محفلوں میں کھل جاتے ہیں تو یہ الگ بات ہے۔ میں یہ بات دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اتنی لمبی رفاقت میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بیگ احساس نے میرے سامنے کسی کی غیبت کی ہو، یا کسی کے خلاف کوئی ناروا بات کہی ہو۔ نہ کبھی کسی کے خلاف سازش کی اور نہ کبھی کسی ریشہ دوانی اور اِفترا پردازی میں شریک ہوئے۔ حالانکہ ہمارے آج کے عمومی اُردو معاشرہ میں ایسی باتیں 'لازمی مضمون' کی حیثیت رکھتی ہیں۔

میں آخر میں وہی بات کہنا چاہوں گا جو عموماً سب سے آخر میں کہی جاتی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہر کامیاب آدمی کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ (اس کا ایک صاف مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہر ناکام آدمی کی بربادی کے پیچھے صرف ایک عورت کا ہاتھ کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے کئی عورتوں کے ہاتھوں کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ ذرا سوچئے، کتنی محنت لگتی ہے کسی کو برباد کرنے کے لئے)۔ بہر حال میں یہاں خصوصیت کے ساتھ صائمہ بیگ کے ہاتھوں کا ذکر کرنا چاہونگا جو بیگ احساس کی کامیاب زندگی کے ضامن ہیں۔ مگر یہ ہیں بڑے کمال کے ہاتھ۔ یہ ہاتھ جب بیگ احساس کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں تو اُنھیں کامیاب بنا کر چھوڑتے ہیں۔ جب یہ ہاتھ گھر کے باورچی خانہ میں پکوان کے ضروری ساز وسامان کے ساتھ مصروف عمل ہوجاتے ہیں تو ڈائیننگ ٹیبل پر آنے والے مہمانوں کو مجبور کردیتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے ہاتھوں کی پانچوں اُنگلیوں کو چاٹنے میں مصروف ہوجائیں۔ (میں صائمہ بیگ کے ان پکوانی ہاتھوں کا نہ صرف معترف ہوں بلکہ قائل اور قتیل بھی ہوں)۔ اور صاحب جب یہی ہاتھ گھر کی آرائش وزیبائش میں مصروف ہوجاتے ہیں تو گھر کے در ودیوار سے نہ صرف سلیقہ مندی ٹپکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے بلکہ ذرا غور سے دیکھا جائے تو صائمہ بیگ خود بھی اپنے ہاتھوں سمیت ٹپکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ صائمہ بیگ سے میرا ایک رشتہ یہ بھی ہے کہ وہ میرے مرحوم دوست حکیم راگی کی صاحبزادی ہیں۔ اس اعتبار سے میں اُن کا چچا کہلائے جانے کا حقدار ہوں، مگر وہ مجھے ''مجتبیٰ بھائی'' کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔ تاہم آپ اُن کے کہنے سُننے پر نہ جایئے۔ جو لوگ صائمہ بیگ سے شخصی طور پر واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ حیدرآباد کی اُن چند خواتین میں سے ہیں جو اپنے لئے تذکیر کے صیغے کا استعمال کرتی ہیں۔ جیسے کہیں گی ''میں گیا تھا، میں آرہا ہوں، اور میں جارہا ہوں وغیرہ''۔ اسی لئے میں کبھی کبھی مذاق مذاق میں صائمہ سے فون پر پوچھ لیتا ہوں ''صائمہ! تم کیا کررہے ہو اور بیگ کیا کررہی ہیں؟'' ایسی باتوں کو سُن کر صائمہ غصہ میں آجاتی ہیں۔ فرماتی ہیں ''مجتبیٰ بھائی! آپ بڑے شریر اور نٹ کھٹ بڈھے ہیں۔'' صائمہ بیگ کے اس شریر تبصرہ کی روشنی میں، میں اپنے اس خاکہ کو ختم کرنا چاہوں گا۔

سخن تمام ہوا، اور مدح باقی ہے

- بقیہ -

آگ کا دریا

قرۃ العین حیدر نے شعور کی رو کی تکنیک ہی استعمال نہیں کی بلکہ بیانیہ اسلوب کے بھی مختلف طریقے اپنائے ہیں۔ کہیں انشایئے کی تکنیک ہے تو کہیں **Narrative Shifts** نظر آتے ہیں۔ کہیں مہابھارت کے مختلف مناظر کو **Image Motif** اور **Symbol Motif** بنا کر پیش کیا گیا ہے، کہیں ملٹی میڈیا کا استعمال ہے ناول کے اختتام پر بھی ملٹی میڈیا سے کام لیا گیا ہے۔ گوتم ایک وسیع لینڈ اسکیپ میں چلتا دکھائی دیتا ہے۔ پھر منڈلی کے گانے والوں کی آوازیں ہیں۔ پھر اسے گوری شنکر کی اونچی چوٹی پر اپنا **Final Version** نظر آتا ہے وہ دنیا کا ازلی اور ابدی انسان ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا بستی کی طرف چلا جاتا ہے۔ ناول کے حصے ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ایک ہی ناول سے متعلق نہیں معلوم ہوتے۔

قرۃ العین حیدر نے ''آگ کا دریا'' میں دو تاثرات دو مختلف حصوں میں قایم کیے ہیں۔ پہلے کردار گوتم نیلمبر کا سرجو کی موجوں میں بہہ جانا پہلا تاثر قایم کرتا ہے اور ناول کے آخر میں دوسرا جس میں انسان مغرور، پُر اعتماد، بشاش (جو شکست خوردہ اور تھکا ہوا ہونے کے باوجود پرامید ہے) اور جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے۔ ناول کے آخری صفحے پر جو بیان گوتم کا **Final Version** ہے وہی اس کا **Triumph** ہے۔

بیگ احساس کے افسانے

وارث علوی

(●)

بیگ احساس کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''حنظل'' میرے ذوق کی تسکین نہیں کر سکا۔ کیوں کہ فن افسانہ میں میرا میلان ذوق حقیقت پسندانہ افسانوں اور ناولوں کی طرف رہا ہے۔ اردو کے جدید افسانہ کی تجریدیت اور فیشن زدہ علامت پرستی سے میں کافی برگشتہ خاطر رہا۔ جیسا کہ میری تحریروں سے ظاہر ہے۔ بیگ احساس سے مایوس ہو کر میں نے ان کی کتاب حنظل بک شلف کے اس خانہ میں ڈال دی جہاں یہ افسانوی مجموعے پڑے تھے جن پر دوبارہ وقت ضائع نہ کرنے کا میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔

لیکن ادھر رسالوں میں ان کے چند افسانوں پر نظر پڑی تو حیرت زدہ رہ گیا۔ محض اس وجہ سے نہیں کہ ان کے تخلیقی رویہ میں تبدیلی آئی تھی اور انہوں نے حقیقت پسندانہ طریقہ کار اپنایا تھا۔ کیوں کہ ایسی تبدیلیاں تجریدیت کے خلاف ردعمل کے طور پر اور کہانی کی بازآمد کے سبب اور بھی بہت سے جدید افسانہ نگاروں میں آئی تھیں لیکن محض حقیقت نگاری یا کہانی اور کردار اور کمٹ منٹ اس سماجی شعور، اچھی فنکاری کی ضمانت نہیں کیوں کہ فنکاری بہرصورت اعلیٰ تخیلی اور تخلیقی قوت پر منحصر رہتی ہے جو قدرت کا عطیہ ہے اور زور بازو سے پیدا نہیں ہوتی بہرحال ان کہانیوں کو پڑھ کر مجھے بیگ احساس میں ایک غیر معمولی تخلیقی قوت کا احساس ہوا۔

یہ افسانے ہیں (۱) دھار (۲) نجات (۳) سانسوں کے درمیان جو شعر و حکمت میں شائع ہوئے ہیں (۴) سنگ گراں (۵) کھائی جو رسالہ شاعر میں اشاعت پذیر ہوئے۔ شاید کچھ اور بھی افسانے ہوں گے جو دوسرے رسائل میں چھپے ہوں اور ممکن ہے میری نظر سے گزرے ہوں لیکن نہ تو وہ رسائل میرے پاس ہیں نہ یہ افسانے حافظے میں محفوظ ہیں۔ لیکن بحوالہ پانچ افسانے بیگ احساس کی تخلیقی جودت اور انفرادیت کا سکہ ذہن پر جمانے کے لیے کافی ہیں اور ان کی فن کاری کے متعلق چند باتیں مجھے کرنی ہیں تو ان پانچ افسانوں کا حوالہ میرے لیے کافی ہے۔

بیگ احساس کے ان افسانوں کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ مختصر ہیں۔ مختصر اس معنی میں نہیں جیسا کہ مختصر مختصر افسانہ ہوتا ہے اور جس کی نمائندہ مثالیں ہمارے یہاں رتن سنگھ اور عبدالعزیز خان کے افسانے ہیں۔ لیکن بیگ احساس کے تازہ افسانے دس بارہ صفحات سے زیادہ کے نہیں۔ یہ اختصار مواد کی کمی یا واقعات اور جزئیات سے احتراز یا بیانیہ میں عجز کے سبب نہیں کیوں کہ جہاں ایسا ہوتا ہے وہاں افسانہ عجلت نویسی کی زائیدہ تشنگی کا احساس چھوڑ جاتا ہے۔ اس کے برعکس بیگ احساس کا افسانہ بھرپور ہوتا ہے۔ اور سیرابی کا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ اس لیے ان کے یہاں اختصار اجمال کا حسن رکھتا ہے۔ ان کے یہاں ایک واقعہ ایک تفصیلی ایک جملہ اور ایک لفظ بھی بھرتی کا نہیں ملے گا۔ ان کے ایجاز اور منٹو کے ایجاز میں بڑی مماثلت ہے۔ لیکن ایجاز کا یہ سبق انہوں نے منٹو سے سیکھا ہو ایسا نہیں لگتا۔ کیوں کہ سبق سیکھنے کے لیے کم از کم افسانہ کے کینوس میں مماثلت ہونا ضروری ہے۔ بیگ احساس کا افسانہ خود اپنا ہے۔ اس پر ان کی انفرادیت کی چھاپ بھی ہے اور اس کے موضوعات مسائل اور پس منظر اس دور کا عطیہ ہیں جس میں ان کا شعور پروان چڑھا ہے اور جو منٹو، بیدی اور عصمت کے دور سے مختلف ہے۔ بیگ احساس کی انگلیوں کے نیچے ان کے زمانے کی نبض دھڑکتی ہے۔

اجمال کے ساتھ ان کی دوسری اہم صفت جو ان کی انفرادیت کی ضامن ہے ان کا اسلوب ہے۔ یہ اسلوب افسانوی ہے کتابی نہیں۔ افسانوی سے مراد وہ زندگی جو افسانوں میں جھلکتی ہے۔ اس کا عکس الفاظ، زبان، تشبیہوں اور استعاروں میں سمایا گیا ہے۔ میں اپنی اس رائے کا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں کہ جتنے مختصر جملے بیگ احساس لکھتے ہیں اس کی کوئی مثال اردو کے افسانہ نگار کے یہاں نہیں ملے گی۔ ان کا ہر جملہ پانچ سات لفظوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایسا یا تو زبان کا مبتدی کر سکتا ہے یا استاد جو سہل ممتنع پر قادر ہو۔ بیگ احساس کی زبان میں برجستگی ہے، سادگی ہے اور تازگی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اکثر وہ ایسے پیچیدہ مسائل، واقعات اور سچویشن کا ذکر کرتے ہیں جو زبان کی زیادہ پیچیدہ شکل کا متقاضی ہوتا ہے۔ لیکن بیگ احساس بڑی خوداعتمادی سے ان مرحلوں سے گزر جاتے ہیں اور اپنی زبان و بیان کے ایجاز و اختصار اور سادگی پر آنچ آنے نہیں دیتے۔ بیگ احساس کا امتیازی وصف ان کی کہانیوں کا انوکھا پن اور اچھوتا پن ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ موضوعات انہوں نے گرد و پیش کی اس دنیا سے لیے ہیں جو عبارت ہے فسادات کے بے جا تشدد، مسلم اقلیت پر توڑے گئے فرقہ پرست اکثریتی جماعتوں کے مظالم، سماج کی لائی ہوئی لعنتوں، سرمایہ و محنت کی کشمکش اور تہذیبی اور معاشی طور پر زوال آمادہ مسلم معاشرے سے۔ خیر تاریخ کا عطیہ تو تمام فنکاروں کی مشترکہ میراث رہا، لیکن بیگ احساس نے ان سے جو کہانیاں تراشی ہیں ان میں ایک طباع اور طبع زاد ذہن کی منفرد کارفرمائی جھلکتی ہے۔ کہیں بوسیدگی اور پیش پا افتادگی کا احساس نہیں ہوتا۔ حالات چاہے اتنے دگرگوں ہوں انسانی برتاؤ چاہے اتنا حوصلہ شکن ہو ماضی کا بوس حال پر انتشار اور مستقبل ناقابل پیش بینی اور غیر یقینی ہو بیگ احساس کلبیت اور قنوطیت کا شکار ہوئے بغیر انسانی تماشہ سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ لطف اندوزی کے بغیر تخلیقی فن ممکن نہیں ورنہ ٹریجیڈی آدمی کیسے لکھے گا اور کیوں کر پڑھے گا۔ مسلمانوں کے انحطاط و زوال و کسمپرسی کی کہانی سناتے ہوئے وہ بھلے کلبیت اور قنوطیت کے شکار نہ ہوں لیکن ایک گہرا غم جو ہڈیوں کو تک پگھلاتا ہے ان کے قلم کی روشنائی سے ٹپکنے لگتا ہے۔

بیگ احساس کا افسانہ ہے ''کھائی''۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔ ''برف کی سلوں کے درمیاں شوکت میاں کی نعش رکھی تھی۔ پنکھا تیزی سے چل رہا تھا۔ برف کے پگھلنے سے پانی کی بوندیں فرش پر گر رہی تھیں۔ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے کفایت علی نے اپنے باپ کی نعش کی طرف دیکھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ اسے اپنے باپ کے مرنے کا افسوس بھی ہے یا نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ آزادی محسوس کر رہا تھا جیسے قید سے رہائی ملی ہے۔ اس شخص کی موجودگی میں اسے اپنا وجود نظر ہی نہیں آتا تھا۔''

اس مختصر افسانہ میں تین نسلوں کی کہانی ہے۔ شوکت علی جن میں جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے بعد کردار کا زوال جھلکتا ہے۔ شوکت علی اپنی جاگیردارانہ نخوت شان وشوکت اور عیاشیوں اور زبان کے چٹخاروں میں کسی قسم کی کمی اور تخفیف کو روا نہیں رکھتے اس لیے خاندان کی دیکھ ریکھ سے بے پروا اپنی زندگی گزارتے ہیں اور خاندان کا استحصال کرتے ہیں۔ گھر والے روکھی سوکھی کھاتے ہیں لیکن شوکت میاں کے لیے چکنے چپڑے اور مرغن کھانے تیار ہوتے ہیں۔

افسانہ کا دوسرا اہم اور کلیدی کردار ہے شوکت علی کا بیٹا کفایت علی جو افسانہ کے آغاز میں برف کی سلوں میں رکھی ہوئی شوکت میاں کی نعش کے قریب بیٹھا ہوا قرآن خوانی کر رہا ہے۔ لیکن فیصلہ نہیں کر پاتا ہے کہ اسے اپنے باپ کے مرنے کا افسوس بھی ہے یا نہیں۔ شوکت' کفایت اور کفایت کے بیٹے کا نام شہزادہ تمثیلی نام نہیں ہیں ان کے ناموں سے کردار کی شناخت ہوتی ہے۔ شوکت میں جاگیردارانہ دبدبہ ہے تو کفایت میں وہ سوجھ بوجھ کفایت شعاری' محنت' نپی اڑان اور سادگی میں گزر بسر کرنے کا سلیقہ جو ایک متمول جاگیرداری خاندان کے زوال کے بعد اس کے افراد خاندان کو دکھ اور تباہی سے بچاتا ہے۔ معمولی کپڑے' معمولی سائیکل اور معمولی ملازمت جو اس کے جاگیردار باپ کو ایک اہلکار کی زندگی نظر آتی ہے۔ اسی معمولی زندگی کے ذریعے وہ اپنے افراد خاندان کی کفالت کرتا ہے۔ بڑی محنت سے وہ اپنے گھر کا خرچہ چلاتا ہے' ایک اچھی قبول صورت خاندانی لڑکی سے شادی کرتا ہے' جس سے اسے ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ جس کا نام وہ شہزادہ رکھتا ہے۔ یہ نام بھی تمثیلی ہے کیوں کہ اسم با مسمیٰ ہے۔ شہزادہ اسکول میں اچھا چلتا ہے پھر بہت سے امتحانوں میں فیل ہو جاتا ہے۔ خلیجی ملک میں ہجرت کرتا ہے پھر لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ پتہ نہیں کیا کرتا ہے لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ شہزادہ دور جدید کا صارفی اور مادہ پرست تمدن کا' صرف دولت کی شان وشوکت پر جینے والا نوجوان ہے۔ پتہ نہیں اتنی دولت اس کے پاس کہاں سے آئی ہے اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ اسے اس بے دریغ طریقہ پر کہاں کہاں خرچ کرتا ہے۔ شہزادہ اپنے دادا کی طرح سے دور جدید کا جاگیردار ہے۔

دادا اور پوتے کے بیچ کفایت علی واحد آدمی ہے جو اپنے رہن سہن اور طور طریقوں سے ٹھنڈے دل سے فکر وعمل اور عقل عامہ اور عقل خصوصیہ کا استعمال کر کے ایسے پرانتشار دور میں جینے کی راہ نکال لیتا ہے۔ قبرستان میں باپ کی قبر تیار ہوگئی ہے لیکن شہزادہ آ کر ایک بڑے اور قیمتی قبرستان میں دادا کے لیے قبر بناتا ہے۔ پہلے قبر والے جب آ کر پیسہ مانگتے ہیں تو کفایت کہتا ہے مزدوری کے پیسے لے لو۔ اسی پر جھگڑا ہوتا ہے۔ شہزادہ اپنے سسرال والوں کے ساتھ اندر کمرے میں بیٹھا ہوا مرحوم کے اوصاف بیان کر رہا تھا شور سن کر باہر آتا ہے اور معاملے کو جان کر پوچھتا ہے کتنے پیسے ہوئے۔ کفایت علی کہتا ہے صرف مزدوری کے پیسے دینا۔ شہزادہ کہتا ہے بابا گھر رشتہ داروں اور مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اور آپ ایک معمولی سی بات پر الجھ رہے ہیں۔ کفایت علی کہتے ہیں بیٹا تم میری بات سنو تم سارے پیسے کیوں دے رہے ہو آخر وہ قبر ہمارے کس کام آئے گی شہزادہ جھلا کر کہتا ہے ''آپ کے کام آئے گی''

اس طرح دفن ہوئی ہیں اعلیٰ اخلاقی اور انسانی قدریں۔ استحصالی اور عیاشیانہ جاگیرداری دور کے بعد آیا نو دولتیوں کا فضول خرچ صارفی زمانہ۔ جہاں دولت پانی کی طرح بہائی جاتی ہے جہاں دولت نہیں ہے زندگی آزمائش ہے۔ آدمی کا کردار تو آزمائشوں سے گزرنے کے بعد ہی بنتا ہے۔ دولت کی فراوانی عیاشی ہے یا عیاری۔ نہ تو شوکت علی کے پاس کوئی شوکت ہے نہ شہزادہ کے پاس کوئی ریاست۔ سب دکھاوا ہے۔ دکھاوا اور ڈھکوسلہ ہے۔ کفایت علی کے پاس کفایت ہے ایک وہی کھرا آدمی ہے۔ ایک ایسا آدمی جو زر پرستوں کی سفاک دنیا میں اپنے کردار کی مضبوطی سالمیت کے ذریعے ان طوفانوں سے گزرتا ہے۔ جو آدمی کی قسمت کو ریزہ ریزہ کرنے اور بکھرنے کے لیے کنزیومر سوسائیٹی نے پیدا کیے ہیں۔

''سانسوں کے درمیان'' بیگ احساس کا ایک اور افسانہ ہے جس میں بہت سے عصری مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مثلاً جدید سرمایہ داری نے ماس میڈیا کا استعمال کر کے عام لوگوں کو بھی ایسی ترغیبات کا شکار بنایا ہے کہ آدمی اپنی چادر جتنے پاؤں پھیلانے کا اہل نہیں رہا۔ یہ کردار کی شکست ہے۔ سانسوں کے درمیان جو افسانہ پھیلتا ہے وہ انہی ترغیبات کا پیدا کردہ ہے۔ ایک طرف باپ ہے جو کوما میں چلا گیا ہے اور اس کی سانس کی آوازیں ہیں۔ اسے اس کے بیٹے نے جو خلیج میں دولت مند بنا ہوا ہے شہر کے بہترین ہسپتال میں داخل کرایا ہے جہاں کا اسپیشل روم فائیو اسٹار روم جیسا ہے۔ باپ کی خدمت کے لیے وہ بیٹا ہے جو حیدرآباد میں تنگ دستی کی زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن ابھی اس کی جیب باہر سے تیمارداری کے لیے آئے ہوئے نوٹوں سے گرم ہے۔ وہ اپنے بچوں کو قیمتی کپڑے دلاتا ہے اور بچے بھی لالچی اور ترغیبات کے شکار ہیں۔ وہ اپنی بیوی کو بھی ہسپتال بلاتا ہے اور اس کے ساتھ کمرے سے ملحق خوبصورت حمام میں نہاتا ہے اور اختلاط کرتا ہے اور اس طرح پردہ سیمیں پر دیکھی ہوئی تصویروں کو اپنے لیے حقیقی بناتا ہے۔ ایک طرف باپ کی سانسیں ہیں اور دوسری طرف محو اختلاط ان میاں بیوی کے سانسیں۔ جنسی انبساط اچھے کھانے' اچھے کپڑے موت کے تاریک سایوں میں اپنا رنگ بکھیرتے ہیں۔ حرص و ہوس نا کی' دکھاوا اور مرتے ہوئے

باپ کی طرف سے مکمل بے اعتنائی سماجی شخصیت اور کردار کے ایسے بدنماز زوال کی علامت ہے جو سوائے نفرت اور کدورت کے کوئی جذبہ پیدا نہیں کرتے۔ دور جدید کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس نے آدمی سے MODEST LIVING کا امکان چھین لیا ہے۔ کم پیسوں میں بھی محبت سے لبریز پروقار اور کسی حد تک خوش گوار زندگی کا کوئی قرینہ نہیں بچا ہے۔ ایک بیٹا خلیج میں کمایا ہوا روپیہ خرچ کر کے باپ کی طرف اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے دوسرا باپ کی طرف کوئی بھی جذبہ محسوس کیے بغیر اس پیسے سے اپنی تشنہ تمناؤں کی سیرابی کا سامان کرتا ہے۔ موت، دولت، جنس کے اچھلتے ہوئے رنگ ہیں۔ تقدس، احترام، محبت، خود اطمینانی، قلندری اور سر بلندی کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ بیگ احساس نے بڑی معروضیت اور واقعیت پسندی سے یہ افسانہ لکھا ہے۔ طنز یہ صورت حال میں بھی لب ولہجہ تلخ ہونے نہیں پاتا۔

''نجات'' میں فرحان کی دیوانگی کا بہت ہی دلچسپ اور تجسس پیدا ہونے والا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ پرسی کیوشن کامپلکس لے کر پاگل پن کی حالت تک کا بیان بڑا نکتہ رس اور نفسیاتی صداقتوں کا حامل ہے۔ اس مطالعہ میں بیگ احساس کے مشاہدات بہت معتبر اور اثر انگیز ہیں۔ لگتا ہے انہوں نے اس قسم کے کرداروں کا قریب سے مطالعہ کیا ہے۔

فرحان خلیجی ریاست میں کام کرتا ہے۔ وہاں سے وہ غیر متوقع طور پر وقت سے پہلے ہی آجاتا ہے۔ وہ شادی شدہ ہے۔ شائد نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ چناں چہ اس کا دوست افسانہ کا واحد متکلم اس سے پوچھتا ہے۔ ''کیا عاشی کے بغیر رہنا مشکل تھا۔'' لیکن فرحان بتاتا ہے کہ انڈر ورلڈ والے پیچھے پڑ گئے تھے۔ جس کمپنی میں کام کرتا ہوں وہاں سارے ایک ہی علاقے کے ملازم ہیں۔ انہیں میری موجودگی کھل رہی تھی۔ یہ پرسیو کیوشن کامپلکس کی نشانی ہے۔ دیوانگی کا ابتدائی مرحلہ جس میں آدمی محسوس کرتا ہے کہ چند لوگ ہیں جو اس کے دشمن ہیں اور اس کے درپے آزار رہتے ہیں۔

فرحان کو اپنے اندر ایک باطنی طاقت کا بھی یقین تھا جو پاگل پن کی دوسری نشانی ہے۔ ''وہ اپنے اندر ایک روحانی طاقت محسوس کر رہا تھا ایسی طاقت جو آنے والے واقعات کی پیشن گوئی کر سکتی ہے۔ وہ کسی بھی عورت کو اپنے علم کے زور پر بستر پر بلا سکتا ہے اور جنسی تعلقات قائم کر سکتا ہے۔ میں نے اسے ڈانٹا کہ وہ بلو فلمیں دیکھنا چھوڑ دے اور جلد شادی کر لے۔ اس نے عاشی سے شادی کر لی۔ انجنیئر تھا ہاتھ پیر صورت شکل کا اچھا خاصا تھا۔ مذہبی خیالات تھے۔ بیرونی ملازمت تھی۔ نئے شہر میں بڑا سا مکان بنوا لیا تھا۔ عاشی جیسی خوب صورت لڑکی ملنا کوئی عجب بات نہیں تھی۔ شادی کے بعد وہ صالح نوجوانوں کی طرح اپنی بیوی کے ساتھ کمرے میں بند ہو گیا۔ خلیجی ریاست سے جب وہ ایک مہینے میں واپس آیا تو میں نے سوچا عاشی کی محبت میں چلا آیا ہو گا لیکن اس وقت اس نے عاشی کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارا۔ وہ مختلف دوستوں اور رشتے داروں سے ملتا رہا۔ کسی کی موت کی پیشن گوئی کر دی، کبھی دعوتوں پر بے جا اصراف پر تقریر ہوئی، کبھی مسلمانوں کی پستی اور انتشار کے اسباب بیان کرنے لگا۔ اکثر اپنے بھائی سے الجھتا رہتا کہ اس نے مکان کی تعمیر ٹھیک سے نہیں کی۔''

یہ سب علامات ہیں جنون کی طرف کھسکنے کے اس کا کسی کو احساس نہیں ہوتا۔

پاگل پن کا سخت دورہ اس وقت پڑتا ہے جب وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ عاشی اس کی بہت خدمت کرتی ہے۔ ایک رات وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ عاشی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ عاشی کے ساتھ محلے کے لوگ ناجائز تعلقات قائم کرنے آتے ہیں یہ مکمل Manic condition ہے۔ اس حالت میں وہ عاشی پر الزام لگاتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ پیشہ کرتی ہے۔ یہ مکمل پاگل پن ہے۔ لیکن دوسرے لوگ سوچتے ہیں یہ محض ناٹک ہے عاشی سے نجات پانے کا۔ عاشی تمام الزامات کے باوجود فرحان سے چمٹی رہتی ہے۔ اس کی خدمت کرتی ہے۔

پھر یکا یک فرحان اچھا ہو گیا۔ وہ پابندی سے علاج کرا رہا تھا۔ اسے پچھلا کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ دماغ کی سلیٹ بالکل صاف تھی۔

واحد متکلم کو عاشی کا فون آیا۔ ''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ فرحان کے ساتھ نہیں رہوں گی۔''

''کیوں؟'' واحد متکلم اچھل پڑا۔ ''کیسے نازک وقت میں ساتھ دیا اس کا جان کی تک پروا نہیں کی۔''

اب عاشی کا جواب دیکھنے کے قابل ہے۔

''میں آپ کو کیسے بتاؤں۔ میں تو ویسی ہی رہ گئی۔ پہلے نفرت اور دیوانگی کی وجہ سے دور رہتے تھے۔ اب شرمندگی اور احسان مندی کی وجہ سے دور رہتے ہیں۔ میں اس عذاب سے انہیں نجات دلانا چاہتی ہوں۔''

''سنگِ گراں'' میں لڑکے اور لڑکی نے شادی تو کر لی تھی لیکن ان کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ دن کو وہ ملتے ہیں لیکن رات کو وہ لڑکی کو اس کے گھر چھوڑ جاتا ہے۔ لڑکی حاملہ ہو گئی اور اس کی ناف میں سے ممی ممی کی آوازیں آئیں۔ یہ ممکن ہے کہ لڑکی کا وہم ہو لیکن لڑکی مامتا سے بھر گئی تھی۔ لڑکا چاہتا تھا حمل گرا دیا جائے۔ ''کیسے ہو گا یہ سب کچھ۔ ہمارا کوئی گھر نہیں ہے۔ دو ایک دوستوں کے علاوہ ہماری شادی کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ ہم مالی اعتبار سے بھی اتنے مضبوط نہیں ہیں کہ فوراً کوئی انتظام ہو سکے۔ تمہاری دیکھ بھال۔ ملازمت۔ پھر تمہاری ممی تو گھر سے نکال باہر کر دیں گی۔۔۔ کیسے ہو گا۔''

تو بالآخر لڑکی نے حمل گرا دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ لیڈی ڈاکٹر سے ملی۔ سب کچھ طے ہو گیا۔ لیکن اس کی مامتا اس کام کے خلاف تھی۔ ایک نظر سے دیکھیں تو افسانہ مامتا ہی کا ہے اور افسانہ میں مامتا کا جذبہ بہت شدت سے ابھر آیا ہے۔ لیکن اسقاط تو آخری عمل ہے۔ اس کے بعد کچھ کرنے کو رہتا ہی نہیں تو افسانہ نگار بھی کیا کرے۔ افسانہ نگاری چھوڑ کر وہ شاعری کرنے لگتا ہے۔ بالکل کرشن

چندر کے پورے چاند کی رات کی مانند۔ پورے چاند کی رات میں ہیرو ایک غلط فہمی کی بناپر پوری رومانی محبت کا خاتمہ کردیتا ہے اور محبوبہ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور برسوں کے بعد جب اپنے جوان بچوں کے ساتھ لوٹتا ہے تو یہ کشمیری محبوبہ بھی جوان بچوں کی ماں بن چکی ہے۔ اب کرشن چندر کے پاس زندگی ہر صورت جاری رہتی ہے اور تسلسل حیات کے لچر فلسفے پر شاعری بگھارنے کے سوا کیا رہ جاتا ہے۔ یہی حال بیگ احساس کا ہے جنھوں نے کرشن چندر پر پی ایچ ڈی کی ظاہر ہے ڈاکٹریٹ کے کلینک میں کچھ جراثیم ادھر سے تو ادھر ہوتے رہتے ہیں۔ چناچہ وہ نیل پالش جو افسانہ کا بہت دلچسپ موٹف ہے کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ نیل پالش کا سرخ رنگ تازہ تازہ خون جیسا' لیکن یہ خون اس بچے کا تھوڑا ہی ہے۔ اسے تو کنویں میں ڈھکیل دیا گیا ہے۔ اس نے خود کنویں سے آتی آواز سنی ہے۔ وہ محفوظ ہے۔ کوئی قافلہ ادھر سے گذرے گا تو اسے باہر نکالے گا۔ پھر اس کا نیلام ہوگا۔ اس کی خوب صورتی اسے بادشاہ تک پہنچائے گی۔ پھر اس کی وجاہت نازک انگلیوں کو زخمی کرے گی۔ پھر وہ سات مقفل دروازوں کی پرواہ کئے بغیر بھاگے گا تو دروازے خود بہ خود کھل جائیں گے۔ پھر وہ قید خانے سے معبّر بن کر نکلے گا۔

یہ شاعری ہے اور اسطور کا پچ ہونے کی وجہ سے جدید شاعری ہے' اور صرف خراب شاعری ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ وہ افسانہ کو بھی خراب کرتی ہے۔ تلخ حقیقت پسند افسانہ ایسا تلخ انجام چاہتا ہے جس کی تلخی زندگی بھر زبان پر قائم ہو۔ مثلاً بیدی کے افسانہ ''گرہن'' کا انجام ایک حرکی امیج کی صورت ہم جب تک زندہ ہیں ہمیں HAUNT ہانٹ کرتا رہے گا۔ موپاساں کے افسانہ ''ہیروں کا ہار'' کے متعلق سامرسٹ مائم نے لکھا ہے کہ ہار کھو گیا ہے تو وہ اپنے پڑوسیوں سے جا کر کہہ سکتے تھے۔ لیکن موپاساں کو تو ایک تاثیر پیدا کرنا تھا رائگانی حیات کا۔ مانگا ہوا ہار کھو گیا تو ایسا ہی ہار لوٹانے کے لیے ایک خوب صورت عورت اپنی پوری جوانی اور حسن اور ایک تنومند مرد اپنی صحت دن رات کی محنت میں برباد کردیتے ہیں۔ جب پیسے جمع ہوجاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں یہ تو جھوٹے ہیروں کا ہار تھا۔ آپ نے خواہ مخواہ اتنی محنت کی۔ قاری کو یہاں سب سے بڑا دھچکا رائگانی حیات کا پہنچتا ہے۔ جو حسن و شباب برباد کردیا اس کی بازیافت کیسے ممکن ہے۔ افسانہ کا انجام یہاں افسانوی ہے شاعرانہ نہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ نثر میں شاعرانہ انشا پردازی کسی بھی نوع رائگانی حیات کا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔

لیکن مذکورہ افسانہ میں بیگ احساس نے تھیم ہی ایسی پسند کی تھی کہ اس کا انجام تو انہیں بھگتنا ہی تھا۔ اسی لیے افسانہ کا انجام کیسا ہو یہ بھی فکشن کی تنقید کا ایک مہتمم بالشان موضوع رہا ہے۔

آپ کچھ بھی کیجئے افسانہ میں انجام کو بہر حال اگر چونکا دینے والا نہیں تو بھی معنی خیز تو ہوگا۔ جان اپڈائک نے کہا ہے کہ افسانہ کا انجام تو پاؤں کے تلے کی ENLARGED تصویر کے مانند ہونا چاہیے۔ خیر ایسا تند و تیز انجام تو سوائے منٹو کے بہت کم افسانہ نگاروں کے یہاں ملے گا۔ لیکن انجام کی ایک دلچسپ مثال بیگ احساس کا افسانہ دھار ہے۔

''دھار'' میں ایک مختصر افسانہ ہونے کے باوصف قومی اور بین الاقوامی سطح پر درپیش مسلمانوں کے اتنے سارے مسائل کو اپنے گھیرے میں لیا ہے کہ لگتا ہے کہ دور جدید کی پوری اسلامی سمسیا ان کی گرفت میں آ گئی ہے۔ اس سمسیا سے میں بہت بچنے کی کوشش کررہا ہوں کیوں کہ بیگ احساس نے اس کے جو کچھ پہلو پیش کیے ہیں ان پر میں اپنے طور پر لکھنا شروع کروں تو عصری تاریخ پر مبنی ایک ضخیم مضمون تیار ہوجائے۔ اس افسانے میں مسائل قومی سے لیکر بین الاقوامی سطح تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اللہ بیگ احساس کی اجمال نگاری کی نگہداشت کرے۔ وہ چند لفظوں میں کتنے مسائل اور واقعات کو بیان کردیتے ہیں۔ '' دھار'' میں معاملہ داڑھی اور شیونگ کٹ کا ہے۔ مرکزی کردار جو ایک پینے پلانے والا روشن خیال زندہ دل آدمی ہے اسے مخلوط کالونی چھوڑ کر مسلمانوں کے گھٹیا علاقے میں آ کر رہنا پڑتا ہے۔ وہ رہتا ہے اور شام کو دوستوں کے وہاں جا کر شغل کرتا ہے اور گھیٹو ں کی آبادی سے اس کا کوئی بہت ربط ضبط نہیں' نہ ہی گرد و پیش کے لوگوں کے ساتھ علیک سلیک ہے۔

لیکن اس کا بیٹا صوم وصلاۃ کا پابند اور گھنی داڑھی والا ایک نوجوان ہے جو مغربی ملک میں ملازمت کے لیے جاتا ہے لیکن داڑھی کی وجہ سے وہ کوئی دہشت پسند تنظیم کا آدمی نظر آتا ہے اس لیے مسترد کردیا جاتا ہے۔ ایک روز باپ کا شیونگ کٹ غائب ہوجاتا ہے۔ لڑکا آتا ہے اور کٹ پیش کرتا ہے۔ اب وہ بالکل کلین شیو ہے اور نیا پاسپورٹ بنوانے کی پیروی میں ہے۔ باپ کہتا ہے اب یہ کٹ تمہارے پاس ہی رکھو۔ باپ کی داڑھی بڑھ چکی ہے لیکن کیا مضائقہ ہے؟ اور بھی بڑھ سکتی ہے کچھ اور بھی تبدیلیاں آسکتی ہیں۔

اب دوسرا پاسپورٹ کیسے بنے گا۔ لڑکا کہتا ہے پیسوں سے سب کچھ بن جاتا ہے۔ گویا لڑکا جعلی پاسپورٹ پر بیرون ملک جائے گا۔ صوم وصلاۃ کی پابندی' ایمانداری اور داڑھی کے ساتھ وہ داخل نہیں ہوا اب بغیر داڑھی کے جعلی پاسپورٹ پر داخل ہوجائے گا اور باپ کو اب شیونگ کٹ کی ضرورت نہیں۔ کیا وہ دوسرا خرید لے گا یا داڑھی بڑھالے گا اور داڑھی بڑھ گئی تو شراب نوشی ترک کردے گا؟ نماز روزے کا پابند ہوجائے گا؟ کچھ بھی ہوسکتا ہے' اس دنیا میں سب کچھ ہوسکتا ہے۔ انجام یہاں امکانات سے بھرا ہوا ہے۔

یہ چند افسانے بیگ احساس کے بدلے ہوئے احساس' ایک نئے فنکارانہ رویہ اور عصری مسائل کی پیش کش کے ایک نئے اور تازگی بھرے طریقے کار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ افسانہ کا آرٹ فنکار سے زبردست DEDICATION کا طالب ہوتا ہے۔ یہ جز وقتی نہیں کل وقتی سرگرمی ہے۔ اگر بیگ احساس اسی طرح افسانوں کی نئی تھیم تلاش کرتے رہے اور نئے زمانہ نے جو انوکھے مسائل پیدا کیے ہیں انہیں وہ افسانوں میں ڈھالتے رہے تو مستقبل کے وہ ایک اہم اور منفرد افسانہ نگار کی صورت میں سامنے آئیں گے۔

افسانہ نگاری کی انوکھی تدبیر

مرزا حامد بیگ
(لاہور)

بیگ احساس کے افسانوں کے تیسرے مجموعے: ''دَخمہ'' کے سارے کے سارے افسانے، افسانہ نگار کی اس انوکھی تدبیر کاری کی عطا ہیں، جسے بیسویں صدی کے ساتویں دہے سے مخصوص جدیدیت کی تحریک کے رد میں اٹھنے والی آوازوں کا ردِّ عمل بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور تخلیقی سطح پر جینے کا جتن بھی۔ وہ یوں کہ بیگ احساس کا تعلق بھی ستر ہی کے دہے سے ہے، لیکن وہ جدیدیت کی تحریک سے الگ تھلک رہے۔ نہ 'شب خون' الٰہ آباد میں دکھائی دیئے، نہ اوراق، لاہور میں لیکن انھیں صرف و محض سادہ بیانیہ کبھی نہیں بھایا۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے سیدھے سبھاؤ تشکیل دیئے گئے بیانیہ کے اندر پرت در پرت کئی ایک تہیں جما کر کامل علامتی، استعاراتی، کیوبسٹک اور تجریدی افسانہ لکھنے کی بجائے ایک ایسا تہہ دار بیانیہ تشکیل دیا، جس میں معنویت کی کئی ایک پرتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

بیگ احساس کے اس جتن کو قدرے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑے گا، جب سترّ کے دہے میں میرے ہم راہی: رشید امجد، منشا یاد، اسد محمد خاں، ظہور الحق شیخ، مظہر الاسلام، احمد داؤد، علی تنہا، ذکاء الرحمٰن پاکستان میں اور سلام بن رزاق، نیر مسعود، قمر احسن، انور قمر، علی امام اور عبد الصمد بھارت میں، علامتی، استعاراتی، اور تجریدی افسانہ لکھ رہے تھے۔ تب ترقی پسند تحریک کی نمائندہ آواز عصمت چغتائی نے استہزایہ: ''سانپ کے تلوے'' اور غیر وابستہ افسانہ نگاروں کے سرخیل ممتاز مفتی نے افسانہ: ''کٹ پیس'' لکھ کر ہم لوگوں کا مضحکہ اڑایا تھا۔ احمد ندیم قاسمی نے مجلّہ: ''فنون'' لاہور میں سیفٹی والو لگا رکھا تھا، علامت، استعارے اور تجرید پر اور ہمارے افسانوں کے مقابل انھیں تیسرے درجے کے سادہ بیانیہ افسانے مرغوب تھے۔ یہی کچھ نقوش، لاہور اور 'نیا دور' کراچی میں دیکھنے کو ملتا تھا۔ ہمارے افسانوں کی اگر پذیرائی ہوئی تو 'شب خون' الٰہ آباد، اوراق، لاہور، سیپ، کراچی اور نئی قدریں، حیدر آباد (سندھ) میں۔ یا پھر، جواز، مالی گاؤں، شاعر، ممبئی، تحریک، دہلی، اسلوب، سہسرام، تخلیقی ادب، کراچی اور جہات، سری نگر نے اردو افسانے میں تکنیکی تجربات کو کھلے دل سے قبول کیا۔ اس کے بعد ترقی پسند تحریک کے گریٹ ماسٹرز کے چیدہ کام اور پانچویں چھٹے دہوں کے افسانہ نگاروں کے انگلیوں پر گنے جا سکنے والے افسانوں ''چاپ'' (رام لعل) 'سائے اور ہمسائے' اور پرندہ پکڑ نے والی گاڑی، (غیاث احمد گدّی)، بیلا نائی رے جولدی جولدی، اور ڈاب اور بیئر کی ٹھنڈی بوتل، (مسعود اشعر)، سوکھے ساون، اور پچھمّ سے چلی پُروا، (ضمیر الدین احمد)، کو چھوڑ کر جدید افسانہ اس دور کے بڑے بڑے ناموں کو کھا گیا۔ اکثر نے تو لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا جب جدید افسانے کے سب سے بڑے اعتراض کنندہ ممتاز مفتی نے ''چکٹ گاڑی، ہونکتا ہوٹر اور موم بتی'' کے عنوان سے پہلا علامتی اور تجریدی افسانہ قلم بند کیا، جو جدید ادب، خان پور کے افسانہ نمبر بابت فروری ۱۹۸۰ء میں رشید امجد، احمد داؤد اور میرے افسانوں کے ساتھ شائع ہوا۔ اس افسانے کے بعد انھوں نے ''چوہا'' اور ''روغنی پتلے'' کے عنوانات سے دو علامتی افسانے اور لکھے اسی طرح احمد ندیم قاسمی نے اپنا پہلا علامتی افسانہ ''پہاڑ'' کے عنوان سے لکھا جو ان کے آخری افسانوں میں سے ایک ہے۔ اشفاق احمد کے تین علامتی افسانے ''قصہ نل دمنتی''، ''بندر لوگ'' اور ''قصاص'' لکھے۔ رحمان مذنب کا ''خوشبودار عورتیں'' اور بانو قدسیہ کا ''انتر ہوت اداسی'' بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔

مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف و محض ناقدین سے ڈر کر تخلیق کار نئے امکانات سے ہاتھ کیسے روک لیتا ہے۔ بیسویں صدی کے آٹھویں دہے کے بعد ایسا کچھ بھی دیکھنے کو ملا، جب ڈاکٹر جمیل جالبی کا علامتی، استعاراتی اور تجریدی افسانے کے خلاف ''اوراق'' لاہور میں شائع شدہ واحد مضمون شائع ہوا، جس میں ابلاغ کے عنقا ہو جانے کا دکھڑا اس شد و مد کے ساتھ رویا گیا کہ افسانہ بھوسے کا ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ کثیر العباد افسانے کی جگہ سیدھی سادہ کہانی سے مخصوص یک سطحی سادہ بیانیہ نے لے لی۔ جب کہ آٹھویں دہے سے متعلق ایک استثنائی مثال سید محمد اشرف (افسانوی مجموعہ ''بادصبا کا انتظار'') کی ہے۔ سبحان اللہ! کیا افسانے لکھے انھوں نے کہانی پن کی جستجو میں دُبلے ہو جانے والے افسانہ نگار، جید ناقدین کو لبھانے کی خاطر یک سطحی سادہ بیانہ لکھ رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ انھیں صرف و محض زبانی شاباشی ہی میسر آئے گی اس لیے کہ کوئی بھی ناقد بھوسے کے ڈھیر پر مہر تصدیق کرے تو کیسے؟

بیگ احساس کے افسانوں پر بات کرنے سے پہلے یہ چند معروضات اس لیے بھی ضروری خیال کیں کہ ساتویں دہے میں اپنے عروج کو پہنچ جانے والی جدیدیت کی تحریک اور بیسویں صدی کے آٹھویں دہے کے وسط تا حال اسے رد کرنے والے پینتیس سالہ دورانیے کے تجزیہ میں آسانی رہے۔

بیگ احساس کا تعلق بھی میری طرح اسی مقہور و مردود ستر کی دہائی سے ہے، جس میں جدید افسانہ نگار بھارت کے فیروز عابد، مظہر الزماں خاں، حسین الحق، شوکت حیات، حمید سہروردی، انور خاں، انجم عثمانی اور شفق بھی متحرک دیکھے گئے، نیز اکرام باگ تھے، جنھوں نے کیوبسٹک طرز کو اپنایا اور یکسر نا کام رہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بیگ احساس نے پانچ، چھے برس بعد افسانہ نگاری شروع کی اور اپنے لیے علامت، استعارہ اور تجرید کی بجائے کچھ الگ بطور Tool کے برتا، وہ ''الگ'' کیا تھا، اس پر بھی بات کرتے ہیں لیکن پہلے ایک اعتراف، اور وہ یہ کہ میں اس مجموعے میں شامل افسانے ''رنگ کا سایہ''، ''دَخمہ''، ''نمی دانم کہ''، ''دھار'' پڑھ کر یکسر حیران رہ گیا اور بار ہا افسوس کیا کہ بیگ احساس کے افسانے اس وقت میری نظر سے کیوں نہ گزرے، جب میں ''افسانے کا منظر نامہ'' (طبع اول ۱۹۸۱ء) پر ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۷ء

کام کررہا تھا۔ بیگ احساس، بلاشبہ ایک قابل توجہ افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو بھی ان کے افسانوں سے مخصوص جدا گانہ ٹریٹمنٹ اور عہد موجود سے متعلق گہرا ادراک اور فراست کا ایک ایسا تال میل دکھائی دے گا، جس کے درج ذیل زمرے بنائے جاسکتے ہیں۔

۱) ماضی سے حال اور لمحہ موجود سے ماضی قریب اور ماضی بعید میں اُتر جانے کا عمل، افسانہ ''دَخمہ''، ''رنگ کا سایہ''، ''کھائی'' اور ''سنگ گراں''

۲) پرانی اور نئی نسل کا ٹکراؤ کئی ایک سطحوں پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ آزاد خیالی اور مذہبی جنونیت، نیز تہذیبی اقدار سے جڑت اور بے گانگی آپس میں ٹکراتے اور ٹوٹ کر شہاب ثاقب کی طرح جلتے بجھتے دکھائی دیتے ہیں جس کی نمایاں امثال ''دَخمہ''، ''رنگ کا سایہ''، ''نمی دانم کہ'' اور ''دھار'' جیسے افسانے میں۔

۳) سب سے بڑا ٹکراؤ حیدرآباد (دکن) کے مسلم گھرانوں کے احساس تفاخر اور عصر نو کی نوجوان نسل کی معاشی الجھنوں سے پیدا شدہ سوچ کے بیچ ہے۔ (مثال: کھائی) اسی طرح ان کے شاہکار افسانے ''رنگ کا سایہ'' کا نوجوان مرکزی کردار اسی ٹکراؤ کے سبب ڈانواں ڈول ہے۔ جائے تو کدھر جائے۔

دیکھئے، ہر قابل توجہ قلم کار کی ایک اپنی تخلیقی شخصیت ہوتی ہے، جو اس کی تخلیقات میں جھلکتی ہے۔ کبھی واشگاف اور بعض اوقات پس پردہ۔ یہ دیکھا دیکھی کا عمل نہیں۔ اب بات کو سترہی کے دہے کے چند افسانہ نگاروں کی امثال سے واضح کردوں۔ رشید امجد نے علامت نگاری تو کی، لیکن انھوں نے جس نوع کا تشبیہاتی انداز اپنے تجریدی افسانوں میں برتا، اس کا پرتو ہمیں منشا یاد، حمید سہروردی، اعجاز راہی، طاہر نقوی اور احمد داود کے ہاں بھی دیکھنے کو ملا۔ منشا یاد اور احمد داود نے اس سے کنارہ کرکے ہی اپنی اپنی شناخت وضع کی، جب کہ دیگر افسانہ نگاروں کو اس کا احساس تک نہ ہوا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

بیگ احساس، اپنے ہر افسانے میں اپنے علاقائی حوالوں اور نسبتوں کے ساتھ موجود دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے علاقائی حوالے حیدرآباد (دکن) سے متعلق سبھی قلم کاروں سے جداگانہ ہیں ماسوائے مکالماتی سطح پر اور نسبتیں، حیدرآبادی انگ کے۔ بول چال کی سطح پر یہ انگ تو نہیں بدلے گا، جیسے مغربی پنجاب سے مخصوص لہجہ، جو احمد ندیم قاسمی، غلام الثقلین نقوی اور منشا یاد کے ہاں یکساں ہے اور مشرقی پنجاب کا لہجہ، جو راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ اور رتن سنگھ کے ہاں یکساں ہے۔

بیگ احساس کی اصلی طاقت وہ علاقائی حوالے اور نسبتیں ہیں، جنھوں نے انھیں جدیدیت کی تندندی سے بھی دور رکھا اور اکہرے بے رس بیانیہ سے بھی۔

مجموعہ ''دَخمہ'' میں شامل ہر ایک افسانے میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہے جو 'خاص' ہے جس کا تعلق ہمارے تہذیبی منطقے سے بھی ہے اور اکیسویں صدی کی کروٹیں لیتی زندگی سے بھی۔ ان افسانوں میں موجود گہری فراست، کسی نہ کسی معمول کی بات کے اندر سے پھوٹتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ پھیل کر اس معمول کی بات کے گرد ایک ہالہ سا بن دیتی ہے۔ یہ خود رد عمل اندر ہی اندر، نامحسوس طور پر ہوتا ہے اور یوں معمول کی بات، غیر معمولی اور بالآخر بے مثل بن جاتی ہے۔ جیسے افسانہ ''دَخمہ'' میں آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد بڑھتی ہوئی مذہبی لہر کیا اٹھی، ایک پارسی سہراب کا پشتینی میکدہ (MAI KADA Est.1904ء) مسجد سے ہمسائیگی کے سبب بند ہوگیا۔ یہ فی زمانا ایک معمول کی بات ہے۔ لیکن کیا سہراب کی موت کا یہی سبب تھا یا کچھ اور؟ پھر یہ کہ کسی بھی ذی روح کی موت ایک معمول کی بات ہے۔ غیر معمولی اس وقت بنی جب پتا چلا کہ میکدہ ۱۹۰۴ء میں قائم ہوا تو اس کے برابر میں مسجد تھی۔ تادیر دونوں موجود رہے۔ اب میکدہ بند ہوگیا۔ کیوں؟ مسجد تو پہلے بھی تھی۔ یہ پہلے کیوں نا بند ہوا۔ وقت نے کروٹ لی۔ لوگوں میں رواداری ختم ہوگئی۔ سہراب کے پاس اللہ کا دیا بہت ہے۔ میکدے کے بند ہو جانے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تو کیا رواداری کا ختم ہو جانا اس کی موت کا سبب بنا؟ جب یہ سوال اٹھا تو بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ پارسیوں کی نسل تو یوں بھی ختم ہوتی جارہی تھی۔ کیا اسی مرحلے پر میکدہ بند کروا دینا ضروری تھا؟ یہ سوال اسی تہذیبی رواداری کی کوکھ سے جنم لے سکتا ہے جو کبھی تھی اور اب نہیں رہی۔

دَخمہ گاتھی (Gothic) طرز تعمیر کا افسانہ ہے، جس میں عقائد، رسومات، روایات، تاریخ، سیاست اور انسانی روابط کے متعلقات کی محرابیں اک دوجے میں پیوست ہیں۔ اس افسانے میں جس فراست کے ساتھ حیدرآباد میں ملوکیت کے خلاف چلنے والی کمیونسٹوں کی تلنگانہ تحریک اور آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد پولیس ایکشن، نیز زبان کی بنیاد پر ریاستی حد بندیوں کا حوالہ دیکھنے کو ملتا ہے، اس طرح تو ابراہیم جلیس کی لانگ فکشن: ''دوملک، ایک کہانی'' میں بھی دیکھنے کو نہ ملا:

''پولیس ایکشن نے مسلمانوں کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ مذہب کے نام پر ملک کی تقسیم سے پوری قوم سنبھلی بھی نہ تھی کہ زبان کی بنیاد پر ریاستوں کی نئی حد بندیاں کی گئیں۔ ریاست کے تین ٹکڑے کر دیئے گئے۔ برسوں گزر جانے کے بعد بھی دوسری ریاستوں سے جڑے یہ ٹکڑے ان کا حصہ نہ بن سکے۔ اپنی مستحکم تہذیب کی بنیاد پر ریاست کے یہ حصے ٹاٹ میں مخمل کے پیوند لگتے تھے۔

جس شہر کی تاریخ نہیں ہوتی اس کی تہذیب بھی نہیں ہوتی۔ نئے آنے والوں کی کوئی تاریخ تھی نہ تہذیب ایک مستحکم حکومت کا دارالخلافہ سیاسی جبر کی وجہ سے ان کے ہاتھوں میں آ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح خالی زمینوں پر آباد ہوگئے۔

زمین بیچنا یہاں کی تہذیب کے خلاف تھا۔ شرما شرمی میں قیمتی زمینیں کوڑیوں کے مول فروخت کر دی گئیں۔ آنے والے زمینیں خرید خرید کر کروڑ پتی بن گئے۔

کسی کوٹھی میں صدر ٹپہ خانہ آ گیا، کسی حویلی میں انجینئرنگ کا آفس، کسی حویلی میں اے جی آفس تو کسی حویلی میں بڑا ہوٹل کھل گیا۔ باغات کی جگہ بازار نے لے لی۔ لیڈی حیدری کلب پر سرکاری قبضہ ہوگیا۔ کنگ کوٹھی کے ایک

حصے میں سرکاری دواخانہ آگیا۔ جیل کی عمارت منہدم کر کے دواخانہ بنا دیا گیا۔ رومن طرز کی بنی ہوئی تھیٹر میں اب بہت بڑا مال کھل گیا تھا۔ حویلیاں، باغات، جھیلوں اور پختہ سڑکوں کے شہر کی جگہ دوسرے عام شہروں جیسا شہر ابھر رہا تھا جس کی کوئی شناخت نہ تھی۔''

پارسی گٹھ، کی تفصیل اور میت سے متعلق پارسی رسوم و رواج کی تفصیل بھی حیران کن ہے۔ افسانہ نگار، اپنے ہر افسانے میں اس نوع کی حیرانی بانٹتے چلے آئے ہیں لیکن طریقہ کار کے فرق کے ساتھ اس افسانے میں یہ کام شعور کی رو کو مہارت کے ساتھ برت کر کیا گیا۔ یوں ماضی اور حال اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ افسانے کا حصہ بنتے ہیں۔

''یہ دَخمہ ہے۔ اس کی چھت درمیان سے اونچی ہوتی ہے۔ چھت پر تین دائرے بنے ہیں۔ مرد کی نعش اندرونی دائرے میں، عورت کی درمیانی دائرے میں اور بچوں کی نعش اندرونی دائرے میں رکھی جاتی ہے تا کہ ان پر تیز دھوپ پڑے اور گدھوں کو دور سے نظر آ جائے......... اسے سگ دید کہتے ہیں۔ چار آنکھوں والا کتا......... یہ سگ دید ہی آدمی کے نیک و بد ہونے کا کا فیصلہ کرتا ہے۔''اور چاچا یہ گدھ کہاں سے آتے ہیں؟''،''اگر فرش پر چینی گر جائے تو چیونٹیاں کہاں سے آتی ہیں؟'' چاچا نے سوال کیا اور اندر چلے گئے۔''

زمانے کس طرح کروٹ لے رہا ہے؟ اس کی تفصیل نہایت عمدگی سے اس دورانیے میں بیان کی گئی ہے، جب سہراب کے اعزاء اور چند ایک شناسا دَخمہ کے اندر سہراب کی آخری رسومات میں مصروف رہے۔

میکدے میں بیٹھنے والا ایک ساتھی، جو امریکہ جا بسا تھا، بیس برس بعد لوٹ کر آیا تو حد درجہ ناسٹالجک ہو گیا تھا۔ پارسی گٹھ کے اندر تعمیر کردہ دَخمہ کی چھت پر سے جب تک گدھ، سہراب کی برہنہ نعش کو نوچ کر لے جائیں، افسانہ نگار ہمیں افسانہ کے راوی اور اس کے امریکہ پلٹ دوست کے ہمراہ سہراب کے گھر لے گئے۔ یہ ماضی قریب کی بات ہے جو حال کے بے رحم لحات سے آ کر جڑ گئی ہے اور پارسی گٹھ میں سہراب کی آخری رسومات جاری ہیں۔ معلوم ہوا کہ حیدرآباد آ کر بس جانے والے پارسی، سیکولر آصف جاہی سلطنت کے چرچے سن کر آئے تھے۔ یہاں انھیں خطابات سے نوازا گیا، نواب سہراب نواز جنگ، فرام جی جنگ، فریدون الملک، وہ شاہی دور تھا۔ آزادی ملی اور جمہوریت آئی تو اس رواداری کا خاتمہ ہوا۔ مسلمانوں کی شکایت پر میکدہ بند کر دیا گیا۔

پارسیوں کے گھٹ جانے کے سبب اب تو دَخمہ کی چھت پر گدھ بھی نہیں منڈلاتے۔ سہراب خوش نصیب تھا کہ جب اس کی برہنہ نعش دَخمہ پر رکھی گئی تو دور دور تک گدھوں کا نام ونشان نہ تھا، پر جانے کہاں سے گدھوں کا ایک جھنڈ دَخمہ کی طرف لپکا۔ بے شک، فرش پر چینی گر جائے تو چیونٹیاں آ ہی جاتی ہیں۔

افسانہ دَخمہ میں جس سوچ نے مسجد کی ہمسائیگی کے سبب میکدہ بند کروایا، وہی سوچ اب جنوبی ایشیاء کے مسلم گھرانوں کے دروازوں پر مہیب دستک بن گئی ہے۔ نائن الیون کو امریکن ٹریڈ سنٹر کی دو فلک بوس عمارات پر القاعدہ کے حملے نے عالمی معیشت، سیاست اور سوچ کے ڈھروں کو ایک نئی کروٹ دے دی۔ عراق اور افغانستان اتحادی افواج کا نشانہ بنے تو اس کا ردعمل بالخصوص سوات اور فاٹا (پاکستان) اور مجمل طور پر ایران میں بہت شدید تھا۔ ہندوستان جیسا سیکولر جمہوری ملک بھی اس کی تپش سے جھلسا۔ بابری مسجد کے سانحے کا ردعمل پاکستانی میں بہت شرمناک تھا۔ یوں تو ۱۹۴۷ء کے فسادات کے نتیجہ میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہجرت کر جانے کے سبب پاکستان میں مندروں اور گوردواروں کو تالے پڑ گئے تھے، لیکن وہ زنگ آلود تالے بھی کہاں گوارا رہے۔ بڑی تعداد میں مندر گرا دیئے گئے، یہاں تک کہ لاہور کا جین مندر بھی۔

ہجوم کی بپھری ہوئی نفسیات عجب ہے۔ فائر بریگیڈ نے جب پشاور کے ایک چرچ سے اٹھنے والی آگ بجھا دی تو اگلے روز اس چرچ کے آگ میں جھلسے ہوئے دروازے پر ایک بورڈ آویزاں دیکھا گیا۔ جس پر لکھا تھا:

''یہ وہ عبادت گاہ ہے، جس میں پاکستان کی سلامتی کی دعا مانگی جاتی تھی۔''

بیگ احساس نے ایسے میں افسانہ ''دھار'' کی صورت ہندوستان کا درجہ حرارت نوٹ کروانے کو ایک بہت معمولی سی بات کو چنا۔ جو ابتدا میں تو معمولی تھی، لیکن آخر کار غیر معمولی بن گئی۔ ایک ریٹائرڈ مسلم، جس نے ریٹائرمنٹ کے بعد نہ داڑھی بڑھائی، نہ تسبیح ہاتھ میں لے کر مسجد کا رخ کیا، اس وقت مخمصے میں پڑ گیا جب حسب معمول صبح اٹھ کر اس نے شیو بنانا چاہی تو اسے اس کی شیونگ کٹ مخصوص جگہ پر رکھی ہوئی نہ ملی۔ بس اتنی سی بات تھی۔

اس کے بیٹے نے سیاہ شرعی داڑھی رکھ چھوڑی تھی، جو اس کے لیے ناگوار خاطر تھی۔ کٹر مذہبیت کی اپنے ہی گھر سے اٹھنے والی لہر اس کے لیے ایک مشکل بنتی جا رہی تھی۔ اس سے ایک ایسے ناسٹالجیا نے جنم لیا جو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے کھو جانے سے متعلق ہے سب مٹتا جا رہا ہے، یہ عمل کیسے تھمے؟ جو مٹ گیا، اس کی بازیافت کیوں کر ہو؟

اس نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ خود اپنے یا اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ بنانے کی خاطر کسی یورپی ملک میں چلا جائے۔ اسے یہ گوارا نہیں کہ محض روپے پیسے کی خاطر دوسرے درجے کا شہری بن جائے۔ جب کہ اس کی اگلی نسل ایسا کچھ ہی چاہتی تھی اور یہ اس کے لیے سوہان روح بنتا جا رہا تھا۔

اس نے اپنا آبائی گھر اس لیے چھوڑا کہ وہاں رفتہ رفتہ پنپنے والی مذہبی منافرت، اس کی طرز زندگی پر کھلے طنز میں ڈھلنے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ طنز، قتل وغارتگری میں ڈھلے، چھوڑ دیا اس نے وہ علاقہ اور اٹھ آیا، خالص مسلم آبادی میں جہاں ہر نکڑ پر لمبے کرتے اور اونچے پاجامے پہنے، سروں پر ٹوپیاں اڑسے لمبی داڑھیوں والے بزرگ تھے۔ یا چلتے پھرتے سیاہ برقعے۔ یہاں مسلمانوں ہی کو راہ راست پر لانے والی تبلیغی جماعت کی ٹولیاں گھر گھر دستک دیتیں۔ پر اس کے معمولات میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی البتہ برسوں کے معمولات میں پہلا رخنہ

تب پڑا جب اس کی بیوی نے الگ فرش پر بستر بچھا کر سونا شروع کر دیا اور پہلا دھچکہ یہ لگا کہ اس کے بیٹے نے شرعی داڑھی رکھ لی اور روپے پیسے کی خاطر یورپ کا رخ کیا۔ اس نے دل پر پتھر باندھ لیا۔ یہاں تک تو اس میں مزاحمت کی ہمت تھی لیکن غیر معمولی پن نے ایک جست آگے کو تب بھری جب اس کے بیٹے کو اس کے ظاہری حلیے کے پیشِ نظر یورپ کے ایئرپورٹ سے ہی واپس کر دیا گیا، اس شک کی بنا پر کہ اس کی ہیئت کذائی بین الاقوامی دہشت گردوں سے ملتی جلتی تھی۔

کیا ان پر دنیا تنگ ہو رہی ہے؟ یہ وہ سوال تھا، جس کے سامنے اس کے معمولات زندگی کے ہی نہیں، اس کی بچی کھچی مزاحمت کے بخیے ادھڑ گئے۔ ایسے میں جب کئی روز بعد یورپ سے دھتکارے ہوئے بیٹے نے یہ کہتے ہوئے کہ "صرف داڑھی رکاوٹ بن گئی ہے پاپا..... یہ لیجئے آپ کا سیٹ تو وہ بولا: "نہیں...... اسے تم ہی رکھ لو"

اس نے اپنی من چاہی زندگی گزارنا چاہی تھی، جس میں ناکام رہا۔ کٹر مذہبیت اور فرقہ واریت کی سخت مزاحمت کی لیکن اپنے ہی خون کی شکست، ناکامی اور پسپائی کو دیکھ کر وہ ڈھے گیا۔ اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا، اپنی بڑھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور خیال کیا کہ کچھ بُرا تو نہیں لگ رہا، گوارا ہی تو ہے۔

افسانے کا یہ اختتامیہ لاتعداد سوالات کو جنم دیتا ہے۔ کیا اس کی سوچ غلط تھی؟ کیا بیٹے کی صورت اپنے ہی خون کی یورپ میں Rejection اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی؟ کیا اس نے بدلے ہوئے حالات کے آگے سر جھکا دیا؟ یا اس کا یہ فیصلہ اپنے جگر گوشے کو اپنی ہی دھرتی سے جوڑے رکھنے کی نئی تدبیر ہے؟ افسانے کو اس درجہ کثیر الجہات بنانا کچھ اتنا ارزاں نہیں۔

افسانہ "نمی دانم کہ....." میں بنیادی قضیہ کیا ہے؟ ایک معمول کی بات قبضہ گروپ نے ایک شریف آدمی کے مکان پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ جو نسلاً مغل ہے، لیکن اس پر کبھی گھمنڈ نہ کیا یونیورسٹی ٹیچر ہے اور اس کا ریٹائرمنٹ قریب ہے۔ اس سے قبل کہ ریٹائرمنٹ ہو جائے اور یونیورسٹی اس سے سرکاری کوارٹر خالی کروالے، اپنا آبائی مکان جو والد گرامی نے کرائے پر اٹھا دیا تھا، کرایہ داروں سے خالی کروانا چاہتا ہے لیکن وہ کسی طور مان کر نہیں دیتے۔ سخت مشکل میں ہے۔ اللہ والوں سے رجوع کرنے کا سوچتا ہے اور نام پلی، کا رخ کرتا ہے۔ حیدرآباد (دکن) کا وہ علاقہ، جہاں مرکزی ریلوے اسٹیشن تھا۔ نام پلی کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ عبداللہ قطب شاہ کے دیوان سلطنت رضا قلی نیک نام خاں کے نام پر آباد ہوا۔ عوام نے نیک نام خاں، سے نام چنا اور اس کے ساتھ تلگو کا لفظ پلی جوڑ کر نام پلی بنا لیا۔ نامپلی میں ایک درگاہ تھی، جہاں جمعرات کے دن معمول سے زیادہ بھیڑ بھڑکا رہتا۔ لوگ فاتحہ خوانی کو بھی آتے اور درگاہ کے سجادہ نشین سے دعا بھی کرواتے۔

وہ وہاں پہلی بار گیا تھا۔ درگاہ میں حاضری کے اطوار سے یکسر نابلد۔ بس ایک ہی جملے کا ورد کیے جا رہا تھا مجھے مکان واپس دلوا دیجئے۔

درگاہ سے ملحقہ مسجد کے صحن میں "اللہ ہو" کا ورد جاری تھا اور درگاہ کے سجادہ نشین کی وہاں موجودگی بھی ثابت تھی، لیکن مرادیں مانگنے والوں کا ایک اژدہام تھا۔ جب تک ان تک پہنچتا، حضرت نے قوالوں کی منڈلی کا رخ کر لیا۔ قوالوں کو نذرانہ پیش کیا جاتا رہا اور یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ یہ دیکھ کر وہ اٹھ آیا۔ اگلے روز وہ حضرت قبلہ کے گھر چلا گیا کہ عرض گزارے کسی نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ قابض کرایہ دار، حضرت قبلہ کے خاص مریدوں میں سے ہے۔ اب اس کی مشکل سوا تھی۔ سخت مضطرب، وہ دروازے میں جوتوں کے قریب بیٹھ گیا۔ دالان میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور حضرت بیان فرما رہے تھے "علم دو ہیں..... ایک علم ظاہر...... دوسرا علم باطن....." وہ کرے تو کیا کرے حضرت قبلہ کا بیان طول پکڑ گیا۔ تاوقتیکہ نماز کا وقت ہو گیا اور وہ حضوری سے ایک بار پھر محروم رہا۔

ایک یونیورسٹی ٹیچر کی اس سے زیادہ کیا تذلیل ہو سکتی تھی اسے اس مقام تک پہنچا کر معمولی استعداد کا افسانہ نگار نا کام و نامراد شخص کو متعلقہ درگاہ اور حضرت قبلہ کے گرد قائم شدہ عقیدت کے حصار سے متنفر دکھا سکتا تھا پر یہ ایک فطری لیکن حد درجہ معمول کا ادنیٰ سا رد عمل ہوتا۔ افسانے کی بنیاد بننے والی ایک معمول کی بات معمول کے درجے سے اوپر نہ اٹھتی۔ قاری کو جھٹکا اس وقت لگتا ہے جب وہ اپنی دوسری ناکامی پر ان جعل سازوں، جنھوں نے اہل صوف کا مکھوٹا چڑھا رکھا ہے کی جانب قلبی جھکاؤ محسوس کرتا ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ تصوف کی حقیقت سے ناآشنا ہے۔ یہودیت کے 'زہاد' عیسائیوں کی 'رہبانیت' مجوسیوں اور زرتشوں کی فکر اور ویدانت کے فلسفے پر اس کی گہری نظر ہے۔ یہ جھکاؤ در حقیقت اس کی غرض کی شدت ہے۔ اس کا خواب دیکھنا ثابت کرتا ہے اس نے مکان واگزار کروانے کے جھمیلے میں بہت پاپڑ بیلے۔ آخر بے بس ہو گیا۔ خواب میں بشارت ملنے کا سلسلہ موقوف ہوا وہ تھکا ہارا تیسری بار درگاہ کا رخ کرتا ہے اور صادق العقیدت مریدین کے آخری سرے پر جا بیٹھتا ہے۔

حضرت قبلہ کا بیان جاری تھا اور ذکر ہو رہا تھا میدان کرب و بلا میں امام حسینؓ کی بیعت کرنے والے صابرین کا اور اشارہ تھا حسینؓ کے یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی جانب۔ اس نے سوچا کہ دل نہ بھی مانے تو کیا مصلحت کے تحت بیعت کر لی جائے؟ اس کے ذہن میں ابھرنے والا یہ سوال ایک بڑی زقند ہے جو اسے کھائی کے اوپر فضا میں ملحق کر دیتی ہے۔ نہ کھائی میں گرتا ہے، نہ اسے الانگھ پاتا ہے۔ یہاں سے یہ افسانہ Habituation کی نفسیات کی جانب نکل جاتا ہے۔ اس کے بعد نہ تو اس محفل میں مکان پر قابض کرایہ دار بیٹھا دکھائی دیا نہ حضرت قبلہ کی لن ترانیوں نے اسے موقع دیا کہ وہ اظہار مدعا کرے۔ وہ تو درگاہ تک جانے، وہاں بیٹھنے اور سننے کا عادی ہوتا چلا گیا۔

اس کی یہ قلب ماہیت، روحانی ہی نہیں جذباتی سطح پر بھی ہے۔ مدت بعد اس کا جی چاہا کہ گھر جائے اور اپنی منکوحہ کی گود میں سر رکھ کر جی ہلکا کر لے۔ اس کا راضی بہ رضا اور پرسکون ہو جانا، اس معمول کی بات (جس پر افسانے کی عمارت کھڑی ہے) میں کتنے ہی معنوی ابعاد پیدا کر دیتے ہیں۔ ایسے میں ایک ضمنی قصہ افسانے میں کیا سجا ہے، سبحان اللہ، بادشاہ دونوں بزرگوں کے آگے سر

جھکائے کھڑا ہے۔ انھوں نے اس سے ایک ٹھیکری منگوائی...... پھر وہ بادشاہ کی طرف دیکھتے ہوا بولا'' جاؤ، ان سے کہہ دو کہ وہ چلا گیا'' وہ چمار نہیں اس زمانے کے قطب تھے جو ابوالحسن تاناشاہ کی سلطنت کی حفاظت کر رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد قلعہ فتح ہوگیا۔

وہ تو اپنی منکوحہ کی گود میں سر رکھ کر جی ہلکا کر لیتا لیکن گھر میں ایک بیوی ہی تو تھی، جسے مکان واگزار کروانے کی جلدی تھی۔ لحہ بھر کے لیے اپنی بیوی کی جانب اس کے اٹھتے ہوئے قدم، دنیاداری کا آخری حیلہ تھا اور اس کا لیٹے لیٹے کروٹ بدل کر سو جانا، راضی بہ رضا ہوجانے کا اشارہ ہے۔

حضرت قبلہ کا اس کی جانب متوجہ ہونا، اسے اپنے قریب بلانا، سینے سے لگا کر بھینچنا اور پشت تھپتھپانا اپنے اندر خاصی تہہ داری سمیٹے ہوئے ہے۔ حقیقت میں ایسا ہوا یا نہیں؟ کچھ کہہ نہیں سکتے اس لیے کہ وہ تو Habituation کا شکار ہو کر دنیا و مافیہا سے بے پرواہوگیا تھا۔ اس روز کرایہ دار، مکان خالی کر کے اس کے گھر چابی دے گیا تھا یا نہیں؟ کیا پتا۔ اس کا صدق دل سے یہ دعا مانگنا کہ اے اللہ، مجھے مسکین رکھ، کسی ایک قطعی اور حتمی نتیجہ کی بجائے افسانے کو کوئی ایک معنوی ابعاد سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

افسانہ'' سانسوں کے درمیان'' میں مرکزی کردار کی نفسی کیفیات کو 'شعور کی رو' کی تکنیک میں رقم کیا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار مختلف نفسی کیفیات کے تحت تیزی سے محسوسات اور تخیلات کے ایک زون سے دوسرے زون میں حرکت کرتا رہتا ہے۔ اس حوالے سے اس کا لاشعور اس کا معاون و مددگار ہے۔ سگمنڈ فرائیڈ کے نظریہ لاشعور کی عطا، اس تکنیک کا تعلق موضوع سے زیادہ Method سے ہے، جس کے تحت دماغ میں آئے بے ربط امور نئی ترتیب میں ڈھلتے ہیں یوں اس افسانے کے مرکزی کردار کے ذہن میں بننے اور تحلیل ہوجانے والی حقیقت سے مشابہ تصویروں کا ربط ضبط کسی منطق یا استدلال کی وجہ سے نہیں بلکہ لحظہ بہ لحظہ لاشعور سے شعور میں داخل ہونے والی کیفیات سے ہے۔ اب تو Pribram اور Spinelli کے لیباٹری تجربات نے بھی یہ بات ثابت کردی ہے کہ دماغ کا حرکی نظام، انسان کے حسی نظام پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دماغ اپنی'' درآمد'' کا من پسند انتخاب کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ'' من پسند انتخاب'' اس کے لیے سودمند بھی ہو۔ وہ اس کے لیے گھاٹے کا سودا بھی ہوسکتا ہے۔

افسانہ'' سانسوں کے درمیان'' میں اس کی بہترین امثال وہ ہیں، جب افسانے کے مرکزی کردار کے والد کو ICU سے پیئنگ روم (Paying Room) میں منتقل کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر اس کے محسوسات کے درجے نوٹ کریں تو یکے بعد دیگرے اچنبھے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۱) اگر مریض پیئنگ روم میں آ گیا تو لواحقین کے جیب میں ادائیگی کرنے کو معقول رقم ہونا شرط ہے۔

2) مریض کی حالت کیا سنبھلی، افسانے کا مرکزی کردار ایک نئی الجھن کا شکار ہوگیا کہ میاں بیوی کے پاس نئے کپڑے، جوتے تو ہیں نہیں کریں گے کیا؟

اسی نوع کے پیچ، بیگ احساس کی افسانوی تدبیر کاری کا خاصہ ہیں۔ اس دوسرے سوال کے سر اٹھاتے ہی افسانے کے بنیادی قضیے مہنگے ہسپتال کی فیس اور باپ کے مرجانے کا اندیشہ قدرے تحلیل ہوگئے۔ اب افسانے کے مرکزی کردار کی دبی ہوئی خواہشات یکے بعد دیگرے اسے ایک ٹائم زون سے دوسرے ٹائم زون میں دھکیلتی ہیں۔ پیئنگ روم سے ملحقہ واش روم میں وہ اکیلا، نہاتے ہوئے کمرے میں موجود عورت کو آواز دے کر بلاتا ہے۔ جو اس کی بیوی ہے، لیکن ذہن کے دوسرے زون میں منتقل ہوجانے کے سبب وہ اپنے ساتھ نہاتی ہوئی منکوحہ عورت کے جسم میں وہ کساوٹ محسوس کرتا ہے، جو صرف اور صرف کسی کنوارے نسوانی وجود سے مخصوص ہے۔ پھر یہ کہ اس کسے ہوئے نسوانی وجود کا مزاحمت کرنا (جب کہ اس کی منکوحہ، اس کے بچوں کی ماں، کیا مزاحمت کرے گی) قدرے الگ نوعیت کی مزاحمت ہے، جس کا تعلق سسر کے مکمل ہوش میں آجانے سے ہے۔ وہ اگر ہوش میں آگئے تو کیا سوچیں گے؟ جب کہ اپنی ہی منکوحہ کے وجود میں ان چھوئی حسیناؤں کی تلاش اور بیوی کے بال اور ٹی بروز بنوانے اور مینی کیور، پیڈی کیور کی خواہش نیز گھر کے لیے میکسی گرائنڈر، کولر اور اسفنج کے گدے کی خریداری اس تبدیل ہوتے ہوئے ذہن کے سبب ہے۔ والد کی بیماری اور آبزرویشن کے گنے چنے دنوں میں ہسپتال کے VIP ماحول میں رہنے کا لازمہ۔ لیکن ایسے میں جب والد ICU سے نکل کر پیئنگ روم میں آگیا اور تن درستی کی طرف بڑھ رہا ہے تو بچوں کے لیے ریڈی میڈ کپڑوں کی خریداری کیوں ضروری ہے؟ اس کے جواب میں صرف یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہی تبدیلی، جو VIP ماحول میں رہنے کا لازمہ تھا وہ بھی ہے، لیکن ایک سبب وہ اندیشہ بھی ہے جو اندر ہی اندر جڑ پکڑ رہا ہے کہ باپ مرگیا تو اپنوں اور غیروں کے جمع ہونے پر بچوں کی حالت بہتر دکھائی دے اور بھرم رہ جائے۔ اور بالآخر ہوا بھی وہی۔ جب محسوسات اور مشاہدات کے نتیجہ میں ذہنی اور جذباتی تبدیلی آگئی تو اس تبدیلی کا واحد سبب (والد) زندگی کی بازی ہار گیا۔

افسانے کے اختتام پذیر ہوجانے پر اک ذرا تامل...... یہ تو ظاہر ہے کہ مرنے والا اپنے بیٹے، بہو اور پوتے پوتیوں کی زندگی میں جینے کی اک نئی امنگ بھر کر گور اُتر گیا۔ لیکن اس پر بھی تدبر کی ضرورت ہے کہ بیگ احساس نے کس طرح افسانے کو اس انجام تک پہنچانے سے پہلے درمیان میں معنویت کی تہیں بچھائیں اور کس طور بچھائیں۔

'' رنگ کا سایہ'' تہہ دار بیانیہ میں تحریر کردہ محبت کی ایک شاہکار کہانی ہے۔ جس کی بنیاد حیدرآباد (دکن) سے مخصوص تہذیبی اور سماجی اقدار اور مسلم آبادی کا احساس تفاخر بنا۔ یہ احساس تفاخر، قلم کار کے پرکھوں سے بذریعہ اجتماعی لاشعور آگے منتقل ہوا اور اب افسانہ نگار کے ناسٹلجیا کی صورت افسانے میں ایک برے قضیے کی صورت ابھرا۔ ناسٹلجیا کی دوسری لہر خود افسانہ نگار کے ذاتی تجربات سے متعلق ہے۔ یوں ان دونوں اقسام کے ناسٹلجیا نے اس بظاہر معمول سے متعلق روز و شب مشاہدے

میں آنے والی اوائل جوانی کی ناکام محبت کی کہانی کو خاص بنادیا ہے۔

افسانے کا آغاز ان دولائینوں سے ہوتا ہے۔

'ہم اسی جگہ جا رہے تھے، جہاں سے ہمیں راتوں رات افراتفری کے عالم میں بھاگنا پڑا تھا۔امی کا تو صرف جسم ساتھ آیا تھا۔روح شاید وہیں بھٹک رہی تھی پھر جسم بھی اس قابل نہیں رہا کہ ان کے وجود کا بار اٹھا سکتا۔آج اس جسم کو اسی زمین کے سپرد کرنا تھا۔''

کوئی بھی افسانہ نگار اس طور بہت بڑا جوا کھیلتا ہے۔لیکن بیگ احساس کو تاش کے پتے پھینٹنے کا فن آتا ہے۔تاش کے کھیل میں 'فلاش' کھیلتے ہوئے اتنا اعتماد صرف اس کھلاڑی میں ہوگا، جسے باون پتے یاد ہوں اور نہ صرف یاد ہوں بلکہ ایک ایک پتہ اس کی انگلیوں کے تابع ہو کہ جب چاہا دوسرے تیسرے ہاتھ Show مانگ لینے والے کسی تھرڈ لے مدمقابل کو غلاموں کی ٹریل تھما کر خود یکوں کی ٹریل رکھ لی اور لگے بلائینڈ کھیلنے۔

افسانے کے راوی کے دوسوال ''کیا امی کی موت کا ذمہ دار میں ہوں؟'' اور جواب کو سمیٹتے ہوئے اگلا سوال کہ ''گھر چھوڑ کر تو سب بھاگے تھے۔ پھر اس کی ذمہ داری ہمارے عشق پر کیسے آگئی؟ افسانویت کا جال بچھانے کا کام کرتے ہیں۔اسی طرح ماضی بعید سے متعلق بہن کے گھر سے ایک بیوہ کے بچوں سمیت بیڑی کالونی میں اٹھ آنے کا ناسٹلجیا کئی رنگ بدلتا اور افسانویت کی لہر کو طاقت فراہم کرتا ہے۔ بیڑی کالونی سے متعلق یادوں کے بہاؤ کو توڑ توڑ کر بیان کرنے (تاکہ طوالت کا احساس اکتاہٹ نہ پیدا کردے) کے حوالے سے افسانہ نگار کی فنی مہارت کا پتا چلتا ہے۔

افسانے کے نوجوان مسلم مرکزی کردار (راوی) نے پہلی بار ایک کنویں کی مینڈھ پر ہندو لڑکی لکشمی کو دیکھا جس نے اسے تلگو زبان میں 'پگلا لڑکا' کا نام دیا تھا۔لکشمی اسکول میں پڑھتی تھی اور اس کی ماں گھر میں پرانے رنگ برنگے کپڑوں کو جوڑ کر بنتہ سیتی رہتی تھی۔سندھی میں ہمارے ہاں 'بنتہ' 'کورلی' کہا جاتا ہے۔دوسری طرف سب کچھ لٹ جانے کے باوجود مسلمانوں میں ایک طنطنہ تھا۔ ہندو جاتی کے مقابل ایک ایسا احساس تفاخر، جو اس افسانے میں جنم لینے والے المیے کا بنیادی سبب بنا۔لکشمی، لکشمی کے بہنوئی (ملیا) اور لکشمی کی ماتا (ناگماں) کی عاجزی اور سیس نوائی، افسانے میں میٹھا درد بھرنے کا کام کرتی ہے۔ جب کہ افسانہ نگار کی جانب سے تہذیبی مطلقے سے متعلق اٹھائے گئے سوالات کہ ''ہماری جڑیں کہاں ہیں؟ اس دھرتی سے ہمارا کیا رشتہ تھا؟ وہ جو اس دھرتی کی پہچان تھی؟ کیا ہوئی؟ اس میٹھے درد میں کڑواہٹ اور زہرنا کی بھر دیتے ہیں۔

ماں کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹانے والی لکشمی کو کھیتوں کی طرف آنے میں تاخیر ہوئی تو اس کے ہونٹوں سے نکلا ''شما کر دو'' یہ اس خاندان کا وہی مودبانہ رویہ ہے، جو لکشمی کی ماں، بالماں کے ساتھ فیکٹری میں بیڑیاں بنانے والی کو نام لے کر نہیں، درسانی (بیگم صاحبہ) کے عزت دارانہ طریق سے مخاطب کرواتا ہے۔ جب کہ لکشمی کے راجکمار کو یہ اعتراض کہ لکشمی کا بہنوئی رکشہ کیوں چلاتا ہے، کوئی عزت دارانہ کام کیوں نہیں کرتا اور اس کے جواب میں لکشمی انتہائی عاجزی سے وضاحت کرتی ہے کہ ہم ہمیشہ سے ایسے نہ تھے۔اس کا یہ بیان حیدرآبادی انگ میں ملاحظہ کیجئے۔

''کیا کریں گے ان کو کوئی اور کام آتچ نیں۔اماں اور بھابی سمجھا سمجھا کے تھک گئے۔نائنا (والد) ہمارے گاوں کے نواب صاحب کے خاص آدمی تھے۔اماں بولتے کہ نواب صاحب ان پہ بہوت بھروسہ کرتے تھے۔ان کو ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔پولیس ایکشن میں ہمارا گاوں بہوت متاثر ہوا۔نواب صاحب کا بنگلہ جلا دیا گیا۔ان کے اپنے گاوں والے ان پر حملہ کرے تو نواب صاحب کو بہوت صدمہ ہوا۔بعد میں جاگیراں بی ختم ہوگئے۔پولیس ایکشن کے بعد نواب صاحب گھر سے باہر نئیں نکلے ان کا جنازہ اچ نکلا۔نائنا بی زیادہ دن زندہ نہیں رہے۔ نائنا کے انتقال کے وخت بہوت چھوٹی تھی۔ہم لوگاں گھر بیچ کے یہاں آگئے۔ یہاں آنے کے بعد انا رکشہ چلانے لگے''۔کچھ دیر خاموشی رہی۔''آپ لوگوں کو دیکھ کے اماں نواب صاب کے گھر والوں کو بہوت یاد کرتے۔''

اگر یہ تفصیل حیدرآبادی انگ میں نہ ہوتی تو کیا اس قدر بجتی؟ پھر لکشمی کی یہ سوچ کہ ''آپ لوگاں یہاں کیوں آئے، بیڑی بنانے والوں کی کالونی میں؟ ظاہر کرتی ہے کہ وہ راجکمار کی داسی ہے۔راجکمار کی سندرتا اور گورا رنگ، برباد کر گیا لکشمی کو۔اس نے دل و دماغ میں بٹھالی راجکمار کی شبیہہ اور جب بچہ جنا تو وہ ویسا ہی تھا۔وہی ناک نقشہ وہی رنگ جسے نہ برادری نے قبول کیا نہ اس کے شوہر نے جب کہ ان دونوں کا اس نوع کا جسمانی تعلق تو قائم ہی نہیں ہوا تھا۔ راجکمار کے بیڑی کالونی چھوڑ کر جانے کے سال بھر بعد شادی ہوئی تھی لکشمی کی۔ پر راجکمار کے رنگ کا سایہ ایسا پڑا کہ خاک کر گیا لکشمی کو ایک تہمت کی اتنی مار!

کچلے اور روندے ہوئے، ایک چنگھاڑ اس وقت بنتے ہیں، جب ان کی عزت پر ہاتھ ڈالا جائے۔اور وہی ہوا۔راجکمار کو اپنے گھر والوں سمیت، رات کی تاریکی میں نکلنا پڑا اس کالونی سے۔رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔ایسے میں گھر چھوڑتے ہوئے اس مسلم گھرانے کا غُرّا دیکھیں کہ لکشمی کو 'حرافہ' کہا جارہا ہے۔کہا جارہا ہے کہ ان لڑکیوں کا کام ہی یہی ہے کہ اچھے خاندانوں کے لڑکے گھیریں۔لیکن جب انھوں نے رات کی تاریکی میں کالونی چھوڑی تو انھیں بس اسٹاپ تک رکشے میں لے جانے کے لیے صرف ایک رکشہ ڈرائیور، جو لکشمی کا بہنوئی تھا، تیار پایا گیا۔پر یہ سب اس کے رکشے میں بس اسٹاپ تک کیوں جاتے، وہ تو اس حرافہ کا بہنوئی تھا۔

وقت گزر گیا اور جب ماں کی اپنے آبائی علاقے میں تدفین کی خاطر لکشمی کے راجکمار کا ادھر آنا ہوا۔تو وہ لکشمی کے بہنوئی ہی کے رکشے میں بیٹھ کر قبرستان سے وہاں تک آیا۔

''کافی رونق ہوگئی ادھر تو''

''ہاں، آبادی بڑھ گئی ہے''

''پانی کا کنکشن لگ گیا؟''

''ہاں''

''کتنی تکلیف ہوتی تھی کنوئیں سے پانی بھرنے کے لیے''

وہ جواب میں کیا کہتا۔ چپ رہا۔ اس کا زخم ہرا ہو گیا تھا پانی کے کنویں پر ہی تو ملاقات ہوئی تھی لکشمی سے اس کی اور اس کے نتیجہ میں ملنے والی بدنامی اس کی سالی کا مقدر بن گئی۔

افسانے کے اختتام پر کوئی واضح جواب، کوئی واضح لائحہ عمل لٹی پٹی لکشمی کے راجکمار کے پاس نہیں، جو تہذیبی منطق کی بات کرتا تھا ..... زمین سے اپنا ناتہ کھو جتا تھا۔ اس کے سامنے اس کی شکل شباہت کا گورا چٹا ایک ننھا لڑکا کھڑا ہے، جسے بیڑی کالونی کے سبھی لوگ اسی کی ناجائز اولاد تصور کرتے ہیں۔

وہ فولڈنگ چیئر پر بیٹھا، اپنے سامنے اجڑی ہوئی فرش نشین لکشمی سے متعلق اس دُبدا میں پڑ گیا کہ کسی جھمیلے میں پڑے بغیر محض لکشمی کو دلاسہ دے کر وہاں سے چپ چاپ اٹھ آئے یا اس بچے کے سر پر ہاتھ رکھے اور لکشمی کو اپنے ساتھ لیے کہیں دور چلا جائے۔ قوی امکان یہی ہے کہ ''رنگ کا سایہ'' کھا جائے گا لکشمی کی جوانی........ کچھ نہیں بچے گا۔

بیگ احساس کے تخلیق کردہ کردار مختلف زمانوں میں چہل قدمی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ زمانہ حال کو ماضی سے اور ماضی سے مستقبل کو اتنی سہولت سے جوڑ دیتے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ افسانہ 'کھائی' میں مرحوم باپ کی میت برف کی سلوں کے حصار میں رکھی ہے، اس لیے کہ پوتے نے اس وقت تک تدفین سے روک دیا ہے، جب تک وہ اپنے وطن واپس نہ آجائے۔ ایسے میں شعور کی رو چپکے چپکے محض حال کو ماضی سے ہی نہیں جوڑ دیتی بلکہ گئی محافل کی گرد جھاڑ کر انھیں اجال بھی دیتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نفسیاتی الجھاوؤں کے سرے ماضی میں جھانکنے سے مل جاتے ہیں۔ جیسے اس افسانے میں باپ سے بیٹے کے متنفر ہو جانے کا سبب معلوم ہوا۔ نیز یہ بھی پتا چلا کہ یہ تین نسلوں کا الجھیڑا ہے، جس میں باپ کے ایک پرانے خدمت گار کی وفاداری جاگیردارانہ سوچ پر ضرب کاری ہے۔ جاگیردارانہ سوچ کے حامل باپ کی شاہ خرچیاں گھر کا بجٹ خراب کرنے کا سبب بنتی رہیں اور بیٹے کی میانہ روی کو اہلکارانہ ذہنیت قرار دیا جاتا رہا۔ یہی ٹکراؤ اندر ہی اندر افسانے کی بنت کرتا ہے۔ مرحوم کے بیٹے (کفایت علی) کے لیے سب سے بڑا دھچکہ یہ ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی جاگیردارانہ سوچ کی کونپل اس کے بیٹے کی صورت پھوٹی ہے۔ جس کے نزدیک روپیہ، ہر شخص کے مقام اور مرتبے کا تعین کرتا ہے اور رشتے ناتے، سٹیٹس کے مطابق جڑتے ہیں۔ حسب نسب، اعلیٰ اقدار اور ایمانداری کا زمانہ لد گیا۔ عائلی زندگی سے متعلق کتاب میں شامل دو افسانے ''سنگ گراں'' اور ''نجات'' بظاہر سادہ بیانیہ میں لکھے گئے افسانے ہیں لیکن ان میں بھی خاص طرح کی تہہ داری ہے ''سنگ گراں'' تو آخر میں جا کر استعارے میں ڈھل گیا۔

افسانہ ''سنگ گراں'' کی تعمیر نسوانی احساسات و محسوسات پر کی گئی ہے۔ افسانے کے کچھ مقامات تو خالصتاً نسوانی بیالوجی سے متعلق ہیں، جسے رقم کرنے سے ہماری جری اور بے باک خواتین افسانہ نگاروں نے بھی پہلو تہی کی جیسے افسانہ ''سودا'' از رشید جہاں (مشمولہ ''عورت اور دوسرے افسانے'' مطبوعہ ہاشمی بک ڈپو، لاہور طبع اول، نومبر ۱۹۳۷ء) میں بہت گنجائش تھی جنسی تحریص کے حوالے سے لکھنے کی لیکن رشید جہاں نے اندھیارے میں ہونے والے عمل پر جھجھلتی سی نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ گئیں۔ یہ سارا کچھ بیگ احساس کی صورت ایک مرد افسانہ نگار کیوں کر لکھ پایا؟ تفصیل میں جانے سے خوف فساد خلق لاحق ہے۔ اس لیے اسے مقدر چھوڑ تا ہوں۔

اس افسانے کا ایک ماضی ہے اور ایک حال۔ ماضی میں مذہبی کٹڑ پن براہ راست نسوانی فطرت سے الجھ رہا ہے ۔''ناخن رنگنے سے وضو نہیں ہوتا'' (مذہب اسلام کے تمام مسالک ماضی قریب کے اس اجتہاد پر متفق ہیں) یہ نانی کا بیان ہے۔ جب کہ فطرت نسوانی ناخن پالش کی طلب گار رہی۔ پھر عہد نو کے الگ بکھیڑے ہیں۔ ٹوٹ گیا، جوائنٹ فیملی سسٹم، روایات کا شیرازہ بکھر گیا۔ روایتی مذہبی گھرانے کی لڑکی گھر والوں کی مرضی کیا، ان کے علم میں لائے بغیر کورٹ میرج تو کر سکتی ہے لیکن آگے؟ لڑکا، لڑکی دونوں جاب کریں، تب بھی حالات ایسے نہیں بن پاتے کہ ایک چھت تلے اکٹھے رہ سکیں۔ بے شک کرائے کا مکان ہی کیوں نا ہو۔ بچہ نہیں لے سکتے، زچہ کی دیکھ بھال، ملازمت کو جاری رکھنا مشکل۔ Child farm میں رکھیں گے بچے کو؟ کیسے ہوگا سب؟ نوبیاہتے جوڑے میں یہ بحث کچھ دن چلتی ہے انجام کار ابارشن ہی ایک حل نکلتا ہے۔ ممتا بہت ہاتھ پاؤں مارتی ہے پر کنارا نہیں ملتا۔ ڈوبنا جیسے طے ہے۔

اس سادہ بیانیہ افسانے میں معنوی ابعاد اس وقت جھلکنے لگتے ہیں، جب MTP کے ذریعے بچہ اندھے کنویں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ ایسے میں ممتا کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتی ہے۔

''شاید وہ محفوظ ہے ۔ کوئی قافلہ ادھر سے گزرے گا تو اسے باہر نکالے گا۔ اس کی وجاہت نازک انگلیوں کو زخمی کرے گی.....یوں وہ بچہ ماضی بعید کے یوسفؑ کے استعارے میں ڈھل گیا۔ جس کی وجاہت کے سبب زلیخا ہی نہیں، اس کی سہیلیوں نے بھی بھرے دربار میں سیب کاٹتے ہوئے اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں۔ بے شک، اسے مجرم قرار دے کر کال کوٹھری میں دھکیل دیا گیا، لیکن ایک دن آئے گا جب وہ اس کال کوٹھری سے خوابوں کا شارح بن کر نکلے گا اور ماں کی رو رو کر بہہ جانے والی آنکھوں کی بینائی بحال کر دے گا۔''

یہ افسانہ تو تھا عہد جدید میں عائلی زندگی پر پڑنے والی افتاد سے متعلق، جب کہ دوسرا افسانہ ''نجات'' اس عارضے سے متعلق ہے جس نے ''نائن الیون'' کے بعد پر پرزے نکالے۔ مذہبی کٹڑ پن بڑھا اور مسلم ورلڈ ایک دوراہے پر آ کھڑی ہوئی۔

ایک مغربی ملک کی آزاد خیال سوسائٹی (جو کسی طور انڈر ورلڈ کے زیر نگیں علاقہ نہ تھا) میں ایک ذہنی طور پر تبدیل شدہ اجنبی (فرحان) نہ کھپ سکا لہٰذا اس کا وہاں رہنا اور روزی کمانا ناممکن ہو گیا۔ کیوں اور کیسے؟ اس سوال کو افسانہ میں اٹھا کر قاری کو اس کا جواب کھوجنے پر لگا دیا گیا ہے۔ کسی بات کو سمجھانے کا اس سے بہتر طریقہ کوئی نہیں۔

مذہبی جنونیت کے شکار، فرحان کی بیوی عاشی کا ہر نوع کی تہمت برداشت کرنا، اس ہندوستانی پتی ورتا بیوی کا ایک روپ ہے، جو ہر قیمت پر اپنا سہاگ بچانے کی فکر میں ہوتی ہے۔ لیکن عاشی کا کوئی جتن، مذہبی جنونیت کے مقابل بار آور نہ ہو سکا۔ جب طوفان تھم گیا تو عاشی نے یہ کہہ کر کہ ''میں تو ویسی ہی رہ گئی۔ پہلے نفرت اور دیوانگی کی وجہ سے دور رہتے تھے، اب شرمندگی اور احسان مندی کی وجہ سے دور رہتے ہیں۔ میں انھیں اس عذاب سے نجات دلانا چاہتی ہوں۔'' خود کو فرحان سے الگ کر لیا۔ یہ ایک ایسا ردّعمل ہے، جو زمانہ حال میں ہمارے ہاں اٹھنے والے کٹرپن کے طوفان کے آگے بند باندھنے کے مترادف ہے۔

افسانہ ''چکرویو'' کا منظر نامہ Time-frame کے اعتبار سے تین پہروں میں بٹا ہوا ہے، جس میں دھرت راشٹر اور سنجے کے مکالمے کی صورت ہر یگ سے قدیمی اتہاس کے مختلف بند رقم کر دیئے گئے ہیں۔ ہر یگ کے انت پر آنکھیں دیکھی اور کانوں سنی سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہوا کہ اس یگ کی شناخت ہٹ دھرمی، بے حیائی اور بے ضمیری ہے۔ پھر ہر یگ کے انت پر آپ ہی آپ اس جلی ہوئی مٹی سے ایک نئی زندگی جنم لیتی ہے اور نوزائندہ بچے کی مسکان، گہرا طنز بن جاتی ہے، انیائے کرنے والوں کی سوچ پر۔

بیگ احساس نے ویدوں سے مخصوص ملفوظاتی طریق میں کئی یگوں پر محیط انسانی حیات رقم کر دی ہے، لیکن Captions کے بغیر۔ اس میں ماضی بعید کی بربریت بھی موجود ہے، ماضی قریب کا جلتا ہوا احمد آباد بھی اور عہد حاضر کا میرانشاہ، میر علی اور دتہ خیل کا پاکستان سے متعلق علاقہ غیر بھی۔

افسانہ ''درد کے خیمے'' آزادی ۱۹۴۷ء کے بعد حیدرآباد (دکن) سے کراچی (پاکستان) براستہ کھوکھراپار، ہجرت سے متعلق ایک یک سطحی بیانیہ افسانہ ہی رہ جاتا، اگر اس میں بہن، بہنوئی اور ننھی بھانجی کی ہجرت کے تجربے میں پیچھے رہ جانے والوں کے ملال کو شامل نہ کر دیا جاتا۔ بیگ احساس نے اس افسانے میں ناسٹلجیا کی ایک نئی جہت یوں شامل کر دی کہ ہم ہجرت کریں یا ہمارا کوئی عزیز، گزرتے ایک ہی تجربے سے ہیں۔ پھر یہ کہ جیسا اوپر بیان ہوا، بیگ احساس کے افسانوں میں دھرتی سے جڑت اور تہذیبی اقدار کی شکست کا بیان اپنی جڑوں کی تلاش کا عمل بن جاتا ہے۔

اس افسانے کے مرکزی کردار کو اس مختصر سے مہاجر گھرانے کی طرف جھانکنے کا وقت تیس برس بعد میسر آیا، جب بہن نہ رہی۔ انسولین کے عادی بہنوئی اور بھانجی نے اسے ایئرپورٹ سے لیا۔ ایسے میں اس ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والی بہن کا آنسوؤں سے تر چہرہ، جو کبھی ہجرت کرتے وقت ٹرین کے ڈبے کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا، اس کی آنکھوں میں ٹھہر گیا۔

عمر رسیدہ بہنوئی اور اس کے بچوں کی سوچ کا فرق اس کے لیے حیران کن تھا۔ بچے پاکستان کے فرد ہونے پر اتراتے ہیں اور بہنوئی، اتنا وقت گزر جانے کے باوجود گمشدہ حیدرآباد میں ہی میں جی رہا ہے۔ صد افسوس! کہ تقسیم پر اتنا وقت گزر جانے کے باوجود ویزا کا حصول مشکل۔

اس کے بہنوئی نے فون پر بتایا کہ اسے ایرپورٹ چھوڑ کر وہ دوبارہ قبرستان گئے تھے لیکن، بہن کی قبر غائب ہے۔ تلاش کے باوجود کہیں نہیں ملی۔ تو کیا اپنے وطن جانے کی حسرت لیے مرجانے والی اس کی بہن کی مٹی اس کے ساتھ آ گئی؟

افسانہ ''شکستہ پر'' میں سمیر اور سشما جب پہلی بار ملے تھے تو ننھی سمن نے سشما کی انگلی تھام رکھی تھی اور سمیر نہیں جانتا تھا کہ سشما، طلاق یافتہ اور ایک بیٹی کی ماں ہو گی۔ پھر دس برس بعد ملے تو بہت کچھ کھو چکنے کے احساس کے ساتھ دونوں نے شادی کر لی۔ یوں ان کی محبت کا آغاز شادی کے بعد ہوا۔ سمن، اپنی ماں کے ساتھ جانے سے انکاری تھی، وہ اپنے نانا، نانی کے گھر ہی رہی۔

ابتدا میں بیٹی سے سشما کے کٹ جانے کا دکھ بظاہر دکھائی نہیں دیتا، دھیرے دھیرے سر اٹھاتا ہے۔ جب کہ سمن کے گھر آ جانے تک سمیر اس حقیقت سے لاعلم ہے پھر جیسا کہ فطری طور پر ہونا بھی چاہیے، سشما کی یہ آرزو تھی کہ سمیر، سمن کو بیٹی کے طور پر قبول کر لے لیکن اس کے بعد ماں، بیٹی ٹکرا گئیں۔ کبھی سمیر کی محبت سمیٹنے کے معاملے میں اور کبھی سمن کے حد درجہ بولڈ ہونے کے حوالے سے سمن کا اپنے نانا نانی کی جانب جھکاو بھی سشما کے لیے ناگوار خاطر رہا۔

سشما کا یہ رویہ بظاہر ابنارمل نفسیات سے مشابہ ہے، لیکن اس کا بھی ایک سبب ہے کہ سشما کی ماں نے اسے کم عمری میں بیاہ کر اس کا گھر بسنے نہیں دیا۔ جب شادی کی عمر کو پہنچی تو اسے سمیر بھا گیا لیکن اس کا طلاق یافتہ اور ایک بیٹی کی ماں ہونا دس برس کھا گیا۔ اب بیٹی کی اٹھتی جوانی اس کے مدمقابل تھی۔

بیگ احساس، اس نوع کی گتھیاں اپنے افسانوں میں سہج سہج کھولتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ گئے دنوں میں سشما، سمن ہی کی عمر میں ناسمجھی کی بنا پر اپنے شوہر کی بھابھی سے شکست کھا کر طلاق تک پہنچی تھی۔ شکست پر شکست وہ تلملا کر رہ گئی۔

اس نوع کے نفسی الجھاوؤں کو ضبط تحریر میں لاتے ہوئے، بیگ احساس، تہہ در تہہ اظہاریئے سے کام لیتے اور سوالات کے لامتناہی سلسلوں کو سہ رستوں اور چورستوں تک لے آتے ہیں۔ افسانہ نگار یہ کیوں بتائے کہ سمن کا گھر سے ناراض ہو کر نکل جانا کس کے حق میں بہتر رہا۔ پھر یہ سوال الگ کہ سمن اپنے نانا، نانی کی تنہائی میں کمی کا باعث بن کر ایک بار پھر سشما کو شکست سے دوچار تو نہیں کر گئی؟ اس کا جواب بھی کچھ اتنا سہل نہیں یہ سشما کے لیے باعث کرب بھی ہے اور باعث اطمینان بھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بھی رواں تھے اور چہرے پر اطمینان بھی تھا۔ پرندے ایک ایک کر کے پھر سے جاگ گئے تھے اور جال سمیت

اونچائی میں پرواز کرنے لگے تھے۔ بیگ احساس کا وہی من پسند طریق کار، جو سادہ بیانیے کو بھی معنوی سطح پر اٹھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

اب آیئے زبان و بیان کی طرف اس کے باوجود کہ بیشتر افسانوں میں تاریخ، سیاست، مذہب، معیشت اور معاشرت زیر بحث رہے پھر بھی خالصتاً علمی موضوعات سے مخصوص سپاٹ دو ٹوک زبان کہیں دیکھنے کو ملتی جو Information بہم پہنچانے کا لازمہ ہے۔ بیگ احساس نے کہیں کہیں بولی ٹھولی کی سطح پر حیدر آبادی انگ بھی برتا ہے اور سنسکرت اور ہندی بھی لیکن صرف مکالموں کی سطح پر۔ راوی کے بیانیہ میں نہیں۔ زبان و بیان سے متعلق یہ وہ شعور ہے، جس سے ہندوستان اور پاکستان میں لکھا جانے والا بیشتر حالیہ افسانہ خالی دکھائی دیتا ہے۔ نسبتاً پاکستان میں بلوچی، سرائیکی، پنجابی، پشتو اور ہندوستان میں بڑے شہروں کی Slang اور ہندی کے الفاظ کی پیوندکاری جاری ہے۔ جب اس خامی کی نشاندہی کرو تو جواب میں یہ سننا پڑتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ وسعت الفاظ کون لائے گا؟ حالانکہ افسانہ نگار کی زنبیل ان مقامی زبانوں کے الفاظ کی متبادل اردو لفظیات سے خالی ہوتی ہے۔ ''نور اللغات'' فرہنگ آصفیہ اور ''جامع اللغات'' کے انھوں نے نام تک نہیں سنے، کھول کر کیا دیکھیں گے۔

ایک مدت بعد مجھے ان افسانوں میں اتنی نتھری ستھری زبان پڑھنے کو ملی، جو نہ تو اردو کا لکھنوی رنگ ہے، نہ دہلوی لیکن کیا کہنے صاحب! اب وہ زمانہ لد گیا، جب راشد الخیری، اشرف صبوحی، صادق الخیری اور آمنہ نازلی نے اپنے افسانوں میں اردوئے معلیٰ کی خوشبو بسالی تھی۔ اب تو دلی میں بھی کرخنداری کا چلن ہے۔

انتظار حسین کی زبان و بیان پر صدقے واری جانے والے کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ انتظار حسین کی زبان و بیان کا تعلق دور دور تک دہلوی رنگ سے نہیں، میرٹھ اور بلند شہر کے دیہی علاقہ جات سے ہے۔ جس میں تذکیر و تانیث کی قطعیت پنجاب کی دین ہے۔ دہلی اور لکھنو کے مراکز سے دور بیٹھے بیگ احساس کا اس ضمن میں کوئی دعویٰ نہیں۔ وہ تو اسے محض گنگا جمنی تہذیب کی عطا شمار کرتے ہیں۔

ان افسانوں میں بیگ احساس کی حال مست اور پُر باش زندگی کی جھلکیاں بھی ہیں اور ان کی رسمی اعتقادات سے دوری بھی۔ اس کا ایک سبب ہے۔ ان کے اجداد اورنگ زیب عالمگیر کی افواج کے ساتھ دکن میں وارد ہوئے تھے۔ مغول ہوتے ہی ایسے ہیں۔ جب عمر شیخ مرزا کے بیٹے ظہیر الدین بابر نے فرغانہ سے نکل کر ہندوستان کا رخ کیا اس کے بازو بن کر ساتھ چلنے والے بھی مغول ہی تھے، جنھوں نے اپنے چغتہ سردار بابر کے ایک اشارے پر درہ خیبر اور اٹک بنارس کے ''کالا چٹا'' پہاڑی سلسلے میں قدم جما کر شب خون مارنے والے پٹھانوں کے سروں کے مینار بنائے اور عالمگیر لشکر کا پھریرا دکن پر لہرا کر وہیں بس گئے۔

بیگ احساس کی حیدر آباد (دکن) کی سرزمین اور اس کی قدیمی روایات سے جڑت درحقیقت اپنے اجداد کے قدیمی مسکن سے جڑت کا ثبوت ہے۔ قبرستانوں میں گڑی بوسیدہ ہڈیاں جوڑے رکھتی ہیں ماضی بعید کو لمحہ موجود سے۔

''پھُلاّں دی خوشبو''

اڈیک
گبھروُر کھّ دی
اک اتھری ٹہنی دے
میرے کچُّو رتے سنگھنے پتراں دی
گیتاں بھنّی
کھڑ کھڑ دے اندر
اپنے اُجڑے گھر دے ویہڑے وچ
ایدھر اُودھر
ہسدے۔۔۔
پھُلاّں دی خوشبو دے
ہُکیاں دے وچکار
سرگی ویلے دی
ٹھنڈی مِٹھی رُت دے اندر
اک پکھیرن
ان گولی ہو کے
انج بیٹھی سی
جیویں
ایہہ سارا سُکھ
ایہہ ساریاں رُتاں
ایہہ سارے ہاسے
اوہدے واسطے نہیں سن
اوہ تے بس
اپنے چیریں وچھّے سجناں دے
آون دی آس دا لڑ پھڑ کے
اک لمی اڈیک دے ہنجو اندر بیٹھی
اکھّاں دے وچ لے کے
دُور میرے ول
جھا کی جاوے
بس جھا کی جاوے

حنیف باوا
(جھنگ)

جنوں کا سودا

سرورالہدیٰ

(دہلی، بھارت)

دخمہ میں گیارہ افسانے شامل ہیں۔ اوران افسانو کی قرأت میں کوئی خارجی شئے حائل نہیں ہے۔ ابتدائیہ کے تحت مرزا حامد بیگ کا تفصیلی مضمون شامل ہے اور کتاب کی پشت پر گوپی چند نارنگ اور مجتبیٰ حسین کی آرا درج ہیں۔ اندرونی فلیپ پر مجاور حسین رضوی، مغنی تبسم، بلراج کومل، سلیمان اطہر جاوید اور نور الحسنین کی رائیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ابتدائیہ سے پہلے ایک نثری ٹکڑا ہے اور اگر خدا چاہے تو ادھورے قصے بھی پورے کر دیتا ہے۔

کتب کا سرِ ورق بیگ احساس کی تزئین کا نتیجہ ہے۔ سرورق سے افسانوی متن کی ترتیب و تنظیم پر اگر افسانہ نگار کا گہرا نقش ہے اور ہم ان کے درمیان کسی با معنی رشتے کی جستجو کر سکتے ہیں تو یہ بھی کسی کامیاب افسانہ نگار کی ضمانت ہے۔ اگر بیگ احساس دخمہ کا سرورق تیار نہ کیا ہوتا تو بھی دخمہ کا متن ہمارے لیے اہم ہوتا۔ افسانہ نگار کو قصے کے ادھورے پن کا بھی احساس ہے اور اسے اس بات کا یقین ہے کہ قصے کو مکمل کرنے والا وہ قصہ گو نہیں جو کسی افسانوی کتاب کا ہے بلکہ کوئی اور ہے کبھی کوئی اور کو ہم مختلف ناموں سے پکارتے اور جانتے ہیں۔ بیگ احساس نے غالب کے شعر سے بھی اپنا ایک تخلیقی رشتہ قایم کیا ہے۔ جنوں کا سودا کیوں کر صدف گوہر شکست بن جاتا ہے اس کی تفصیل میں جانے کا اس لیے موقع نہیں کہ اصل مسئلہ تو یہاں بیگ احساس کے افسانوں کا ہے۔ افسانہ دخمہ دوسرے افسانوں کے مقابلے میں زیادہ موضوع گفتگو بنا بلکہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دخمہ نے دوسرے افسانوں کو سنبھال رکھا ہے۔ مرزا حامد بیگ نے بھی اس افسانے پر بڑی توجہ صرف کی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بعض اوقات کوئی ایک افسانہ دوسرے افسانوں کے لیے مشکل پیدا کر دیتا ہے مگر آخری بات تو یہی کہی جاسکتی ہے کہ قاری پر نہ مصنف کا اختیار ہے اور نہ نقاد کا۔ بلکہ دخمہ کے افسانوی متن پر بیگ احساس کا بھی کوئی اختیار یوں نہیں رہا کہ قاری آزاد ہے اور وہ آزادانہ طور پر افسانوں سے مکالمہ قایم کرے گا۔ ایک بات جو توجہ طلب ہے وہ یہ کہ بیگ احساس نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا ہے۔ افسانوی متن کے ساتھ جو رائیں شامل ہیں میں انھیں افسانوں کی قرأت میں اس لیے حائل نہیں سمجھتا کہ بیگ احساس کی یہ کہانی ان آراء کے ساتھ چلتی بھی ہیں اور ان سے گریزاں بھی۔ کسی کی کوئی رائے قاری کو بہت دیر تک اپنی گرفت میں نہیں رکھ سکتی۔ مرزا حامد بیگ خود بھی ایک اچھے افسانہ نگار ہیں اور افسانوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ انھوں نے 60 کی دہائی کے افسانوں پر لکھتے ہوئے جہاں وہی انداز اختیار کی ہے جو عموماً پایا جاتا ہے یعنی جدیدیت کے پروردہ افسانہ نگاروں نے بیانیہ کو ختم کر دیا۔ کرداروں کے نام غائب ہو گئے۔ افسانہ غیر ضروری طور پر تجریدی اور علامتی ہو گیا۔ یہ تمام تفصیلات مرزا حامد بیگ نے اس لیے پیش کی ہیں تا کہ بیگ احساس کے افسانوں کے لیے جواز پیدا کیا جا سکے اور انھیں 60 کی دہائی کے افسانہ نگاروں سے مختلف پایا جائے۔ بے شک 60 کی دہائی کا افسانہ مین را، انور سجاد، سریندر پرکاش اور خالدہ اصغر کے افسانوں کی وجہ سے مختلف تجربات سے گزرا اور شمس الرحمٰن فاروقی کی یہ رائے متاثر کرتی ہے کہ ترقی پسند افسانوں کے بعد اگر افسانے کو نئی بلندیوں تک جانا تھا تو انہیں انہی تجربات سے گزرنا تھا۔ اسی صورت میں مین را کا افسانہ کرشن چندر کے افسانے سے مختلف ہو سکتا تھا۔ اگر بیگ احساس کے افسانے شب خون اور اوراق میں شائع نہیں ہوئے تو اس سے بیگ احساس کے افسانوں کی اہمیت کم یا زیادہ نہیں ہوتی۔ کیا یہ سچ نہیں کہ بیگ احساس کے افسانوں میں وہ سچائیاں بھی ہیں جنھیں جدیدیت نے ایک خاص اسلوب میں پیش کیا۔ ان سچائیوں کو زندگی کے اندھیرے اور مریضانہ رویئے کا نام دیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ بیگ احساس کے یہاں ان اندھیروں کے تعلق سے خود سپردگی نہیں ہے مگر اندھیرے تو اندھیرے ہیں۔ دخمہ کا پہلا ہی افسانہ ''سنگ گراں'' اس کی بہترین مثال ہے۔ خون کے رنگ سے ادبا اور شعرا نے تخلیقی سطح پر بہت کام لیا ہے۔ اختر الایمان نے

ع پان کی پیک ہے یہ اماں نے تھوکی ہوگی

کہہ کر پان اور خون کے رنگ کو جس نئے سیاق میں پیش کیا تھا وہ بظاہر کتنا عام سا تجربہ معلوم ہوتا ہے لیکن ''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'' کے بعد پان کی پیک ہے یہ اماں نے تھوک ہوگی'' کسی اور طرح سے ایک بڑی ٹریجڈی کو سامنے لاتا ہے۔ بیگ احساس نے ناخن کی پالش کے رنگ سے جو کام لیا ہے وہ ہماری تہذیبی زندگی کا ایک اشاریہ ہے تو دوسری طرف پیٹ میں پلنے والے بچے کے قتل سے کس طرح وہ ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ ایک رنگ جو ناخن کی پالش پر ہے اور دوسرا وہ رنگ ہے جو اس روح میں موجود تھا جسے دنیا میں آنا تھا لیکن وہ وقت سے پہلے زندگی کی عام ضرورتوں کے سیاق میں ختم کر دیا جاتا ہے۔ کہانی کا یہ حصہ بہت عام طریقے سے آگے بڑھتا ہے میاں بیوی کے درمیان گفتگو ہوتی ہے لیکن قاری کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ناخن کی پالش کا رنگ آگے چل کر کس طرح زندگی کی ایک تلخ حقیقت سے ہم آہنگ ہو جائے گا۔ یہ کہانی کوئی جنسی کہانی نہیں ہے اور نہ ہی ازدواجی زندگی کی بوجھ تلے دبے ہوئے کسی گھر کی تصویر کو روایتی طریقے سے سامنے لاتی ہے۔ بلکہ عام ضرورتیں پریشان کرتی ہیں لیکن بار بار ممتا اس کے سامنے آجاتی ہے اور وہ شوہر سے کہتی ہے کہ میں سب سنبھال لوں گی۔ اس مکالمے میں شام کا منظر بھی ہے اور وہ منظر زندگی کی اس تلخ حقیقت کے ساتھ کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ قاری منظر کشی کے شناسا اسلوب سے کچھ الگ اور مختلف دیکھنے لگتا ہے مثلاً:

''سورج غروب ہو رہا تھا۔ آسمان لال انگارہ ہو گیا تھا۔ اس کی سرخی کے سامنے درخت کی ٹہنیاں اور پتیاں سیاہ لگ رہی تھیں جیسے وہ سایہ ہوں۔ وہ پل سے آگے بڑھ گئے میری بات سنو دیکھو دنیا کتنی بدل گئی ہے۔ ایک سرکل پورا ہو رہا ہے۔ انسان ماقبل تہذیب جانوروں کی طرح رہتا تھا۔ ذاتی ملکیت کا کوئی تصور نہ

تھا''۔''پھر رفتہ رفتہ آواز دور ہوتی گئی آخری باراس نے وہ آواز سنی تو ایسا لگا جیسے کوئی گہرے کنویں سے پکار رہا ہو۔ پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ ہوش آیا تو دیکھا کمرے میں اس کے سوا کوئی نہیں ہے.....ڈریسنگ ٹیبل پر نیل پالش رکھی تھی اس نے نیل پالش کی شیشی اٹھائی ناخن رنگنے کے لیے دراز کھولا تو چکنائی بھرا مادہ باہر آیا۔ عجیب سی چپ چپاہٹ تھی اس نے برش ناخن پر رکھا تو لگا جیسے تازہ خون ہو۔ خون وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شاید اس کے بچے کو کنوئیں میں ڈھکیل دیا گیا۔ شاید وہ محفوظ ہے۔ کوئی قافلہ داھرے سے گزرے گا تو اسے باہر نکالے گا۔ اس کی وجاہت نازک انگلیوں کو زخمی کرے گی اور پھر وہ سات مقفل دروازوں کی پروا کیے بغیر بھاگے گا۔ دروازے خود بخود کھل جائیں گے لیکن قید خانے پر اس کی دوڑ ختم ہوگی۔ پھر وہ قید خانے سے معبّر بن کر نکلے گا۔ اس وقت وہ بینائی کھو چکی ہوگی۔ اس کا بیٹا اسے اندھیروں سے نکالے گا''۔

کہانی بظاہر ایک امید فردا پر ختم ہوجاتی ہے لیکن کیا واقعی یہ کوئی امید فردا ہے جس کے سہارے جیا جا سکتا ہے۔ یہ خود کلامی داخلی سطح پر ان اندھیروں کو جذب کیے ہوئے ہے بیگ احساس نے ایک خاص طریقے کار کے سبب ابھرنے کا کم کم موقع دیا ہے۔ کہیں کہیں دکھ چھلک پڑتا ہے، آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ لیکن بیگ احساس نے پوری کہانی کو کچھ اس طرح سنبھال رکھا ہے کہ قاری بہت مشکل سے یہ گنجائش پیدا کرے گا کہ اسے یوں ہونا چاہیے تھا اور اسے یوں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ اس کی گنجائش پیدا کرنا غیر فطری عمل ہوگا۔ یہ بھی دیکھیے کہ کہانی میں کرداروں کے نام نہیں ہیں۔ وہ، ہم، اس نے، ان الفاظ کے ذریعے کہانی تیار کی ہوئی ہے۔ نانی نے یہ بتایا تھا کہ ناخن کے رنگنے سے وضو اور نماز پر حرف آتا ہے اس طرح کہانی کو شروع کرنا یہ بتایا ہے کہ بیگ احساس نے کہانی کو گھر سے باہر تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی اور جہاں کہیں باہر کا گمان ہوتا ہے وہ بھی دراصل گھر ہی ہے، جو وقتی طور پر باہر جیسا ہے۔ یہ محض اتفاق تو نہیں کہ بیگ حساس کے یہاں ڈاکٹر، نرس، آپریشن، موت، نعش یہ تمام سچائیاں کچھ اسی طرح اپنی موجودگی کا احساس درج کراتی ہیں ہیں ان کی بنیاد دیر تک جدیدیوں کو برا بھلا کہا گیا تھا اور ایک کتاب Ilness as a Metapher بہت مقبول ہوئی۔ بیگ احساس کو تخلیقی سطح پر ان باتوں کا شعور ہے کہ زندگی ان اندھیروں کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتی اور ان کے بارے میں کوئی ایسا رویہ اختیار کرنا جن سے تخلیقیت متاثر ہو مناسب نہیں ہے۔ اسی لیے افسانہ ''کھائی'' میں شوکت میاں کی نعش اور کایت علی کا قرآن کی تلاوت کرنا اور شوکت میاں کی لاش کے آس پاس برف کی سلیوں کا ہونا اور برف کا پگھلنا جو منظر پیش کرتا ہے وہ کسی بھی قاری کے لیے حیران کن تو نہیں لیکن بہت خوش گوار بھی نہیں ہے اور میں یہ بات اس لیے لکھ رہا ہوں تا کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ افسانہ 70 کے بعد بالکل تبدیل ہوگیا انھیں ذرا تخلیقی متن کے ساتھ سفر کرنا چاہیے۔ یہ ضرور ہے کہ بیگ احساس ان اندھیروں کی پیش کش کے درمیان کچھ ایسی حقیقت کی جستجو کرتے ہیں جو ذرا دیر سے حیرت میں ڈالتے ہیں مثلاً یہی ''قرآن کی تلاوت کرتے کرتے کفایت علی نے اپنے باپ کی نعش کے طرف دیکھا وہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ اسے اپنے باپ کے مرنے کا افسوس ہے بھی یا نہیں...... برف کی بوندیں فرش پر ٹپکتی رہیں۔ فرش پر اچھا خاصا پانی جمع ہو کر بہنے لگا تھا۔ کیا مزید برف کی ضرورت پڑے گی؟ کسی نے کفایت علی سے پوچھا۔ نہیں یہی کافی ہو جائے گی۔ پہلی بار کفایت علی کو اپنے لہجے میں خود اعتمادی اور قطعیت کا احساس ہوا۔ اس میں تعجب کی بات بھی کیا ہے شوکت میاں کے بعد اب خاندان کا سربراہ وہی ہے''۔

ایک کہانی ''درد کے خیمے'' ہے۔ جس میں ہجرت کا کرب ہے لیکن کہیں بھی ہجرت کا یہ کرب فیشن کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیگ احساس نے اس کرب کو زندگی کے جس گہری سطح تک جا کر محسوس کیا ہے اور رشتوں کو جس احساس کی سطح پر دیکھا ہے وہ ایک بڑی سچائی ہے اسی لیے اس موضوع پر اتنا کچھ لکھے جانے کے باوجود بیگ احساس کی اس کہانی میں ایک تازگی پائی جاتی ہے۔ کہانی ان جملوں پر ختم ہوتی ہے۔ خوب صورت شہروں کی اونچی عمارتوں نے احساس دلایا کہ میں اپنی زمین پر واپس آ گیا ہوں۔ بہنوئی نے فون اٹھایا میں نے پہنچنے کی اطلاع دی۔ انھوں نے بھرائی آواز میں کہا ایئرپورٹ سے واپسی پر ہم پھر قبرستان گئے دل بھر آیا تھا تمہاری بہن کی قبر سے لپٹ کر رونا چاہتا تھا لیکن سنو تم سن رہے ہونا۔ تمہاری بہن کی قبر کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ ہم نے قبرستان کا چپہ چپہ چھان مارا تمہاری بہن کی قبر کہیں دکھائی نہیں دی۔ میں سناٹے میں آ گیا کہ کیا میرے ساتھ میری بہن کی مٹی بھی آ گئی۔ اب کہانی کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں لیکن میں یہ پھر عرض کروں کہ اس طرح کہانی کو اخیر تک لے آنا اور اس سطح پر ختم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بیگ احساس کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ زندگی کے یہ حقائق جن میں مٹی بھی ہے اور قبر بھی اور قربت اور فاصلہ بھی بڑھتی ہوئی عمر بھی اور ان سب کے درمیان نئی نسل کی اپنی ترجیحات بھی اگر انھیں مجموعی طور پر دیکھا نہیں گیا تو افسانے کا وہی حشر ہوگا جو بیگ احساس کے کئی معاصر افسانہ نگاروں کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مجھے ایک اور افسانہ ''سانسوں کے درمیان'' کا ذکر بھی کرنا ہے جس کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ سانس صرف کہانی کے اندر ہے۔ بلکہ انسانی زندگی کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہی وہ ہنر ہے جسے بیگ احساس نے بغیر کسی شور شرابے کے اختیار کیا ہے اور بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے کہانی کے بنت کو تیار کیا ہے۔ یہ ایک ایسا اسلوب ہے جس کی مثالیں خسرو کے یہاں بھی مل جائیں گی، مگر ایک قاری کی حیثیت سے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ بیگ احساس کے افسانے اپنے دائمی اور عصری حسن کی وجہ سے توجہ طلب ہیں۔ جو دائمی ہیں اس میں زندگی کے نہ ختم ہونے والے مسائل ہیں اور جو عصری ہے اس میں واقعتاً عصری مسائل ہیں۔ لیکن انھیں کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ نئے اور پرانے کا احترام بھی باقی رہتا ہے اور ان میں وحدت بھی قایم ہوتی جاتی ہے، اور ٹوٹتی بھی ہے۔ ایک بات اور مجھے یہ کہنی ہے کہ بیگ احساس نے وحدت تاثر کو پارہ پارہ کرنے کی غیر ضروری کوشش نہیں کی ہے۔

افسانوں کا افسانوی رمز

رضوانہ پروین
(پٹنہ، بھارت)

اردو فکشن میں حیدر آباد کے جن فکشن نگاروں نے اپنے فن کا لوہا منوایا ہے ان میں جیلانی بانو، اقبال متین، اقبال مجید اور مظہر الزماں کے بعد سب کی زباں پر جو نام ہے وہ ہے بیگ احساس۔ جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک کا سفر طے کرنے والا یہ عظیم فکشن نگار عصری تقاضوں سے نہ صرف اچھی طرح واقف ہے، بلکہ انسانی نفسیات کا نبّاض اور بدلتے ہوئے انسانی رویّوں کا پارکھ بھی ہے۔ بیگ احساس کا افسانوی کائنات بہت وسیع نہیں ہے لیکن کمال یہ ہے کہ ان کا ہر دوسرا افسانہ پہلے افسانوں سے منفرد ہوتا ہے۔ یہ انفرادیت موضوعاتی بھی ہوتی ہے اور تکنیکی بھی۔ یہی موضوعاتی اور تکنیکی انفراد بیگ احساس کی انفرادی شناخت کا ضامن ہے۔ بیگ احساس نے افسانہ نگاری کی ابتداء ۱۹۷۱ء میں کی اور ان کا پہلا افسانہ 'سراب' کے عنوان سے ماہنامہ 'بانو'، دہلی میں شائع ہوا۔ اب تک موصوف کے تین افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے اور قارئین سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ 'خوشۂ گندم' (۱۹۷۹ء) اور دوسرا مجموعہ 'حنظل' (۱۹۹۳ء) اور تیسرا مجموعہ 'دخمہ' (۲۰۱۵ء) میں عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی سے طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔

'دخمہ' گیارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل افسانوں کے نام بلترتیب یوں ہیں: سنگ گراں، کھائی، چکرویو، درد کے خیمے، سانسوں کے درمیاں، نجات، دھار، شکستہ پر، دخمہ، نمی دانم کہ اور 'رنگ کا سایہ' ہیں۔ مذکورہ بالا تمام افسانے موضوع اور تکنیک دونوں اعتبار سے ندرت کے حامل ہیں۔ یوں تو بیگ احساس کے تمام افسانے ایک نئے رنگ اور جدا انداز کے حامل ہوتے ہی ہیں اس پر تمغہ یہ کہ ان کے افسانوں کے عنوانات اکثر مختصر اور پر معنٰی ہوتے ہیں۔ چونکہ افسانے کے عنوان کو سمجھتے ہی افسانے کی فضا سے قاری کو ذہنی جڑاؤ پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً 'دخمہ' یہ عام فہم لفظ نہیں ہے۔ اس کے مفہوم تک رسائی عام قاری کو لغت کے بغیر دشوار ہے۔ لیکن جوں ہی اس کے معنٰی تک رسائی ہو جاتی ہے افسانے کا پس منظر کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ بہر کیف 'دخمہ' چونکہ مجموعے کا عنوان بھی ہے اس لئے اس لفظ کے معنٰی کی جانب اشارہ (مجھ جیسے عام قاری کے لئے) ضروری معلوم پڑتا ہے۔ 'دخمہ' پارسیوں کے قبرستان/نعش کے رکھنے کی خاص جگہ کا نام ہے۔ چونکہ اس افسانے کے مرکز میں پارسی برادری ہے۔ پارسیوں کے یہاں نعش کو دفن کرنے یا جلانے کے بجائے دخمہ کی چھت پر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ گدھ اسے کھالیں۔ چونکہ گدھوں کا نعش کو کھا کر پیٹ بھرنا پارسیوں کے مذہبی عقیدے کے مطابق نیک عمل تصوّر کیا جاتا ہے۔ بہر حال دخمہ کے گرد و نواح کے بیان سے ہی اس افسانے کی ابتدا ہوتی ہے۔ افسانہ نگار نے قصّے کے تانے بانے میں دخمہ کو استعاراتی رنگ دے کر پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں بیگ احساس نے 'دخمہ' MAI KADA EAST;1964 کو تہذیب کے باقیات کی صورت میں پیش کرمٹتی ہوئی تہذیب کی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔ اس افسانے میں بیک وقت کئی لہریں موجزن ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل تینوں عہد کی جھلکیاں اس افسانے میں موجود ہیں، اس طرح تاریخ کی وہ حقیقی تصویریں بھی پیش کی گئی ہیں جس کے بغیر اس کا مستقبل بھی اندھیرے میں گم ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں افسانہ 'دخمہ' کے متن سے چند سطور پیش ہیں:

''جس شہر کی تاریخ نہیں ہوتی اس کی تہذیب بھی نہیں ہوتی۔''

''ولی عہد نے مغربی ملک کو اپنا مسکن بنالیا۔''

''نئی تہذیب، نیا رجحان، منتقلی (بیرون و صوبائی)۔۔۔''

''۔۔۔باہر بس جانے والے ایک تو ناسٹالجک ہو جاتے ہیں دوسرے چیارٹی (چیریٹی) کرنے کے لئے اتاولے ہوتے ہیں۔''

درج بالا مختصر اقتباسات افسانہ 'دخمہ' سے ماخوذ ہیں۔ ان میں بلترتیب تاریخی اہمیت و حیثیت، بیرونی و صوبائی ہجرت، منتقلی کے تحت بدلتے ہوئے تہذیبی اقدار کو جس فنّی حسن کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ بیگ احساس نے اس افسانے میں ماضی اور حال میں رونما ہونے والے تحریک و رجحانات (سیاسی و سماجی) کو بھی افسانے میں تمثیلی و علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ 'دخمہ' موضوعاتی اعتبار سے نادر تو ہے ہی فنّی اعتبار سے بے حد کامیاب بھی ہے۔ اشارے کنائے کا سہارا لے کر ملکی و بیرون ملکی سیاسی رجحانات تک کی بات افسانے کے متن میں پیش کر دینا کسی معمولی ذہن کا کام نہیں۔ ایسا کام کوئی جینیوئن فنکار ہی کر سکتا ہے، بلاشبہ بیگ احساس اسی قبیل کے فکشن نگار ہیں۔ اور ان کا افسانہ ''دخمہ'' عہد حاضر کے نمائندہ افسانوں کی پہلی صف میں رکھے جانے کے قابل ہے۔

'دخمہ' میں شامل پہلا افسانہ 'سنگِ گراں' ہے۔ اس کے دو مرکزی کردار موئنث و مذّکر آپس میں محبت کرتے ہیں اور شادی کر لیتے ہیں۔ لڑکے کے پاس اپنا ذاتی مکان نہ ہونے کے سبب وہ شادی کے بعد اپنی شریکِ حیات کو ساتھ نہیں رکھ کر پاتا۔ جب اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی امید سے ہے، تو یہ خبر سننے کے بعد وہ خوش ہونے کے بجائے کچھ پریشان ہو جاتا ہے اور اسقاط حمل کے لئے اپنی بیوی کو سمجھاتا ہے، حالات کا حوالہ دیتا ہے۔ عورت کی فطرت میں ماں بننا اور ماں بننے کے مراحل سے گزرنا ایک عظیم جزبہ کے مترادف ہے۔ لہٰذا اسقاط حمل کا فیصلہ کسی بھی عورت کے لئے اتنا آسان نہیں ہوتا۔ یہی صورت حال اس افسانے کی عورت کے ساتھ بھی پیش آتی ہیں۔ وہ ماں بننا چاہتی ہے۔ ماں بننے کے فطری احساس سے سرشار ہوتی ہے۔ لیکن اپنے شوہر کی مجبوریوں اور حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے ضمیر پر ایک بھاری پتھر رکھ کر ہسپتال چلی جاتی ہے، تنہا......اور تنہا خالی ہاتھ واپس گھر لوٹتی ہے۔ سب کچھ کھو کر اپنے وجود سے ایک آنے والی زندگی کو علحدہ کر کے۔ اس افسانے میں عورت کی نفسیات کا بڑی باریکی سے تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ دراصل اس افسانے کا کے ذریعہ صارفیت کے اس دور میں تمام تر

سہولیات کی حصولیابی کے لئے فرد کے اس فطری عمل کو نظر انداز کر دینا جو سب سے زیادہ اہم ہے، کی جانب ایک واضح اشارہ کیا گیا ہے۔ جو انسانی وقا کا عین مقصد ہے۔ آج کا انسان فطری زندگی گزارنے کے بجائے اچھی زندگی کا خواب لئے آسائشوں کے اشیاء کی فراہمی میں اس قدر مصروف ہے کہ اس کی وقا اور شناخت کا ذریعہ ہی ختم ہوجاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ متوسط درجے کا انسان زندگی کے فطری عوامل سے خود کو محروم کر تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا ہے۔

افسانہ 'کھائی' میں تین نسل کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔ اصل میں یہ افسانہ امیری اور غریبی کے مابین بنی اس کھائی کو پیش کرتا ہے جس میں انسانی ذہن کا بہت دخل ہے۔ اس افسانے کا ایک اہم کردار شوکت میاں ہے جو جاگیردارانہ ذہنیت رکھتا ہے۔ وہ سب کچھ ختم ہونے کے بعد بھی خود کو زمیندار ہی تصوّر کرتا ہے۔ دوسروں سے بھی یہی توقع کرتا ہے۔ نتیجتاً اسے وہ ساری سہولیات فراہم کرائی جاتی ہیں جس کا وہ عادی تھا۔ اس افسانے کے کرداروں کے نام علامتی معلوم ہوتے ہیں۔ شوکت میاں جاگیرداری کے زوال اور اس کے خاتمے کے بعد بھی شان وشوکت سے رہتا ہے۔ اس کا بیٹا کفایت علی جو حالات کے تحت کفایت شعاری سے زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اس کی آمدنی بہت قلیل ہے لہٰذا وہ چادر کی مناسبت سے ہی پیر پھیلانے کا عادی ہے۔ جسے اس کا باپ بالکل پسند نہیں کرتا۔ کفایت علی اپنے والد شوکت میاں کے برعکس ہے۔ لیکن وہ فرمابردار ہے۔ خود روکھا پھیکا کھا کر پھٹے پرانے میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے لیکن اپنے والد شوکت میاں کی گالی گلوچ سے بچنے کے لئے ان کے لئے مرغن غذا کا انتظام کرتا ہے۔ تیسرا کردار ہے شہزادہ یہ بھی ایک علامتی کردار ہے۔ جاگیرداری کے خاتمے کے بعد پیدا ہوا شہزادہ خود کو کسی شہزادے سے کم نہیں سمجھتا۔ وہ اسکولی تعلیم کسی طرح حاصل کر عرب ممالک چلا جاتا ہے جہاں سے وہ خوب پیسے کمالاتا ہے۔ اور ایک اعلیٰ خاندان میں بڑی دھوم دھام سے اپنی شادی کرتا ہے۔ اس کے نام کی مناسبت سے اس کا مزاج بھی شاہانہ ہے۔ وہ اپنے دادا شوکت میاں کو بہت عزیز رکھتا ہے۔ لہٰذا جب شوکت میاں کا انتقال ہوتا ہے تو وہ ان کی نعش کو شہر کے سب سے مہنگے قبرستان میں دفن کراتا ہے۔ کفایت چونکہ شوکت میاں کے وارث تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی تدفین کے واسطے محلّے کی قبرستان میں قبر کھودنے کو مزدور کو کہہ دیا۔ لیکن جب شہزادہ والد سے مشورہ کئے بغیر دادا کی نعش کو شہر کے مہنگے قبرستان میں تدفین کراتا تو محلے کے قبرستان میں کھودی گئی قبر یوں بے کار ہو جاتی ہے۔ اور جب اس کی مزدوری لینے مزدور گھر آتا ہے تو کفایت صرف قبر کی کھدائی کی رقم دے کر روانہ کرنا چاہتا ہے لیکن مزدور پورے پیسے لینے پر مصر ہے۔ اس ہنگامے کو سن کر شہزادہ باہر آتا ہے اور مزدور کو پورے پیسے دینا چاہتا ہے۔ اس پر کفایت کہہ اٹھتا ہے کہ یہ قبر ہمارے کس کام کی۔ شہزادہ اپنے باپ پر جھنجھلاتا ہے کہتا ہے کہ یہ اب آپ کے کام آئے گی! یہ بات سن کر کفایت علی کا سر چکرا جاتا ہے اور وہ صحن میں رکھی برف کی سل پر گر کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ تفریق نئی نسل کی سوچ وفکر کی بھی ہے۔ جو دوسروں کے سامنے اپنی جھوٹی شان اور عظمت کا ڈھونگ رچتے ہیں اور اپنے سگوں سے خلوص نہیں رکھتے۔ جس کے سبب خون کے رشتوں میں وہ گرمی اور حرارت محسوس نہیں ہوتی۔ خون کے رشتوں کا اس قدر سرد ہو جانا المیہ ہے۔

دراصل یہ افسانہ تین نسلوں کے مابین نسلی اور ذہنی اختلافات کو پیش کرتا ہے۔ شوکت علی، کفایت علی اور شہزادہ۔ یہ تینوں کردار اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ شوکت میاں جاگیرداری کے خاتمے پر بھی جاگیردارانہ ٹھسّ کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ کفایت درمیانی عہد میں محنت ومشقت کرتا ہوا کفایت شعاری کے ساتھ زندگی کی تمام ترذمہ داریوں کو انجام دیتا ہے۔ وہ ایک فرمابردار بیٹا بن کر والد کے تمام اخراجات اٹھاتا ہے۔ تو وہیں شہزادہ شاہانہ رکھ رکھاؤ اور تصنّع کا دلدادہ ہے۔ اس طرح اس افسانے میں تین نسل کے نظریاتی تفریق کو تمثیلی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ عہد جاگیرداری میں اخلاق ومروّت کی پاسداری بھی ہوا کرتی تھی۔ لیکن نئی نسل پیسے تو خوب کما رہی ہے، لیکن ان کے دلوں سے مروّت اور اخلاقی قدریں بالکل ختم ہوگئی ہیں جو کہ نئے دور کا المیہ ہے۔ اس افسانے کا اختتام فکر یہ ہے، اور حیرت انگیز بھی کیونکہ کفایت علی جو تا زندگی محنت ومشقت کرنے کے باوجود ایک اچھی زندگی نہ جی سکا۔ تو دوسری جانب شوکت میاں اور ان کا پوتا شہزادہ کئی برائیوں کے باوجود ایک خوشحال زندگی گزارتے ہیں۔ یہ ایک سوال ہے۔ ہمارے معاشرے میں اکثر وبیشتر دیکھنے میں آتا ہے کہ شریف اور نیک انسان کو کئی قسم کی ذلّت برداشت کرنی پڑتی ہے جبکہ رعب دبدبے والے انسان کو لوگ ان کے عیوب سے واقف ہونے کے باوجود ان کی جی حضوری کرتے نظر آتے ہیں۔

اس مجموعے میں دو افسانے 'دھارا' اور 'چکرویو' فرقہ واریت کے موضوع پر مبنی ہیں۔ افسانہ 'چکرویو' دھرت راسٹر اور سنجے کی مکالماتی فضا میں پروان چڑھتا ہے۔ علامتی انداز میں کی گئی گفتگو افسانے کی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ افسانہ نگار نے تمثیل کا سہارا لے کر گجرات فسادات کی اتنی واضح تصویر کشی کی ہے جسے پہلی قرت میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ کانگریس کے سابق ایم پی احسان جعفری کے مکان کا حصار، لوٹ پاٹ، ان کی بے بسی اور پھر دردناک موت کو افسانہ نگار نے بڑے ہی ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے سیاسی رویّوں، اکثریت کا اقلیتوں (مسلمانوں) پر ظلم واستبداد کا کھلا اظہار جس طرح گجرات میں ہوا اس کی لفظی تصویریں اس افسانے میں پیش کی گئی ہیں۔

افسانہ 'سانسوں کے درمیاں' انسانی رشتوں کی پامالی اور تصنّع پر مبنی ہے۔ یہ انسانی جزبات کی ابھرتی ڈوبتی کہانی ہے۔ سانس پہ آس اور آس پر سانسوں کا دارومدار ہوتا ہے۔ سانس کے رکتے ہی سارے رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سانسوں سے مراد پیسوں کے ہیں، کہ جب پیسے انسان کے پاس نہیں ہوتے تو تمام رشتے ناطے سب پرائے لگنے لگتے ہیں۔ سانسوں کا زندگی کے ساتھ جو ناطہ ہوتا ہے، وہی ناطہ پیسوں کا اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں اس حقیقت سے باور کرایا ہے کہ جب انسان کے پاس پیسے ہوتے ہیں تو تمام رشتے ناطے والے کس قدر قریب معلوم ہوتے ہیں۔ پیسوں کے ختم ہوتے ہی سبھی اپنا دامن بچا

کر پرے ہٹ جاتے ہیں۔جس طرح افسانے میں مریض کی عیادت کے بہانے فائیو اسٹار ہوٹلوں جیسے ہاسپٹل میں رشتے داروں کی دعوتیں ہوا کرتی تھیں،اور جوں ہی پیسے ختم ہونے لگے عیادت تو دور لوگ اپنی مصروفیت کا بہانہ بنا کر خیریت بھی معلوم کرنے سے کترانے کرنے لگے کہ کہیں پیسوں کی مانگ نہ ہو جائے۔غرض یہ کہ انسان کی جسم میں جب تک سانسیں چلتی رہتی ہیں تمام رشتے ناطے داروں سے جڑاؤ بنا رہتا ہے۔جیسے ہی سانس رکی روح فنا ہوئی،اس نعش کو جلد از جلد دفن کر لوگ فارغ ہونا چاہتے ہیں۔بس یہی کیفیت ہے سانس اور پیسوں کے پاس رہنے کی۔سانس باقی ہو اور پیسے پاس ہوں تو ساری دنیا اپنی اور نہ ہو تو سبھی ناطے ختم۔زندگی کی اس تلخ حقیقت کو بیگ احساس نے کنائے کا سہارا لے کر بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

افسانہ 'نجات' ایک نفسیاتی کہانی ہے۔اس کا مرکزی کردار فرحان ہے، جو گلف میں نوکری کرتا ہے۔شادی کے بعد اچانک وہ نوکری چھوڑ واپس چلا آتا ہے۔وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس ملک میں کچھ انڈر ورلڈ کے لوگ اسے سکون سے رہنے نہیں دیتے۔جس کی پاداش میں فرحان کو ملک لوٹنا پڑتا ہے۔دراصل اس فسانے کے ذریعہ افسانہ نگار نے اس اذیت کو بے نقاب کیا ہے جو گلف ممالک سے واپس آئے ہوئے لوگوں کا اپنے ملک میں سیٹ نہ کر پانے کے سبب ہوتا ہے۔وہاں اچھی سیلری،تمام سہولیات کے عادی ہو چکے افراد کم پیسوں اور معمولی سہولیات میں کام کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوتے اور نتیجتاً ان کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ نتیجے میں ایسے افراد اپنے ساتھ ساتھ اپنے خاندان کے دوسرے افراد کو بھی ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

'دھار' بھی ایک نفسیاتی افسانہ ہے۔جیسا کہ قبل ذکر آچکا ہے کہ افسانہ 'دھار' اور 'چکرویو' دونوں سیاسی نوعیت کے افسانے ہیں۔'دھار' میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کو جس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اس کو تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

'شکستہ پر' یہ افسانہ عورت کی نفسیات اور رشتوں کی نزاکت پر مبنی ہے۔ایک ہی رشتہ کہیں قابلِ احترام تو کہیں قابلِ رشک اور بعض اوقات مشکوک بھی ہو جاتا ہے۔افسانے کا مرکزی کردار سشما ہے۔سشما ایک شادی شدہ عورت ہے اس کی شادی بہت ہی کم عمر میں اس کی مرضی اور پسند کے خلاف جبراً کرا دی جاتی ہے۔یہی سبب ہے کہ اس کا بہت جلد طلاق بھی ہو جاتا ہے۔جب سشما اپنے عاشق سمیر سے دس بارہ سال بعد ملتی ہے تو دونوں شادی کر لیتے ہیں۔سشما کو پہلے شوہر سے ایک گیارہ سال کی لڑکی ہے سمن۔جب سشما سمیر سے شادی کر لیتی ہے تو اس کے والدین سمن کو سشما کے پاس رہنے کو چھوڑ آتے ہیں۔شروع میں سمن گم صم رہا کرتی تھی لیکن تھوڑے دنوں میں ہی سمیر (سوتیلے باپ) سے بے تکلف ہونے لگتی ہے۔کہانی میں ایک نفسیاتی موڑ تب آتا ہے جب سمن خود کو اپنی ماں سے موازنہ کرنے لگتی ہے۔بات بات میں اس کے کاموں میں نقص نکالنا،اس کے پسندیدہ لباس کو پہن لینا،جسمانی ساخت میں موازنہ کرنا،سمیر سے باپ کے بجائے دوستوں سا سلوک کرنا اور سشما کے کاموں میں ہاتھ نہ بٹانا وغیرہ وغیرہ۔اس کے ان رویّوں سے سشما پریشان رہنے لگتی ہے اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ تھک رہی ہے اب وہ سمیر کا ساتھ نہیں دے پا رہی اور اس کی جگہ.....؟؟؟؟.ایک دن جب غصّے میں سمن کہیں چلی جاتی ہے تو سشما مطمئن انداز میں سمیر کو کہتی ہے:

''ایک آدھ دن میں خود ہی پتہ چل جائے گا۔ہم ڈھونڈھیں گے نہیں۔''

افسانہ 'نمی دانم' میں خانقاہ کی زندگی اور وہاں شب و روز رونما ہونے والے واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔یہ افسانہ دراصل اندھی عقیدت اور اوہام پرستی پر مبنی ہے۔افسانہ 'رنگ کا سایہ' علاقائی فرقا باریت پر مبنی ہے۔اس افسانے میں ریاستِ حیدر آباد میں مسلمانوں کے اقتدار کے خاتمے کے بعد جو صورتِ حال پیدا ہوئیں اس کا خامیازہ عام اور متوسط طبقے کے مسلمانوں کو اٹھانا پڑا۔حیدر آباد کے مسلمانوں پر پولیس نے جس طرح ظلم کئے اس کی بھی تصویریں اس افسانے میں موجود ہیں۔پولیس کے خوف سے متوسط طبقے کے مسلم نوجوان در بدر ہو گئے،تعلیم حاصل نہ کر سکے۔جس کے سبب سرکاری مراعات تو دور ان کو ان کے گھر سے بے دخل تک کر دیا گیا۔اس حقیقت کو افسانہ نگار نے بڑے ہی حسن فن کے ساتھ افسانے کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔

افسانہ نگاری کا فن چاول پر قل ھو اللہ لکھنے کے مترادف ہے۔اس میں وہی فنکار کامیاب ہو سکتا ہے جسے معاشرے کے نبض کا اندازہ ہو۔تا کہ وہ اس نبض کی سرسراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو بیان کر سکے۔اس معاملے میں بیگ احساس بڑے ہی چابک دست اور ماہر نبّاض فکشن نگار ثابت ہوئے ہیں۔بیگ احساس کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم مسئلے چاہے وہ سیاسی ہوں یا مذہبی یا کہ معاشرتی اشارے کنائے کا سہارا لے کر اس خوبصورتی سے پیش کر جاتے ہیں کہ بات بھی کہہ دی گئی اور بات بگڑی بھی نہیں۔

بیگ احساس کے افسانے موضوعاتی اور تکنیکی دونوں سطح پر نہ صرف ندرت کے حامل ہیں بلکہ کامیاب بھی ہیں۔ان کی زبان دکنی آمیز ضرور ہے،لیکن دکنیت حاوی معلوم نہیں ہوتی۔وہ نہایت سلیس و رواں دواں زبان استعمال کرتے ہیں۔یوں تو ان کے زیادہ تر افسانے ریاست حیدر آباد کو مرکز میں رکھ کر ہی لکھے گئے ہیں مثلاً وہاں کی تہذیب و ثقافت،مسلم متوسط طبقے کی زندگی کے ساتھ ساتھ حیدر آباد کے جاگیرداری کی الٹی ہوئی بساط اور اس کے وجوہات وغیرہ کی عکاسی ان کے افسانوں میں موجود ہیں۔

بیگ احساس کو کردار نگاری پر عبور حاصل ہے۔ان کے پیش کردہ کردار افسانوی یا داستانوی نوعیت کے نہیں ہوتے بلکہ حقیقی دنیا سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔جو نہ بالکل فرشتے ہیں اور نہ ہی شیطان کی برادری کے بلکہ عام انسانوں کی طرح جیتے جاگتے گوشت پوشت کے ہوتے ہیں جن میں زندگی کی حرارت اور شرارت سبھی موجود ہیں۔دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے پیش کردہ کردار معتدل ہوتے ہیں ان میں لچک اور زندگی کی رمق موجزن ہوتی ہیں۔بیگ احساس اس طرح کے کرداروں کو خلق کر اپنے مافی الضمیر کو پیش

باقی صفحہ ۴۶ پر ملاحظہ کیجیے

نئے افسانے کی بیانیات

ڈاکٹر مولا بخش
(دہلی، بھارت)

بیگ احساس نے ۱۹۷۱ء میں اپنی پہلی کہانی لکھی تھی۔ یہی وہ عہد تھا جب جدیدیت زدہ نقاد جدیدیت سے متاثر متن کو سراہتے تھے اور ترقی پسند نقاد یہ ثابت کر رہے تھے کہ جدیدیت کوئی چیز نہیں ہے۔ گویا بیگ احساس نے اس دور میں لکھنا شروع کیا جب ذاتی علامتوں، گونگے استعاروں سے مسخ شدہ نثر میں افسانے لکھے گئے۔ افسانوں کا ریل پیل تھا جس میں کہانی پن کو غیر ضروری فرض کر لیا گیا تھا۔ اسی طرح کے افسانوں کے خاتمے کے دہانے پر ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''خوشۂ گندم'' (۱۹۷۹ء) شائع ہوا تھا۔ اس کے ٹھیک چودہ سال بعد دسمبر ۱۹۹۳ء میں ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''حنظل'' شائع ہوا جس میں صرف ۱۴ افسانے بہ عنوان ''پناہ گاہ کی تلاش''، ''میوزیکل چیئر''، ''کرفیو''، ''اجنبی اجنبی''، ''ملبہ''، ''سوا نیزے پہ سورج''، ''بے سورج''، ''آسماں''، ''نیا شہسوار''، ''خس آتش سوار''، ''حنظل''، ''برزخ'' اور ''آسماں بھی تماشائی'' ہیں۔ اس مضمون میں مجموعی اعتبار سے بیگ احساس کے فنی نکات پر روشنی ڈالی جائے گی اور چند افسانوں کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

بیگ احساس کا افسانوی متن کسی باہری سردی گرمی، ہنگامی موضوعات اور تقاضے سے متاثر ردِعمل والی تحریر بہر صورت نہیں ہے۔ ان کے افسانوں میں یہ معنی بھی پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے متن کو حتمی Original (طبع زاد) نہیں سمجھتے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ طبع زاد، اصلی وغیرہ کا تصور مبالغہ آمیز حد تک دعوے ہیں اور وہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

''باتیں اگر دہرائی نہ جایا کریں تو اب تک سب ختم ہو چکی ہوتیں۔'' (حضرت علیؓ)

یہ قول انہوں نے اپنے افسانوی مجموعے 'حنظل' کے شروع کے صفحہ پر نقل کیا ہے اور یہیں پر بیگ احساس کی کشادہ ذہنی کا پتہ چل جاتا ہے اور یہ بھی کہ مصنف کی اصلی پوزیشن کیا ہے اور کس طرح سے ماقبل بے شمار متون کے شعوری یا غیر شعوری مدد سے کوئی نیا متن تیار ہوتا ہے۔ ایسے میں ''طبع زاد''، ''اصل'' کا تصور کتنا غیر سائنسی معلوم ہوتا ہے۔ غالب کو پڑھیں تو خود غالب اور ان کے نقادوں کو میر یاد آ جاتے ہیں۔ سریندر پرکاش کو پڑھئے تو پریم چند جی اٹھتے ہیں۔ انتظار حسین کے افسانے قدیم دیو مالا کا لباس پہن کر سامنے آ جاتے ہیں۔ عابد سہیل کا ''عیدگاہ'' پریم چند کی یاد دلاتا ہے۔ حسین الحق کا افسانہ ''گمشدہ استعارہ، باغ و بہار کی یاد دلاتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کا افسانہ ''بیٹا باپ'' راجندر سنگھ بیدی کی یاد دلا دیتا ہے۔ اس طرح مظہر الزماں خاں اور کئی ایک افسانہ نگاروں کے یہاں یہ عمل دیکھنے کو ملتا ہے۔ بیگ احساس کے یہاں بھی بین التونی انداز کا فن کارانہ استعمال ہوا ہے۔ ''برزخ'' پڑھ کر ویدانت کے مایا سے متعلق قصے جاگ اٹھتے ہیں۔ اصحاب کہف کے واقعے میں نئے معنی پیدا ہونے لگتے ہیں۔ ''ملبہ'' پڑھتے ہی مولانا آزاد کا غبارِ خاطر یعنی اسی میں پیش کردہ ''چڑا چڑے'' کی کہانی سامنے آتی ہے۔ مگر مفہوم میں کتنا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ بیگ نے ''خس آتش سوار'' میں قدیم ہندوستانی تہذیب اور ویدانت کے فلسفے کو موجودہ متن کا حصہ بنا کر آج کی حسیت سے جوڑ کر دیکھا ہے۔ یہ کہنا کہ بیگ احساس کے یہاں مابعد جدید حسیت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اسی وجہ سے ایک قابل ذکر افسانہ نگار کہے جا سکتے ہیں بلکہ وہ اس لیے قابل ذکر افسانہ نگار ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے متن میں نئی سچائیوں کو پیش کی کوشش کی ہے۔

مذکورہ بالا نکات یہ بتاتے ہیں کہ جب ہم کسی متن کو پڑھیں تو مصنف کے حالاتِ زندگی کو پڑھنے کے بجائے اس شعریات، اس ادبی تہذیب پر نگاہ رکھیں جس کے بے شمار ریشوں نے اس متن کو بنانے میں حصہ لیا ہے۔ یہ عمل قاری کو منشائے مصنف کے حصار سے باہر نکال دیتا ہے اور قاری اس متن کو از سرِ نو لکھنے کے عمل سے جڑ جاتا ہے۔

افسانوی مجموعہ ''حنظل'' کے مطالعے سے کم سے کم پہلا تاثر جو قائم ہوتا ہے وہ یہ کہ بیگ احساس ان کہانی کاروں سے الگ ہیں جو دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے گہرے سوچ میں ایسے گم رہتے ہیں جیسے وہ آئن سٹائن ہوں اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ مکمل طور پر ان کی ایجاد ہے۔ وہ چاہیں تو کہانی جہاں چاہیں ختم کر دیں اور جہاں چاہیں کرداروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیں۔ بیگ احساس ایسے کہانی کاروں کو اس مجموعے کے پہلے افسانے ''پناہ گاہ کی تلاش'' میں کرداروں کے سامنے لاکھڑا کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ وہ خود بھی یہاں موجود ہیں اور پھر مصنف اور کردار میں وہ مکالمہ ہوتا ہے جس میں مصنف کی ساری ہیرا پھیری اور گھپلے کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔

افسانہ ''پناہ گاہ کی تلاش'' کا مرکزی تصور، فن میں سچائی کو پیش کرنے کا مسئلہ ہے۔ فکشن میں سچ بولنا ایک مشکل مرحلہ ہے۔ یہ افسانہ کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے:

''وہ کریہہ منظر کینوس پر ابھر رہا تھا۔''

''گدھوں سے ڈھکا آسمان، خون کی بارش، سرخ پانی کے دریا، جلتی لاشیں، عبادت گاہوں پر خون کی چھینٹیں، مقدس کتابوں کی ادھ جلی جلدیں، بکھرے صفحات، جوان عورتوں کی لاشیں، برہنہ داغدار جسم، کتنا خطرناک منظر ہے۔''

اس افسانے میں مونتاژ اور تصویری کولاژ کی تکنیک سے کام لیا گیا ہے۔ یعنی گدھوں سے ڈھکا آسمان۔ Cut۔ خون کی بارش۔ Cut وغیرہ۔ دوسری اہم بات افسانے کا پہلا جملہ جو سادہ جملہ ہے، میں واحد متکلم کے صیغے کے بجائے واحد غائب کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ ''میں'' یعنی واحد متکلم کا صیغہ راوی سے متعلق ہوتا ہے جب کہ ''وہ'' واحد غائب کا رشتہ ''کردار'' سے ہوتا ہے۔ اگر یہ

صحیح ہے تو منظر ہی یہاں کردار ہے۔ موجودہ دنیا میں ہونے والے قتل وفساد کا منظر، مندرجہ بالا مونتاج میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس منظر کا جبر اور خوف اس قدر طاری ہے کہ یہ مناظر ہی کردار کی طرح پڑھنے والے کے ذہن پر چھا جاتے ہیں۔ یہ ایک سچائی تھی جسے فن کار نے کینوس پر نمایاں تو کیا تھا لیکن ''گھبرا کر'' سے مراد ڈر کر پھر اسے فن کار نے مٹا دیا اور جیسے ہی فن کار نے کتابوں میں اپنا غم غلط کرنا چاہا۔ کردار کتاب سے نکل کر اس سے مکالمہ شروع کر دیتے ہیں۔ کردار مصنف کو جھوٹا بتاتے ہیں اور مصنف سچ بولنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ کردار مصنف کو گفتار کے غازی بتاتے ہیں نیز عمل سے کوسوں دور بتاتے ہیں کیونکہ مصنف نے سچ کو چھپایا ہے۔ اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ سچ کا سامنا کر سکے یعنی اس میں کنفیشن کی بھی جرأت نہیں۔ نتیجتاً معاشرے میں قتل وخون اور بڑھتا ہے اور پورے شہر میں آگ لگ جاتی ہے۔ کردار بے گھر ہو جاتے ہیں اور خدا کو ڈھونڈھنے نکلتے ہیں۔

''یہ خدا کہاں ہے۔ بے گھر کرداروں نے ایک دوسرے سے پوچھا'' آؤ تلاش کریں۔

کرداروں نے خدا کی لاش کو ایک کنوئیں میں تیرتے دیکھا اور چلا پڑے:

خدا مر گیا—ہاں مر گیا—ہمارا خدا مر گیا

مصنف—ٹھہرو—تمہارا خدا مر گیا لیکن میں ''تم'' ہو گیا ہوں۔

کردار—ہم خدا کے بغیر ہی جی لیں گے۔ چلو کسی کتاب میں پناہ ڈھونڈھیں۔

پورا افسانہ Critificational Discourse بن گیا ہے۔ یعنی فکشن کا فن اس میں پیش کردہ سچائی کی رو سے سوالیہ نشان بن گیا ہے۔ یہاں خدا کی موت، مصنف کی موت وغیرہ کا محاورتاً ذکر سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرہ اپنے فرض سے، اپنے کام سے، اپنے فن سے کتنا سرسری رشتہ رکھتا ہے۔ معاشرے میں جرائم کی وہ صورتیں نمودار ہوئی ہیں کہ لوگوں کا خدا پر سے ایمان اٹھتا ہوا سا محسوس ہو رہا ہے۔ یہاں خدا مر گیا یا خدا کی موت کا فقرہ اسی صورت حال کا استعارہ ہے—فنی وفکری اعتبار سے اس افسانے کو اردو کے بہترین افسانوں کی صنف میں رکھا جانا چاہیے۔ اس افسانے کا ایک ایک جملہ افسانے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس افسانے میں سے جملے نکالنے کو کہا جائے تو میں صرف خط کشیدہ جملہ ''کتنا خطرناک منظر ہے'' کو نکال دوں۔ شروع کے جملے میں جس دہشت انگیز مناظر کو پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد مصنف کا یہ کہنا کہ کتنا خطرناک منظر ہے غلط تو نہیں۔ البتہ قاری کے ردِ عمل کو اپنے ہاتھ میں لینے کے برابر ہے۔ کیونکہ شروع کا جملہ بتاتا ہے کہ منظر کریہہ ہے اور کینوس پر ابھر رہا ہے۔ خطرناک اور کریہہ دو طرح کے بیان ہوئے اس سے نثر کی قطعیت مجروح ہوئی ہے۔ جب فلم کی تکنیک کا استعمال کیا گیا تو ہے اس کے تقاضے کو ملحوظ رکھنا تھا۔ مونتاج نما جملوں سے قاری کے ذہن میں جو Images بن رہے تھے اور جس ناقابل بیان صورتِ حال سے قاری دوچار ہو رہا تھا، اس کے بعد مصنف کا یہ بیان کہ کتنا خطرناک منظر ہے صورتِ حال کو محدود کر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا فنی جھول ہے جو افسانے پر بظاہر کوئی اثر بھی نہیں ڈالتا مگر کلوز ریڈنگ کے وقت اس امر پر دھیان ضرور جاتا ہے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ یہ اردو کا ایک اہم افسانہ ہے۔ یہ افسانہ بیگ احساس کے فنی امتیازات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ نیز فن اور فنکار کے رشتے پر بھی۔ اس افسانے کو پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ افسانے کے فن سے متعلق، متن، مصنف، قاری سے متعلق ان کا تصور نہ سماجی/ مارکسی تنقید کی غمازی کرتا ہے نہ اس تصور سے قریب ہے جس میں متن کو ہی سب کچھ سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہاں وہ جدید ترین تصورِ ادب سے جڑے معلوم ہوتے ہیں جہاں قرأت اور قاری کی اہمیت کو مسلم مانا گیا ہے اور مصنف کو تہذیبی عمل کا حساس رکن مانا گیا ہے—(واضح رہے کہ کرشن چندر پران کا کام ہے اور وہ افسانے کی تخلیق اور تنقید دونوں سے رشتہ رکھتے ہیں)۔

بیگ احساس کا بیانیہ اس دور کے بیانیے سے دور ہے جس میں علت و معلول کا پہلو یعنی (Cause and effect) حاوی تھا۔ بیان کرنے والا ہمیشہ ''میں'' ہی ہوتا ہے مگر ''میں'' کو اکثر ''وہ'' میں بدل کر کہانی بیان کی جاتی ہے۔ چونکہ جدیدیوں نے صرف ''میں''، ''میں'' کی وضاحت چاہی تھی، اس لیے واحد متکلم کا صیغہ ان کو بھا گیا تھا۔ یہ صیغہ وجودی محرکات کا تابع ہوتا ہے اس لیے بجائے ادبی ہونے کے فلسفیانہ ہوتا ہے جب کہ یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ فلسفہ، فلسفہ ہے اور ادب ادب۔ بیگ احساس ''میں''، ''میں'' سے زیادہ واحد غائب کے صیغے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا بیانیہ جدید بیانوں سے قریب ہے اور ادبی ہے۔ ان کا بیانیہ ہمہ دان بیانیے سے جڑا ہوا ہے جسے Omnicent Narrative کہا جاتا ہے۔ اس میں راوی عین شاہد کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور کردار تکلمی اشارہ یعنی Ultering Instance بن جاتا ہے اور افسانے میں واقعیت کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ قدیم تنقید، کردار کو ایک زندہ فرد سمجھتی تھی اور متنی سیاق وسباق سے کردار کو الگ کر کے دیکھتی تھی۔ اب کرداروں کی تلاش بیانیے میں تلاش کرنے پر زور اسی لیے ہے کہ متن اور متن کی لسانی ساخت میں ہی کردار کا وجود ہوتا ہے۔ یعنی کردار ایک طرح کی زبان ہی ہیں یا ایک تصور ہی تو ہیں مثلاً قدیم متون میں یہ نیکی اور بدی کے روپ میں تھے اور اب نئے انسان کے تصور کے روپ میں جہاں انسان میں یہ دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے کرداروں کو ہیرو اور ویلن کے روپ میں تقسیم کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

عنوان ''پناہ گاہ کی تلاش'' کو ''پناہ گاہ'' اور ''اس کی تلاش'' دو حصوں میں بانٹیے مصنف نے عنوان کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ دراصل پناہ گاہیں موجود ہیں مگر اس کی تلاش کے لیے ہمیں پہلے سچ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہاں کسی کردار کا کوئی نام نہیں کیونکہ تلاش، منظر وغیرہ اس افسانے کے کردار ہیں۔ دراصل اس کہانی میں نان کیرکٹر انامیت بے چہرگی کا ماحول پیدا کر کے صحیح کردار سازی کی بحث اٹھائی گئی ہے۔ پناہ گاہ کی تلاش پڑھتے ہوئے جوگندر پال کی وہ

کہانیاں یاد آگئیں جن میں انہوں نے کیریٹی فکشن کا زیادہ استعمال کیا ہے۔

بیگ احساس کے افسانوں میں عمل انطباق سے خاطر خواہ کام لیا گیا ہے یعنی بیگ اکثر دو مختلف واقعات کو یکجا کرتے ہیں اور کہانی میں معنوی گہرائی پیدا کردیتے ہیں۔ اسے متوازیت کا فن بھی کہا جاتا ہے۔ اسکرین پلے کا انداز بھی ان کی کہانیوں میں پایا جاتا ہے لیکن یہ محض اسکرین پلے کا ہی انداز نہیں ہے کیونکہ پلے میں ایک واقعے کو دوسرے واقعے سے جوڑنے کے لیے اشارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ طارق چھتاری اس انداز کو منظری اسلوب کہتے ہیں۔ اسی تکنیک سے بیگ احساس کی کہانیوں میں مصنف کی سوچ منظر کے ذریعے ابھارنے میں مدد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم پناہ گاہ کی تلاش کے علاوہ ان کے کئی ایک کہانیوں کو پیش کر سکتے ہیں۔ پناہ گاہ کی تلاش میں مونتاج کی شکل میں جو جملے نقل کئے گئے ہیں اور جس طرح منظر کو کردار بنایا گیا ہے، ان مناظر میں مصنف نے اپنی سوچ کو کس طرح ابھارا ہے بتانے کی ضرورت نہیں۔

بیگ احساس، کہانی پن یا افسانویت پیدا کرنے کے لیے بین المتنیت کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ یعنی ایک کہانی کو دوسری کہانی پر منطبق کرتے ہیں۔ زیر بحث افسانوی مجموعہ ''حنظل'' میں محض بیانیہ کی واپسی ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ یہاں بیانیہ کی تخلیقی کاری گری کے ثبوت بھی ملتے ہیں۔ کہانی پن یا کہانی کی واپسی سے مراد کسی ڈائجسٹ کا کہانی پن نہیں جسے اسکولی بچے پڑھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک تو کہانی پن سامنے کے واقعات میں چھپی کہانی کو پڑھ لینے کا نام ہے۔ بیگ اس رمز سے حتی الامکان واقف ہیں۔ مثالیں آگے آئیں گی۔ بیگ احساس کا بیانیہ لینڈ اسکیپ میں نہیں کھوتا کیونکہ وہ اس کے تاثر کو بیان کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے کے قاری افسانے پڑھنے کے بعد کچھ نہ کچھ ذہن میں ضرور محفوظ کر لیتے ہیں کیونکہ وہ اجتماعی حافظے سے اپنے متن کی تعمیر کرتے ہیں۔ مثلاً کچھ جملے، کچھ کردار، کچھ مناظر اجتماعی حافظے کا تلازمہ بن جاتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''برزخ'' پڑھئے تو بہت کچھ یاد آتا ہے اور ان کا یہ جملہ یاد رہ جاتا ہے۔ سر دست جملے دیکھیں۔ وقت کے فلسفے پر اب تک کی بحثوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

''موت سے خوف؟'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''ہم زندہ ہوتے ہیں تو موت نہیں ہوتی اور جب موت ہوتی ہے تو ہم زندہ نہیں رہتے۔ اس لیے موت نہ زندوں کے لیے خوف کا موجب ہونی چاہیے نہ مردوں کے لیے... زندوں کے لیے اس کا وجود نہیں اور مرے ہوئے خود وجود نہیں رکھتے۔'' (''برزخ'' ص:۱۰۲)

فکشن کی نثر کا آہنگ منتشر آہنگ کی متقاضی ہے۔ اس لیے فکشن کی نثر میں یکسانیت بڑا عیب ہے۔ بیگ، تقاضے کے اعتبار سے شاعرانہ، تیکھے، طنز آمیز، شگفتہ اور تازہ جملے لکھتے ہیں۔ جملے مربوط ہوتے ہیں۔ افعال، تلمیح، محاورے کے ذریعے نثر میں بلاغت پیدا کرتے ہیں اور اختصار کے حسن سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ بعض مناظر، اشیا کے بیان کے لیے تمثیلی انداز اختیار کر کے تفہیم و ترسیل کے راستے فنی انداز میں ہموار کرتے ہیں۔ طے شدہ پلاٹ، سوچے سمجھے انجام سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں تجریدیت کا کہیں کہیں عیب کی حد تک اثر ہے مگر بعض مقامات پر انہوں نے ابہام کو بصری پیکروں کے ذریعے واضح کر دیا ہے۔ اس طرح وہ تصویری کولاژ بنا کر افسانے کی نثر کو چمکا دیتے ہیں۔

وہ فورتاژ Fortage یعنی شاعرانہ وجدان سے نا کے برابر کام لیتے ہیں۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ افسانہ بہر صورت نثر میں ہی لکھا جاتا ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں Prosaic Sensibility کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے وجودیت کے فلسفے کی تشریح نہیں لگتے یعنی philosophy of crisis کا اثر ان کے افسانے پر نہیں۔ وہ اکثر بائیں دماغ یعنی اکتسابی علوم سے کام لینے کے بجائے دائیں دماغ یعنی اسطوری فضا سے کام لیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اسطور فنون کا منبع ہے۔ ان کے یہاں عصری مسائل کا خوبصورت اظہار ہوا ہے۔ مثلاً پناہ گاہ میں یا ''آسمان بھی تماشائی'' میں مسلمانوں کی شناخت وغیرہ سے متعلق مسائل کی بحث ہی نہیں اٹھاتے بلکہ واقعات کی ظاہری سطح کو پیش کرتے ہوئے اسے روح عصر کے منظر نامے سے جوڑ دیتے ہیں۔ لسانی تشکیلات سے ٹائٹل کہانی ''حنظل'' میں خوب کام لیا گیا ہے اور حنظل بڑی حد تک ابہام کا شکار بھی ہوا ہے۔ اس کہانی میں تہذیبی تشخص کے مسئلے کو مرکز میں رکھا گیا ہے۔ اس میں کئی ایک تہذیبی نشانات والی ساختوں کا استعمال کیا گیا ہے مثلاً پھل ایک اسطوری ساخت ہے۔ ''درخت'' ارتقائی ساخت ہے وغیرہ۔ ان افسانوں میں سیاسی امور زیریں سطح پر ضرور ہیں کیونکہ آج کا ادب سیاسی جبر سے آزاد نہیں ہے۔

آج کے افسانوں میں بعض مقامات پر Crude Realism سفاک حقیقت نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً افسانے ''کرفیو'' میں ایک مرد کے ساتھ تنہا عورت کا منظر ''اجنبی اجنبی'' میں ایس کے صدیقی کا اپنے بیوی سے کاروباری رشتہ، اور اس کے احساس سے نیم مردہ صدیقی ''سوا نیزے پہ سورج'' (قیامت کا استعارہ ہے) ایک سفاک حقیقت ہی تو ہے کہ ایک عورت کی عزت اسی کے شوہر کے سامنے لوٹی جاتی ہے۔ اسی طرح مابعد جدید متن کی ایک اور خصوصیت جادوئی حقیقت نگاری (Magic Realism) کا بھی خاصا اثر ان کے متن پر ہے۔ اس کی خوبصورت مثالیں ''حنظل'' کے علاوہ ''ملبہ'' میں ملتی ہیں۔ افسانہ ''خس آتش سوار'' میں گرودیو کے ذریعے حقیقت کی حقیقت کیا ہے سے متعلق طرح طرح کے تاویلات یکجا کر دیے گئے ہیں۔ افسانے میں پیش کردہ ان مباحث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حقیقت، مقام اور وقت کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے۔ حقیقت کوئی ٹھوس شے نہیں بلکہ اضافی قدر ہے۔ غرض ان کے افسانوں میں علامت نگاری، اسطور سازی، نفسی تجربوں اور دیگر مابعد جدید حسیت کی بڑی خوبصورتی سے اسٹرکچرنگ کی گئی ہے۔

ارسطو نے نثری اسلوب کے لیے استعارے کو ضروری قرار دیا تھا تب شاعری اور نثر کی پرکھ کے پیمانے الگ الگ نہ تھے۔ نثر میں جتنی ضرورت تشبیہ (خاص طور سے فکشن کی نثر میں) کی ہے اتنی استعارے کی نہیں۔ بیگ احساس کے بیانیے میں تشبیہ سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور تمثیلی انداز کے ذریعے بھی

اپنی بات میں وقار پیدا کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی کہانی ''میوزیکل چیئر'' سامنے رکھئے۔ یہ کہانی آج کی مصروف زندگی، مسابقے سے بھری زندگی، وسائل کی قلت سے پیدا شدہ بے حسی کو آشکار کرتی تو ہے مگر مرکز میں ''عورت'' کی ذات کو لا کر تانیثی اقدار سے متعلق ڈسکورس پر تبصرہ کرتی ہے کہ کیسے عورت صرف ''سیکس'' سے جڑی ہوئی فقط ایک مشین کا نام ہے۔ ایک عورت کا بچہ کاندھے پر ہے۔ بس میں سیٹ کی کمی ہے۔ سیٹ ہتھیانے کی دوڑ، یہ سارے ساختیے اقدار پر بھی چوٹ کرتے ہیں۔ افسانے میں اچانک ایک جملہ ابھرتا ہے۔ ''فیگر آج کی عورت کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔''

شروع کے جملے میں تشبیہ کا اندازہ کریں:

''چلچلاتی دھوپ، سیاہ سڑک کی نس نس میں اتر گئی اور سڑک اژدہے کی طرح پھنکار مارنے لگی۔ اس پھنکار سے موڑ کا منظر دھندلا گیا۔ اسی وقت ایک تیز رفتار بس دھند کی چادر چاک کر کے نکلی تو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی موٹا سا سرخ کیڑا اژدہے کی چکنی پیٹھ پر رینگ رہا ہو۔''

اس تشبیہ سے انسان کی ماڈی ترقی پر کس طرح کا طنز کیا گیا ہے۔

آپ خود بھی جملے پڑھ کر اندازہ کر سکتے ہیں۔ منفرد تشبیہ ہے۔

افسانہ ''کرفیو'' کی عورت ایک مرد کے ساتھ اس کے گھر میں رات گزارنے پر مجبور ہے۔ اپنی عفت کو بچانے کے لیے ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ دوسری طرف ایک ہرنی کی کہانی بطور تمثیل:

''اس کے اندر چھپی ہوئی ہرنی نے دیکھا۔ اس عفریت نے بہت سی ہرنیوں کا خون پیا ہے اور اس عفریت کو ختم کرنے کے بہانے بہت سے محافظوں نے بھیڑیوں کی طرح ہرنیوں کا شکار کیا ہے۔ وہاں بہت سے بھیڑیے دانت نکوسے کھڑے تھے۔ ایسے میں وہ اس کی بوٹیاں نوچ کر گولی مار سکتے ہیں...''

عورت کے اندر پیدا ہونے والی کشمکش کا منظر تمثیل کے سہارے بیان کرنا پھر اس کا شہر میں لگے کرفیو سے رشتہ قائم کرنا اور پھر اس کرفیو کی طرف اشارہ کرنا جسے سماج کے ذریعے عورت کے فطری جذبات پر لگایا گیا ہے۔ پس منظر، پیش منظر کی مدد سے معنی کے نئے وسیلے پیدا کر کے عورت کی ذات پر لگائے گئے پہرے اور معنی پر بٹھائے گئے پہرے کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ اس کہانی میں منظری اسلوب کا خوبصورت استعمال کیا گیا ہے اور ایک سچویشن پر دوسری سچویشن کو منطبق کر کے گہرے معنی پیدا کئے گئے ہیں۔

بیگ احساس نے اپنی کہانی میں ایسے محاوروں کا استعمال کیا ہے جن کی وجہ سے اجتماعی حافظے کی دنیا جاگ اٹھتی ہے مثلاً ''خس آتش سوار'' جس میں قدیم ہندوستان کے مٹھوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے جہاں عورت مرد ساتھ ساتھ گرودیو سے نظری علوم کے بجائے عملی علوم سیکھتے تھے۔ اس کہانی میں ایک جگہ محاورے کے ذریعے کچھ اس طرح سے اجتماعی حافظے کو تازہ کیا گیا ہے:

''دراز قد چیلے کو سب نے دھکیل کر برتن تک پہنچایا۔ طوطے کی شکل، آنکھوں میں کیچڑ۔ اس کے چہرے پر سب سے نمایاں زبان تھی۔ بار بار تلوے چاٹنے کے عمل سے لپلپی ہوگئی تھی۔''

غور کریں۔ اس نثری اقتباس میں کئی ایک محاورے استعمال کئے گئے ہیں اور جس کے اندر چھپی ہوئی کہانیاں یاد آتی ہیں۔ مثلاً طوطا چشمی، زبان کا جیتا کرتوت کا ہارا۔ تلوے چاٹنا وغیرہ۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ بیگ احساس کی کہانیوں میں کرداروں کا کوئی حتمی نام نہیں ہوتا۔ وہ اپنے سیاق وسباق سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں تشبیہی ساخت کے استعارے زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ کردار کو تمثیلی انداز کی کہانی کا سیاق فراہم کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہاں جملوں کے استعارے پر غور کریں۔ یہ سوا نیزے پر سورج سے لئے گئے ہیں۔ اس کا تھیم پہلے بتایا جا چکا ہے:

''مورنی ہانپنے لگی۔ کتوں نے اس کے سارے خوبصورت پر نوچ لیے تھے۔ فضا میں نرم نرم رنگین پر بکھر گئے تھے۔'' (عصمت دری کا منظر)

کہانی کار ویلن کے لیے پہلے یہ لکھ دیتا تھا کہ مردودوں/ ظالموں/ کتوں نے اس لڑکی سے اپنا منہ کالا کیا مگر یہاں اپنے کرداروں کو استعارے میں اس سے بھی بڑی گالی دی گئی ہے جو براہِ راست انداز سے زیادہ معنی خیز ہے۔

آیئے ان کے کچھ افسانوں پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا واقعی ان کے جملہ افسانوں میں متذکرہ بالا خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

ٹائیٹل کہانی ''حنظل'' میں جو ساختیے استعمال کئے گئے ہیں، وہ کچھ اس طرح کے ہیں۔ ''زمین''، ''جڑ''، ''مزدور''، ''درخت'' زمین مقام یعنی مقامیت سے جڑے احساس کا تصور ہے۔ ''مزدور''، ''محنت کش طبقہ''، ''درخت'' تہذیب کا نشان Code ہے۔ افسانے کا پہلا جملہ ہے:

''جب شہر کی زمین تنگ ہوگئی تو لوگ سر چھپانے کے لیے ویرانوں کو آباد کرنے لگے۔''

اخیر کا جملہ ہے:

''اب کوئی اس مکان کے پاس سے نہیں گزرتا کیونکہ ہر وقت ایسی آوازیں جیسے کوئی درخت کے تنے پر آری چلا رہا ہو۔''

افسانے میں صنعتی انقلاب، نوآبادکاری سے پیدا شدہ مسائل نیز فطرت کے مناظر کو ترقی کے زعم میں ختم کرنے کے المیے پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ حنظل میں جادوئی حقیقت نگاری کے ذریعے ہندوستان کی ۲۰۰ سالہ تاریخ کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد کس طرح سے ہماری تہذیب کی جڑوں کو نقصان پہنچا، ملک غلام ہوا، اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں درخت میں پھل آنا خوشحالی کی طرف اشارہ ہے۔

درخت کا پہلے چھتنار بتانا پھر سڈول بتانا اجتماعی معاشرے کا اجتماعی حافظے سے کٹ کر انفرادیت پسندی کی طرف اشارہ ہے۔ پھر پورے پس منظر کو اسلامی اسطور سے جوڑ دیا گیا ہے کہ کس طرح آدم نے ''پھل'' چکھا تھا اور اس کی

سزا بھگتنی پڑ رہی ہے۔ کیا زندگی میں غلطی و گناہ کا بھی اتنا بڑا درجہ ہوسکتا ہے۔ ''حنظل'' اندرائن کے پھل کا نام ہے جو سخت کڑوا ہوتا ہے لیکن آدم نے جس پھل کو کھایا تھا، وہ میٹھا تھا لذیذ تھا۔ آج وہی پھل اندرائن کے پھل میں تبدیل ہو چکا ہے۔ زندگی کڑوی کسیلی حقیقتوں سے بھر گئی ہے۔ اس افسانے میں جڑوں سے بچھڑنے کا شدید احساس ہے۔

''آسماں بھی تماشائی'' اس مجموعے کی آخری کہانی ہے۔ شروع کے جملے میں ہی صدیوں پہلے کی کہانی کی طرف اشارہ ہے۔ افسانہ ایک سوال سے شروع ہوتا ہے۔ ''آپ وہی بزرگ ہیں نا'' اس نے سوال کیا ''جو صدیوں پہلے نہر حیات کے کنارے ملے تھے۔'' اخیر کے جملے میں بھی نہر حیات کا ذکر ہوتا ہے۔

جملہ اس طرح ہے کہ ''یہ کہہ کر وہ بزرگ غائب ہوگئے۔ وہ نہر حیات کے کنارے تنہا رہ گیا۔''

افسانے کے شروع میں جو جملہ ہے وہ story oriented ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کون بزرگ؟ ظاہر ہے اشارہ خواجہ خضر کی جانب ہے۔ سوال کرنے والا ایک مسافر معلوم ہوتا ہے جو شاید ایک رپورٹر ہے۔ خواجہ اس کو اپنے ساتھ سفر کرنے کے لیے اجازت تو دے دیتے ہیں مگر تنبیہ کرتے ہیں کہ وہ کچھ دیکھے تو ان سے سوال نہ کرے اور اگر اس نے سوال کیا تو وہ اس سے پھر الگ ہو جائیں گے۔

پہلا منظر صدیوں پرانی بستی کا ہے جس میں کچھ لوگ پیشانی پر ایک رنگ کی پٹیاں باندھے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا اشارہ کار سیوکوں کی طرف ہے۔ اس افسانے میں بار بار ایک ''عمارت'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بابری مسجد ہے۔ اس کے بعد بیگ نے مسلمانوں کے کئی طبقات میں سے تین یا چار کرداروں کو منتخب کیا ہے جس کی سوچ بابری مسجد کے حوالے سے سامنے لائی گئی ہے۔ پہلا کردار مذہبی ہے۔ وہ ایک ''چراغ'' سے چپکا ہوا ہے اور اس کی جی جان سے حفاظت کرنا چاہتا ہے۔

چراغ بیک وقت قدامت پسندی کی علامت ہے اور یہ بھی کہ مخصوص کلچر کی علامت ہے۔ چراغ کا تحفظ اپنے کلچر کا تحفظ ہے۔ اپنی شناخت کو برقرار رکھنا ہے۔ افسانے میں مندرجہ ذیل جملے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

مسافر:۔۔ لیکن یہ تو بہت ہی قدیم چراغ ہے۔ ''ہاں مجھے یہی پسند ہے.... اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔''

عبادت گاہوں کو ویران کر دیا جائے تو وہ زمین سے ہٹائی جاتی ہیں۔ اس Religious prediction کے ساتھ ایک تلمیح بھی اس صورتِ حال پر دال ہے۔ مثلاً۔۔ ''اعمال درست کرلو تو وہی حفاظت کرے گا۔ کیا اس نے پرندے نہیں بھیجے تھے جن کے پنجوں میں کنکریاں تھیں۔''

دوسرا کردار لیڈر ہے۔ وہ پر جوش باتیں کرتا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے۔ یہ کر دوں گا۔ وہ کر دوں گا۔ تیسرا کردار متوسط طبقے کا ایک ادھیڑ عمر شخص ہے۔ بیٹا بڑی مشکل سے عرب گیا ہے۔ اب گھر کے حالات سدھرے ہیں۔ مشکل سے مکان بنا ہے۔ آرام آسائش کی ہر چیز گھر میں ہے۔ اب اچھے دن آئے ہیں کہ یہ جھمیلا پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، کر لینے دیا جائے کیا حرج ہے۔

چوتھا کردار ترقی پسند ہے شاید پروفیسر ہے۔ کتاب پڑھ رہا ہے۔ خواجہ اور رپورٹر جب اس سے مسئلے کی طرف دھیان دینے کو کہتے ہیں تو لیکچر دیتا ہے:

''مذہب نے بڑی گڑبڑ مچائی ہے دنیا میں۔ دراصل سارا کرائسس شناخت کا ہے اور اپنی شناخت کے لیے کچھ لوگ مذہب کا سہارا لے رہے ہیں۔ مذہب کی روح ختم ہو گئی ہے۔ اب مذہب روایت بن گیا ہے۔ (آسماں بھی تماشائی ص:۱۱۹)

اس کردار کی باتوں کو کوئی نہیں سنتا۔ اس کا کہنا ہے کہ ''میرے پاس وہ لفظ ہی نہیں جو ان کی ذہنی سطح کو چھو سکیں۔ وہ (یعنی لوگ) اس کی بات سنتے ہیں جو چھت پر کھڑا ہے۔'' یہی نہیں اس افسانے میں ان کرداروں کے علاوہ عرب کے شہنشاہ وغیرہ بھی ہیں جو اس لڑائی میں شریک اس لیے نہیں ہونا چاہتے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ''پھر ہمارے ہاتھ میں اونٹ کی نکیل آجائے گی۔'' دولت مند ہیں جو دروازے بند کر کے اندر اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہے ہیں۔ اس کہانی میں سفید مکان والا ہے جو لیڈر ہے وہ محل والوں سے بہتر ہے کہ وہ کم از کم برا یا بھلا رول اس افراتفری کو ختم کرنے لیے نبھا رہا ہے۔ خواجہ کے ساتھ چل رہا مسافر/ رپورٹر بار بار سوال منع کرنے پر بھی کرتا ہے جسے خواجہ ڈانٹ دیتے ہیں۔ اس طرح اس افسانے میں تقریباً سات بار رپورٹر سوال کر چکتا ہے۔ حالانکہ خواجہ نے سوال نہ کرنے کی تاکید کی ہے۔ سوال دیکھیں:

۱- آپ وہی بزرگ ہیں نا''......

۲- لیکن اے بزرگ یہ سب کیسے ہوا؟ (یعنی مسلمانوں کے شاندار ماضی کا خاتمہ کیسے ہو گیا) خضر۔۔ لمبی کہانی ہے۔ کیا تم سوال کے علاوہ کچھ اور نہیں کر سکتے۔ (خضر کے جواب میں کتنا طنز ہے۔)

۳- اس نے بزرگ سے سوال کیا ''اپنی سانسوں کے چھننے کے خوف سے یہ لوگ اپنے محلوں کے دروازے بند کر لیں گے تو کیا طوفان سے بچ جائیں گے؟ (اس مرتبہ بزرگ نے شرط کے خلاف سوال کرنے پر تنبیہ فرمائی)۔

۴- حاکم نے منافقت کیوں کی؟ اونگھتی ہوئی فوج نے نہتوں پر گولیاں کیوں چلائیں؟

۵- سیاہ فام لوگوں سے متعلق اظہار افسوس کا سوال۔

۶- ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

۷- جب وہ سب بھوک سے مر جائیں گے تو وہ کس پر حکومت کریں گے؟

بزرگ نے کہا لو صاحب اب مجھ میں اور تم میں حسب قرار جدائی ہو گئی۔ تم نے خود ہی کہا تھا کہ میں کوئی بات پوچھوں تو مجھے الگ کر دینا۔

اس کہانی میں جس ماقبل متن کی یاد تازہ ہوتی ہے وہ متن حاتم طائی کا سات سوال ہے۔ یہاں ہر سوال کا پس منظر حاتم کے سوال سے بھی زیادہ پراسرار اور جواب

طلب ہے۔سوال قاری کے اندر متن کی ازسرِنو تعمیر کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔خاص طور سے خواجہ کا سوال پر پابندی لگانا اور سوال کرنے پر اس کا جواب نہ دینا متن میں ایک ایسا گیپ پیدا کرتا ہے جو قاری اپنے جواب سے پر کرسکتا ہے۔ داستانوں میں اکثر سوال نہ کرنے اور جواب نہ دینے کے پیچھے داستان کے راز کو پوشیدہ رکھنا ہوتا تھا۔ حالانکہ ان سوالوں کے جوابات بیانیے میں پوشیدہ ہیں۔ آخری سوال کے بعد سوال کرنے والے خواجہ کا۔ یہ استفسار کہ — ''لیکن اس وقت تو آپ نے سارے سوالوں کی وضاحت کی تھی اور بعد میں علٰحیدگی اختیار کی تھی۔''

خضر کا کہنا ہے کہ — ''ہاں وہ ان دنوں کی بات تھی جب علم ادھورا تھا اور وقفہ وقفہ سے بھیجا جا رہا تھا لیکن اب آسمانی سبق مکمل ہو چکا ہے۔اب کوئی آنے والا نہیں۔اس لیے آسمان خاموش تماشائی بن گیا ہے۔اپنے سوالوں کا جواب خود ہی تلاش کرو۔''

اشارہ قرآن کی آیتوں کے نزول کی طرف ہے اور اس کے مکمل ہونے کی طرف ہے—

زیادہ سوال کرنا بچوں کی فطرت ہے لیکن بچے میں حالات بدلنے کی سکت کہاں ہوتی ہے۔موجودہ زمانے کے مسائل نے نئی نسل کو جیسے سوالوں کا مجسمہ بنا دیا ہے۔اس افسانے میں جس مسئلے کو شدت سے اٹھایا گیا ہے۔وہ شناخت کا مسئلہ ہے اور یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ چراغ سے چپکا ہوا بوڑھا شخص اپنی شناخت کھونا نہیں چاہتا۔مگر جس کے گھر سب کچھ موجود ہے وہ اپنی شناخت کھو چکا ہے یا نئی شناخت کی فکر میں ہے۔لیڈر کچھ اور طرح کی شناخت رکھتا ہے۔مگر ''اسلام خطرے میں ہے'' جیسے نعرہ لگانے والے کی آواز میں آواز ملا کر اپنی شناخت پر ایک جھوٹی پرت چڑھائے رکھتا ہے۔سعودی عرب کا بادشاہ بھی اپنی شناخت بھول کر کسی اور قسم کی شناخت کی تشکیل میں منہمک ہے۔ بوڑھا ترقی پسند پروفیسر مذہب سے الگ شناخت بنانے کی وکالت کرتا ہے۔ مارکس نے کلاس کو، طبقے کو تشخص سے جوڑا۔ذات کے اعتبار سے انسان نہیں پہچانا جاتا۔اگر مذہب کو شناخت بنایا جائے تو یہ ایک طرح کا مغالطہ آمیز شعور False Consciousness ہے۔ جدیدیت کے نزدیک آپ کا موجودہ ہیولی، حیثیت ہی آپ کی شناخت ہے۔آپ نے جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ آپ کی شناخت ہے یعنی Rationality ہی شناخت ہے۔اس کے پیچھے پونجی وادی تصور کام کر رہا ہے جو اصلی مدے سے انسان کو بھٹکا رہا ہے۔مابعد جدیدحسیت کے مطابق:

Identity is Multy Layered یعنی شناخت کو پوری طرح سے Define نہیں کیا جاسکتا۔اوپر سے کچھ اور دِکھے گا اور جب کھرچئے گا تو کچھ اور نکلے گا۔زیادہ سے زیادہ آدمی اپنے مقام سے جڑا ہوتا ہے۔اسے وہی رکھ کر دیکھنا مناسب ہے۔اس افسانے میں شناخت کو اس نئے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیگ احساس نے اپنے کئی افسانوں میں اس سوال کو اٹھایا ہے۔ مثلاً ''اجنبی اجنبی'' میں ایک آدمی جو بیرونی ممالک میں جا کر کماتا ہے۔سال میں دو سال میں ایک دن گھر آتا ہے۔ بیوی اکیلی ہوتی ہے۔ بچے چھوٹے سے بڑے ہو جاتے ہیں۔ایک بار جب وہ گھر آتا ہے تو لوگ اسے ایک خاص مدت گزرنے کے بعد جلدی لوٹ جانے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ بیوی کی آنکھوں میں کوئی بے قراری نہیں ہے۔سارے لوگ اس کی کمائی پر نظر رکھتے ہیں بلکہ اسے پیسے کمانے کی مشین سمجھ رہے ہیں۔ بیوی شوکت صدیقی کو ایس۔کے۔صدیقی بنا دیتی ہے۔ یہ شناخت کے کھونے کی پہلی سطح ہے، اس کے پوچھنے پر بتاتی ہے کہ ایس۔کے صدیقی وہ خود ہے۔یعنی اُسے معلوم بھی نہ تھا اور اسی کا نام اُس کی بیوی نے بدل دیا تھا۔

۱- ''پانی کے شاور کے نیچے یہی سوچتا رہا کہ ایس۔کے۔صدیقی کون ہے؟

۲- گیٹ پر لگی نیم پلیٹ پر کس ایس۔کے۔صدیقی کا نام لکھا تھا (اجنبی اجنبی ص:۴۵)

۳- زندگی ایک طویل اکتاہٹ کا صحرا بن گئی۔(ص:۴۸)

اس افسانے کے عنوان کا اس متن سے گہرا رشتہ ہے۔آسمان خاموش تماشائی یا ''آسمان بھی تماشائی'' سماج کے ان لوگوں کی بے حسی کا استعارہ ہے جن کے ہاتھ میں طاقت ہے۔وہ چاہیں تو حالات کا رخ موڑ سکتے ہیں مگر محض تماشائی بننے میں ان کا فائدہ ہے۔''تماشائی'' یا تماشا اس عہد کی سائیکی ہے۔ ہر شے فکشن کی طرح مبہوت کر دینے والی ہے۔لوگ دیکھنے سے زیادہ خوش ہیں۔اس لیے جو کچھ بھی سنتے ہیں۔وہ دیکھنے کے عمل کا حصہ بن جاتا ہے۔کوئی کچھ کرنے کے درپے نہیں ہے۔مشینوں نے بھی اس سائیکی کے فروغ میں خاصا حصہ لیا ہے۔

اس مجموعے کا ایک افسانہ ''برزخ'' موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے الگ ذائقے کا افسانہ ہے— افسانے کا پہلا جملہ ہے۔''اس کرب سے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ میری سمجھ میں آ رہا ہے کہ میں وقت کے حصار سے نکل جاؤں۔''

افسانے کا آخری جملہ کچھ اس طرح سے ہے:

اور اچانک ہی وہ سارے منتظر لمحے جو ان دیواروں کے باہر رکھے تھے حملہ آور ہو گئے اور ایک بار پھر وہ وقت کے حصار میں قید ہو گیا۔

شروع اور آخر کے دونوں جملے مرکب جملے ہیں۔ایک میں وقت سے باہر ہو جانے یعنی زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہو جانے کی تمنا ہے تو اخیر میں اس میں کامیاب نہ ہونے کا افسوس۔ یہ افسانہ ایک اپاہج کی سوچ ہے، اس کے کرب کی افسوس ناک تصویر ہے۔وہ زندہ ہے مگر ہر لحہ موت سے ہمکنار ہے۔ طرح طرح کے احساس کمتری میں مبتلا ہے۔ بیوی سامنے ہے۔ ہر طرح سے دلجوئی کرتی ہے مگر اسے ہر پل اپنے اپاہج پن کا غم ستا رہا ہے۔اس افسانے میں موت اور زندگی سے متعلق اور خاص طور سے وقت سے متعلق ایسے جملے لکھے گئے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فکشن میں کتنے عمیق مشاہدے اور بلند تخیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ایسے ایسے تصورات فکشن میں مصنف کے سامنے آتے ہیں جسے زبان کے مروجہ اسلوب میں بیان کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

پچھلے صفحات پر جو جملے نقل کئے گئے ہیں ان کو ایک بار اور پڑھئے تو اس

بات کا اندازہ آپ کو بھی ہوگا۔افسانے کی اصل تھیسس ان پختہ جملوں میں پوشیدہ ہے۔افسانے میں اوپری سطح پر تو وقت کا فلسفہ نظر آتا ہے۔مگر زیریں سطح پر معنی کی ایک عجیب وغریب دنیا تشکیل ہوجاتی ہے۔اگر افسانے کا موضوع فقط وقت کی تعبیر ہوتا تو افسانہ کبھی بھی کامیاب نہ ہوتا۔کیونکہ وقت پر اب تک امام شافعی سے لے کر مولانا رومی اور برگساں، اقبال اور آئنسٹائن وغیرہ نے جس طریقے سے بحث کیا ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے۔جب آپ افسانے کی تہہ میں اتریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کہانی کو پڑھتے ہوئے کئی ایک اسطوری/ مذہبی کہانیاں ہمارے سامنے آن کھڑی ہوتی ہیں۔اس کہانی کو پڑھتے ہوئے قرآن میں مذکور اصحاب کہف کا واقعہ سامنے آتا ہے جس میں وقت کے فلسفے کا بیان ملتا ہے۔پران میں وشنو اور نارد کا واقعہ بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے۔یہ واقعہ ''مایا درشن'' پر مبنی ہے۔ان واقعات کے یاد آتے ہی ''برزخ'' میں بڑی معنوی گہرائی پیدا ہوجاتی ہے۔ بین المتنیت ہر عظیم ادب کا مقدر ہے۔اس عمل کے ذریعے وقت کے بڑھنے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔برزخ کہانی اور اصحاب کہف اور پران کے مایا کے تصور پر مبنی کہانی میں فرق کیا ہے؟

اس کہانی اور اس سے جڑی ہوئی اسطوری کہانیوں مثلاً اصحاب کہف کی کہانی میں فرق یہ ہے کہ اصحاب کہف نے یہ نہیں چاہا تھا کہ وہ صدیوں کی نیند سوجائیں۔نارد نے بھی یہ نہیں چاہا تھا کہ وہ اپنی یادداشت کھودیں اور وشنو کے پاس نہ جا کر کسی کے گھر پہنچ کر گھر جمائی بن کر وہیں کے ہو رہیں اور جب یاد واپس آئے تو اپنے آپ کو وہیں پائیں جہاں سے چلے تھے لیکن اس افسانے کا کردار شعوری طور وقت کی قید سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔وہ اپاہج ہے یعنی محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔''وہیل چیئر'' ہی اس کے پاؤں ہیں۔محض زندہ ہے مگر حرکت سے عاری ہے۔ وقت پہاڑ کی طرح اس پر مسلط ہے۔وقت کاٹے نہیں کٹ رہا ہے۔ایسے میں وہ کیا کرے۔سارا غصہ وقت پر طرح طرح سے گفتگو کر کے باہر نکالتا ہے۔وقت کو وہ اپنا حریف سمجھتا ہے۔وہ وقت پر اتنا بحث کرتا ہے کہ شروع میں افسانہ وقت پر لکھا گیا ایک مقالہ لگتا ہے لیکن جیسے ہی کردار کے اپاہج وجود اور اس کے کرب کا بیان قاری پر واضح ہوتا ہے۔وقت پر لکھا گیا یہ مقالہ بول اٹھتا ہے۔یہ کردار اصحاب کہف سے منفرد ہوجاتا ہے۔وہ وقت کو مسخر کرنا چاہتا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ وقت کے حصار سے باہر نکل جائے اور ایسا کرنے میں وہ کامیاب بھی ہوجاتا ہے۔

ایک دن ایک بچہ اس کمرے میں داخل ہوتا ہے جہاں اپاہج وقت کے حصار سے باہر یعنی وقت کے احساس سے عاری ہوچکا ہے۔بچے نے اس کے سکوت کو توڑا۔اس نے اپاہج سے سکہ مانگا، جس سکے کو اس کی بیوی فرش پر گرا کر بازار چلی گئی تھی جس کی موت حادثے کی وجہ سے ہوگئی تھی۔لڑکا سکہ لے کر بازار میں جاتا ہے مگر سکے کو دوکاندار پرانا سکہ جو کئی سو سال پہلے بازار میں چلتا ہوگا بتاتے ہیں۔لڑکا واپس آکر اپاہج کو بتاتا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سکہ سیکڑوں سال پرانا سکہ ہے۔اب تو نیا سکہ چلتا ہے۔اتنا سننا تھا کہ اپاہج پھر سے زمان ومکان کی قید میں آجاتا ہے۔دراصل ہم وقت سے پرے نہیں جاسکتے۔نہ وقت کی تفہیم ممکن ہے۔یہ ایک مایا ہے۔وقت یہاں اپاہج تھا اور لاکھ کوششوں کے باوجود اپاہج ہی رہا ہے۔مطلب صاف ہے کہ وقت ہماری حرکتوں سے وجود میں آتا ہے۔

اس افسانے کا عنوان ''برزخ'' ہی کیوں؟ یہ بھی ایک سوال ہے۔ افسانے کو اپاہج کے حوالے سے دیکھیں تو برزخ جس کے معنی آڑ، پردہ، مرنے کے بعد قیامت تک کا زمانہ، دو مخالف چیزوں کے درمیان کی چیز کے ہیں، سے پتہ چلتا ہے کہ برزخ متن کا ناگزیر حصہ بن گیا ہے۔اپاہج کے ذہن میں جو وقت ہے، وہ دراصل مرنے کے بعد قیامت تک کے زمانے کے انتظار کے مترادف ہے۔اپاہج ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جو دو مخالف تصور کے درمیان ایک دردانگیز مرحلہ ہے اور وہ مرحلہ ہے زندگی اور موت کے بیچ اپاہج کا لٹکنا— برزخ افسانہ ایک اپاہج کے احساس کمتری نے تحریر کیا ہے اور وقت اس لیے زیر بحث آگیا ہے کیونکہ اس کے لیے وقت ایک عذاب بن گیا ہے۔تھکن اکتاہٹ پیدا کردینے والے دن بور کردینے والی راتیں ہیں جس میں وہ گھرا ہوا ہے؟ وہ وقت پر طرح طرح سے سوچتا ہے اور اسے کوستا ہے۔دراصل ''برزخ'' وقت پر لکھا گیا افسانہ نہ ہوکر ایک اپاہج کی بے چینی کا وسیلہ بن جاتا ہے یعنی دو مخالف حقیقتوں موت اور زندگی کے تصادم کے درمیان تخلیقی عمل کا استعارہ بن جاتا ہے۔اس طرح افسانے کا عنوان متن کے معنی کو اور کھولنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔ بیگ احساس کے افسانوں میں عنوان نظمیہ عنوان نہ ہوکر نثری حسیت کو اجاگر کرتے ہیں اور متن کا ناگزیر حصہ بن جاتے ہیں—

اخیر میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ بیگ احساس کے افسانے جدید حسیت اور جدید بیانیات کی فن کارانہ مثالیں ہیں۔گذشتہ دس پندرہ برسوں میں اردو افسانے کے افق پر جو نام ابھرے ہیں، ان میں بیگ احساس کا نام ایک قابل قدر نام ہے۔

بقیہ: افسانوں کا افسانوی رمز

کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ان کے افسانوں کے پلاٹ سیدھے سادے ہوتے ہیں واقعات کی ترتیب اور ارتقاء ماجرا میں ربط وتسلسل اور روانی ان کے ہر افسانے میں دیکھنے کو ملتی ہے۔مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیگ احساس کے افسانے فنی طور پر بے حد کامیاب ہیں۔ایک اہم بات جو موصوف کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد دیرپا اثر ذہن پر چھوڑ جاتی ہے وہ ان کے افسانوں کا حزنیہ اختتام ہے۔بیگ احساس بسیار نویس نہیں ہیں۔لیکن انہوں نے جو بھی لکھا ہے تنقیدی کسوٹی پر پرکھ کر سلیقے سے لکھا ہے۔ان کا تنقیدی شعور بہت بالیدہ ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کے استاذِ گرامی پروفیسر گیان چند جین نے انھیں 'ڈھیڑھا افسانہ نگار' کے لقب سے نوازا ہے۔

افسانہ

دخمہ

پروفیسر بیگ احساس

سامنے سہراب کی نعش تھی اور اس کے پیچھے دو دو پارسی سفید لباس پہنے ہاتھ میں پیوند کا کنارہ پکڑے خاموشی سے چل رہے تھے۔ان کے پیچھے ہم لوگ تھے۔''دَخمہ'' کی گیٹ پر ہم لوگ رک گیے۔ہمیں اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔سب کچھ ویسا ہی تھا۔کچھ بھی نہیں بدلا میری بہن کا گھر بھی!!لیکن اس گھر میں اب میرا کوئی نہیں رہتا تھا۔میری بہن اور بہنوئی کا انتقال ہوئے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔میری بھانجی اسی شہر میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔

اسکول کی چھٹیاں ہوتے ہی میں اپنی بہن کے پاس دوڑا چلا آتا۔ وہ میری سب سے بڑی بہن تھیں درمیان میں چھ اور بہنیں اور ان کے بعد سب سے چھوٹا میں۔اکلوتا بھائی۔میری بھانجی مجھ سے صرف دو برس چھوٹی تھی۔ہم دونوں خوب کھیلا کرتے۔

وہ گھر مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔چٹان پر بنا ہوا خوب صورت مکان اسٹیشن کے اس پار۔پلاننگ کے ساتھ بنائے ہوئے بنگلے۔درمیان میں سیدھی تار کول کی سڑکیں۔کافی چڑھاؤ اور اتار تھے۔ایک زمانے میں اس جڑواں شہر میں صرف تانگے چلتے تھے۔سائکل رکشاؤں کا داخلہ ممنوع تھا۔میری بہن کے گھر پہنچتے پہنچتے گھوڑا ہانپنے لگتا۔چڑھائی پر گھوڑے کے پیر جمتے نہ تھے۔جب ہم تانگے سے اترنے لگتے تو تانگے والا خاص انداز میں توازن بنائے رکھتا۔مشرقی جانب واٹر ریز روائر تھا۔مغرب میں جہاں سڑک مسطح ہو جاتی ہے سینٹ فلومینا چرچ تھا۔چرچ میں مشنری اسکول بھی تھا۔کھلی ٹانگوں والے یونیفارم کے اسکول کو کم ہی مسلمان لڑکیاں جاتی تھیں۔میری بھانجی بھی اسلامیہ اسکول میں پڑھتی تھی۔لیکن ہم لوگوں نے چرچ کا چپہ چپہ دیکھا تھا۔کیوں کہ بچوں کو کوئی نہیں روکتا تھا۔اتوار کے دن اطراف کے کرسچن prayer کے لیے آجاتے فضا میں گھنٹے گونجنے لگتے تو بڑا اچھا لگتا۔پتہ ہی نہیں چلتا کہ گھنٹے کون بجاتا ہے۔مسجد کافی فاصلے پر تھی جہاں چھوٹے چھوٹے بے ترتیب مکان تھے۔

گھر کے مقابل اونچی چٹان بلکہ پہاڑ پر ایک دائرہ نما عمارت بنی ہوئی تھی۔کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا علاقہ تھا۔بہت بڑی باؤنڈری تھی۔نیچے بڑا سا گیٹ تھا۔لوگ اس کو پارسی گُٹھ کہتے تھے۔احاطہ میں ایک چھوٹا سا مکان بنا ہوا تھا۔جس میں چوکیدار،اس کی بیوی اور ایک کتا رہتے۔عجیب سا پراسرار کتا!! محلے کے اکثر گھروں میں السیشن تھے یہ کتا ان سے مختلف تھا۔دور سے ایسا لگتا جیسے اس کی چار آنکھیں ہوں۔

میری بہن پارسی گُٹھ جانے سے منع کرتی تھیں۔کہتی تھیں بچوں کو وہاں نہیں جانا چاہیے۔

ایک دن ہم نے دیکھا پارسی گٹھ کا گیٹ کھلا چھوڑ دیا گیا ہے اور چوکیدار صاحب بے حد مصروف ہیں۔۱۱ بجے دھوپ میں سفید کپڑوں میں ملبوس دو دو پارسی ایک رومال کے دو مختلف سرے پکڑے ہوئے ایک قطار میں چلے آرہے ہیں۔سب سے آگے دو پارسی تھے۔درمیان میں ایک گاڑی۔۔۔پھر پارسیوں کی قطار۔۔۔!! تقریباً ایک بجے تک وہ لوگ مصروف رہے پھر واپس ہو گئے۔شام ہونے سے پہلے گدھوں کے جھنڈ آنا شروع ہوئے۔وہ سب اس دائرہ نما عمارت کے کنارے پر بیٹھ گئے۔شام ہوتے ہوتے سارے گدھ اڑ گئے میں نے ایک ساتھ اتنے سارے گدھ پہلی بار دیکھے تھے شام تک وہ مصروف رہے۔

میں نے اپنی بہن سے پوچھا کہ''اتنے گدھ اس عمارت پر کیوں جمع ہو گئے تھے؟''بہن نے بتایا پارسی گٹھ اصل میں پارسیوں کا قبرستان ہے۔پارسی مرنے والے کی نعش کو چھت پر رکھ دیتے ہیں تاکہ گدھ اس نعش کو نوچ کھائیں یہ سارے گدھ اسی لیے آئے تھے۔

''یہ کیسا طریقہ ہے آپی؟''میں نے جھرجھری سی لے کر کہا۔

''بیٹا اپنا اپنا عقیدہ ہے۔کوئی دفن کرتا ہے۔کوئی جلا دیتا ہے یہ لوگ پرندوں کو کھلا دیتے ہیں اور اسی کو ثواب سمجھتے ہیں۔''اندھیرا ہونے سے قبل سارے گدھ لوٹ گئے۔اس کے باوجود ہم اس روز چھت پر نہیں سوئے۔میں اور میری بھانجی دونوں ڈر کے مارے نیچے کمرے میں ہی سو گئے کیا پتہ کوئی گدھ ہمیں مردہ سمجھ کر۔۔۔

بیدار ہوتے ہی ہم دونوں پارسی گٹھ گئے۔کتا ہمیں دیکھ کر بھونکنے لگا۔

''ارے بیٹا تم لوگ؟''

''چاچا کل کسی کا انتقال ہوا تھا؟''

''ہاں بیٹا''

''دو دو آدمی کیوں قطار بنا کر چلتے ہیں؟''

''یہی طریقہ ہے۔تنہا کوئی نہیں چلتا۔''

''انہوں نے رومال کیوں پکڑ رکھا تھا؟''

''وہ رومال نہیں اسے پیوند کہتے ہیں''

''اور یہ گول عمارت؟''

''یہ دَخمہ''ہے۔اس کی چھت درمیان سے اونچی ہوتی ہے چھت پر تین دائرے بنے ہیں۔مرد کی نعش بیرونی دائرے میں،عورت کی درمیانی دائرے میں اور بچوں کی نعش اندرونی دائرے میں رکھی جاتی ہے تاکہ ان پر تیز دھوپ پڑے اور گدھوں کو دور سے نظر آجائے۔''

''چاچا یہ کتا اتنا عجیب کیوں ہے؟'' میری بھانجی نے پوچھا

''اسے ''سگ دید'' کہتے ہیں۔ چار آنکھوں والا کتا۔۔۔اس کی چار آنکھیں نہیں ہیں لیکن آنکھوں پر ایسے نشان ہیں جس سے اس کی چار آنکھیں نظر آتی ہیں۔ یہ ''سگ دید'' ہی آدمی کے نیک و بد ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔''

''کیسے چاچا''

''جب بڑے ہو جاؤ گے تو خود ہی پتہ چل جائے گا'' چاچا نے ہمارے سوالات سے اکتا کر کہا

''اور چاچا یہ گدھ کہاں سے آ جاتے ہیں؟''

''اگر فرش پر چینی گر جائے تو چیونٹیاں کہاں سے آتی ہیں؟'' چاچا نے سوال کیا اور اندر چلے گئے۔ اس روز بھی ہم چھت پر نہیں سوئے۔

(سہراب بھی ان تمام مراحل سے گزر رہا ہوگا۔)

(۲)

سہراب کا ''میکدہ'' شہر کے مصروف علاقے میں تھا۔ ممکن ہے جس وقت اس کے اجداد نے ''مئے کدہ'' کھولا ہوگا یہ مصروف ترین علاقہ نہ رہا ہو۔ کیوں کہ سامنے راجہ صاحب کی بہت بڑی حویلی تھی۔۔۔بغل میں بھی ایک بہت بڑی حویلی تھی۔۔۔دائیں جانب ڈراما تھیٹر تھا۔ اور بائیں جانب بہت آگے انگریزوں کی ریزیڈنسی تھی۔ مقابل میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی مسجد سے لگ کر جو گلی تھی وہ ''مجرد گاہ'' تک جاتی تھی۔ مجرد گاہ ادیبوں' شاعروں اور فن کاروں کا میٹنگ پوائنٹ تھا۔ اس میں فائن آرٹس اکیڈمی بھی تھی اور رسالے کا دفتر بھی۔ ہم لوگ ادیبوں' شاعروں اور فن کاروں کو دیکھنے آ جاتے تھے۔ ان دنوں بعض ادیبوں و شاعروں کی شہرت فلمی اداکاروں سے کم نہ تھی۔ بیچلر کوارٹرس کے مقابل ایک بڑا شراب خانہ بھی تھا جہاں سستی شراب فروخت ہوتی۔ اکثر فن کار وہاں چلے جاتے۔ جیب گرم ہوتی تو اکثر ادیب و شاعر مئے کدہ کا رخ کرتے شہر کا یہ سب سے قدیم شراب خانہ تھا!!! ایک تو سہراب خالص شراب بیچتا تھا۔ دوسرے وہ ادیبوں و شاعروں کے مزاج سے اچھی طرح واقف بھی تھا۔ کسی اچھے شعر پر داد بھی دے دیا کرتا۔ پارسی ویسے بھی خوش اخلاق اور مہذب ہوتے ہیں۔ پھر سہراب صرف شراب اور سوڈے کی اصل قیمت لیتا تھا۔ پانی اور گلاسس وہ خود فراہم کرتا۔ اندر ٹیبل اور کرسیاں بھی تھیں۔ گزک کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لڑکے ٹوکریوں میں گرین پیس' بھنی ہوئی مونگ پھلی' چڑوا لیے گھومتے۔ لوگ حسبِ ضرورت ان سے چیزیں خرید لیتے۔ دوسرے بارس کے مقابلے میں ''مئے کدہ'' نسبتاً کم خرچ تھا۔

ہم نے جس وقت ''مئے کدہ'' جانا شروع کیا۔ شہر کئی انقلابات سے گزر چکا تھا۔ کمیونسٹوں کی شاہی کے خلاف جدوجہد' تلنگانہ تحریک کامیاب تو ہوئی لیکن شاہی کا خاتمہ کانگریس کی نئی حکومت نے کیا تھا۔ پولس ایکشن نے مسلمانوں کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ مذہب کے نام پر ملک کی تقسیم سے پوری قوم سنبھلی بھی نہ تھی کہ زبان کی بنیاد پر ریاستوں کی نئی حد بندیاں کی گئیں۔ ریاست کے تین ٹکڑے کر دیے گئے۔ برسوں گزر جانے کے بعد بھی دوسری ریاستوں سے جڑے یہ ٹکڑے ان کا حصہ نہ بن سکے۔ اپنی مستحکم تہذیب کی بنیاد پر ریاست کے یہ حصے ٹاٹ میں مخمل کے پیوند لگتے تھے۔ مذہب کے نام پر تقسیم کو عوام نے قبول نہیں کیا تو زبان کے نام پر ریاستوں کی نئی حد بندیوں کو بھی ایک ہی زبان بولنے والوں نے قبول نہیں کیا۔ دو مختلف کلچر۔!! جس شہر کی تاریخ نہیں ہوتی اس کی تہذیب بھی نہیں ہوتی۔ نئے آنے والوں کی کوئی تاریخ تھی نہ تہذیب ایک مستحکم حکومت کا دارالخلافہ سیاسی جبر کی وجہ سے ان کے ہاتھوں میں آ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح خالی زمینوں پر آباد ہو گئے۔ ایک طرف بڑی بڑی حویلیاں حصے بخرے کر کے فروخت کر دی گئیں۔ زمین بیچنا یہاں کی تہذیب کے خلاف تھا۔ شرما شرمی میں قیمتی زمینیں کوڑیوں کے مول فروخت کر دی گئیں۔ آنے والے زمینیں خرید خرید کر کروڑ پتی بن گئے۔ نئے علاقوں کو خوب ترقی دی۔

کسی کوٹھی میں صدر ٹپہ خانہ آ گیا' کسی حویلی میں انجینیر نگ کا آفس' کسی حویلی میں اے۔ جی آفس تو کسی حویلی میں بڑا ہوٹل کھل گیا۔ باغات کی جگہ بازار نے لے لی۔ لیڈی حیدری کلب پر سرکاری قبضہ ہو گیا۔ کنگ کوٹھی کے ایک حصے میں سرکاری دواخانہ آ گیا۔ جیل کی عمارت منہدم کر کے دواخانہ بنا دیا گیا۔ رومن طرز کی بنی ہوئی تھیٹر میں اب بہت بڑا مال کھل گیا تھا۔ حویلیوں' باغات' جھیلوں اور پختہ سڑکوں کے شہر کی جگہ دوسرے عام شہروں جیسا شہر ابھر رہا تھا جس کی کوئی شناخت نہ تھی۔

چند برسوں میں سب کچھ بدل گیا۔ جو تہذیب کے نمائندے تھے جو تہذیب کو بچا سکتے تھے ان میں سے کچھ اپنی زمینوں کو چھوڑ کر سرحد کے اس پار جا بسے تھے اور کچھ مغربی ممالک میں آباد ہو گئے۔ ولی عہد نے ایک مغربی ملک کو اپنا مسکن بنا لیا۔ رعایا کی محبت کا یہ حال تھا کہ جب بھی وہ اس شہر کو آتے تو اس طرح خوشی سے پاگل ہونے لگتے تھے جیسے کوئی فاتح اپنی سلطنت کو لوٹا ہو۔ نہ شاہی خاندان کے افراد کو تہذیب کی فکر تھی۔ نہ امرا کو اور نہ عوام کو۔! ''مئے کدہ'' کے اطراف کا ماحول بھی تبدیل ہو گیا۔ راجہ جی کی حویلی میں سرکاری دواخانہ آ گیا۔ سامنے کی کوٹھی میں بینک کا مین آفس' ریزیڈنسی میں ویمنس کالج' ڈراما تھیٹر فلمی تھیٹر میں تبدیل ہو گیا۔ شہر کا نقشہ تیزی سے بدلتا جا رہا تھا۔ تیلگو فلم انڈسٹری مدراس سے یہاں منتقل ہو گئی تھی۔ شہر کی چمک دمک بڑھ گئی۔ فلمی اسٹیڈیوز' 70 ایم ایم تھیٹرز' بڑے بڑے مالس' کپڑوں اور زیورات کی دکانیں۔ سب ان کا تھا۔ سب پر ان کی چھاپ نمایاں ہو رہی تھی۔ ان کی غذاؤں کے ہوٹل آ گئے تھے جہاں متوسط طبقے کا آدمی پیٹ بھر کھانا کھا سکتا تھا۔ ''فُل مِیل'' (full meal) ملتا تھا۔ وہ آخر میں بڑے انہماک کے ساتھ چاول میں دہی ملا کر کھانے لگتے تو اکثر دہی بہہ کر کہنیوں تک آ جاتا۔ سڑکوں اور کالجس میں سانولے اور سیاہ فام لڑکے لڑکیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ بڑی بڑی کاجل بھری آنکھیں۔۔۔نمکین چہرے۔۔۔پشت پر بلاوز دور تک کھلا ہوا۔۔۔پتہ نہیں انھیں پیٹھ کی نمائش کا شوق کیوں تھا؟ مقامی لوگ

لینڈ گرابرس کی فروخت کی ہوئی خشک تالابوں کی زمین پر مکانات بنانے پر مجبور ہوگئے تھے۔ ہر بارش قیامت بن کر آتی۔ مسلسل فسادات نے پرانے شہر کی ساکھ کو بہت متاثر کیا تھا۔ ہفتوں کرفیو لگا رہتا۔ ہر تہوار وعید پر لوگ سہم جاتے۔ اس صورت حال سے تنگ آ کر جو پرانا شہر چھوڑ سکتے تھے۔ وہ نئے علاقوں میں جا بسے۔ ساری رونق، بڑی بڑی سڑکیں، فلائی اوور، ہائی ٹیک سٹی سب کچھ نئے شہر میں تھے۔ تمام دفاتر نئے شہر کو منتقل کر دیے گئے تھے۔ پرانے شہر میں کچھ تاریخی عمارتیں رہ گئی تھیں۔ مشہور زمانہ چوڑیوں کا لاڈ بازار تھا۔ پتھر سے تعمیر کی گئی مارکٹ پتھر گٹی تھی۔ عیدوں پر ساری رات یہ بازار جگمگایا کرتے۔ دو تہذیبوں نے الگ الگ جزیرے بنالیے تھے۔ جب بھی ریاست کے مقامی افراد کو محرومی کا احساس بہت ستاتا تو وہ علیحدہ ریاست کا مطالبہ کرنے لگتے۔ الیکشن کے زمانے میں کوئی باغی لیڈر اس مسئلے کو گرما دیتا۔ کچھ مہینوں خوب ہماہمی رہتی پھر جذبات سرد پڑ جاتے۔

''مئے کدہ'' کا علاقہ بھی اب ڈاون ٹاون بنتا جا رہا تھا۔ پرانے شہر سے نئے علاقے کو منتقل ہونے والوں میں خود میں بھی شامل تھا۔ (''دَخمہ'' میں پارسی ابھی تک مصروف تھے۔ کوئی باہر نہیں آیا تھا۔)

ان دنوں ادیبوں کا کوئی میٹنگ پوائنٹ نہیں تھا۔ سب بکھر گئے تھے۔ ہمارے دور کو انتشار کا عہد مان لیا گیا تھا۔ فرد کو مشین قرار دے دیا گیا تھا اور تنہائی کو ہمارا مقدر۔!! یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ تاریخی، تہذیبی، قومی، معاشرتی، جذباتی و ذہنی ہم آہنگی کی ساری روایتیں منہدم ہو چکی ہیں۔ پورا ادب درونِ ذات کے کرب میں مبتلا تھا۔ اس لیے اب ضروری نہیں تھا کہ سب کسی ایک ہی بار یا ہوٹل میں ملیں۔ شہر بہت پھیل گیا تھا۔ جگہ جگہ وائن شاپس کھل گئے تھے۔ ہم کسی دوست کے گھر جمع ہو جاتے۔ کسی قریبی دکان سے شراب منگوالی جاتی۔ فون کرنے پر ہوٹل سے ''گزک'' بھی پہنچ جاتی۔ ہوم ڈیلیوری کا رواج ہو گیا تھا۔ اب ''مئے کدہ'' جانا ہی نہیں ہوتا تھا۔

لیکن وہ کیوں سوچ رہا ہے شہر کی تہذیب کے بارے میں شہر کے بارے میں؟ شاید اس لیے کہ ''مئے کدہ'' کو بند دیکھ کر اسے بڑا شاک لگا تھا۔ جیسے تہذیب کا ایک حصہ مر گیا ہو۔

میرا دوست مشیر جو بہتر زندگی کا خواب آنکھوں میں سجائے امریکہ منتقل ہو گیا تھا۔ بیس برس بعد امریکہ سے آیا۔ اپنا شہر چھوڑ کر باہر بس جانے والے ایک تو ناسٹالجک ہو جاتے ہیں دوسرے چیریٹی کرنے کے لیے اتاولے ہوتے ہیں۔ وہ ایسی ہر جگہ جانا چاہتا تھا جہاں بیس برس قبل ہم جایا کرتے تھے۔ ہر جگہ ساتھ چلتا بہت چیزوں کی تبدیلی پر اداس ہو جاتا۔ ظاہر ہے شہر بہت تیزی سے بدلا تھا اور اس پر گلوبلائزیشن کی پرچھائیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اسے اس لیے بھی مایوسی ہو رہی تھی کہ جو چیزیں وہاں ترقی یافتہ شکل میں دیکھ کر آیا ہے یہاں اسی کی نقل کی جا رہی ہے۔ شہروں کی شناخت تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ سب شہر ایک جیسے ہو رہے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ پرانی باقیات میں صرف ''مئے کدہ'' بچا ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہی عمارت، وہی انتظام، ویسے ہی کاونٹر، وہی مستقل گاہک۔۔۔ جو بوتل خرید کر حسب ضرورت پیتے ہیں اور بچی ہوئی شراب کی بوتل محفوظ کروا لیتے ہیں۔ اس بوتل سے ایک قطرہ بھی کم نہ ہوتا۔۔۔ دیانت داری ''مئے کدہ'' کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ مستقل گاہکوں کو یہاں بڑی اپنائیت محسوس ہوتی تھی۔ مشیر کے یہاں رہنے تک ہم روزانہ ''مئے کدہ'' جایا کرتے تھے۔ ایک خاص وقت تک شغل کرتے پھر اپنی راہ لیتے۔ پتہ نہیں مشیر کو مئے کدہ کی یاد کیوں نہیں آئی۔ امریکہ سے آنے کے بعد اس نے ایک بار بھی شراب کا نام نہیں لیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اسے ایک ایسی جگہ لے چلوں گا جو بالکل نہیں بدلی۔ دوسرے روز میں اسے ''مئے کدہ'' لے آیا۔

لیکن ''مئے کدہ'' بند تھا۔ برسوں پہلے ''مئے کدہ'' کی پیشانی پر ابھرے ہوئے لفظوں میں MAI KADA EST: 1904 اسی طرح موجود تھا نیچے اردو میں بھی ''مئے کدہ'' لکھا تھا۔ آس پاس دریافت کیا تو پتہ چلا کافی دنوں سے بند ہے۔ مجھے بڑا شاک لگا۔ اپنی بے خبری پر افسوس بھی ہوا۔ پتہ نہیں یہ سب کب اور کیسے ہوا؟ ایسا محسوس ہوا جیسے تہذیب کا ایک حصہ مر گیا ہو۔

پتہ نہیں سہراب کی صحت کیسی ہے؟ کاروبار میں نقصان تو نہیں ہوا؟ کسی ناگہانی مصیبت میں تو نہیں پھنس گیا؟

ہم لوگوں نے سہراب کے گھر کا پتہ چلایا۔ اس کے گھر پہنچے۔ قدیم پارسی طرز کا مکان تھا۔ ملازم نے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ہم دیوار پر ٹنگی تصویریں دیکھنے لگے۔ سہراب نے انتظار نہیں کروایا۔

''آپ'' وہ مجھے دیکھ کر چونک پڑا

''ہاں۔ اور انھیں پہچانا۔ مشیر!!''

''اوہ یاد آیا۔ آپ تو پورے انگریز ہو گئے۔''

''امریکہ میں جو رہتا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا

''آپ تو یہیں رہتے ہیں نا؟'' اس نے ہنس کر کہا

مجھے شرمندگی ہوئی۔

کہیے کیا لیں گے؟

''نہیں میں دن میں نہیں لیتا'' میں نے کہا ''اور مشیر تم؟''

''نہیں میں بھی نہیں لوں گا''

''کوئی تکلّف نہیں۔'' اس نے ملازم سے کچھ کہا۔ ''آپ لوگوں کو دیکھے آنکھیں ترس گئیں''

''میں شرمندہ ہوں۔''

''ہاں شہر بھی تو بہت پھیل گیا ہے۔''

''آپ کی صحت کیسی ہے۔''

''اچھا ہوں۔''

''بزنس میں نقصان ہوا؟'' میں نے راست پوچھ لیا

"نہیں۔"

"پھر مئے کدہ"۔؟"

"چھوڑیے کوئی کب تک بزنس کرتا رہے۔ آدمی کو آرام بھی کرنا چاہیے نا۔!"

اتنے میں ملازم ٹرے سجا کر لے آیا۔

"خاص فرانسیسی شراب ہے۔ اتنے دن بعد ملے ہیں، انکار نہ کیجیے"

ہم لوگ انکار نہ کر سکے۔ واقعی بڑی نفیس شراب تھی۔ دھیرے دھیرے سرور آنے لگا۔

"آپ بتایئے" مشیر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا "امریکہ میں کیسی گزر رہی ہے؟"

"پہلے جیسا تو نہیں ہے۔ یہاں کی گھٹن سے بھاگے کچھ دن تو اچھا لگا اب فضا پر حبس چھایا ہوا ہے۔ شک کے سائے میں زندگی گزارنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کا تجربہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔"

"سارا منظرنامہ ہی بدل گیا" میں نے کہا "وطن کے لیے جدوجہد، بین الاقوامی فیصلوں کی جارحانہ خلاف ورزیاں، دہشت گردی سب گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ ایک پوری قوم کو دہشت گردی کے جال میں پھنسا دیا گیا۔ ایک آگ سی لگی ہوئی ہے جس میں پتہ نہیں کون کون ہاتھ سینک رہا ہے۔ لیکن ملزم تیار ہے جرم کہیں بھی کسی نے کیا ہو۔ نشان زدہ ملزمین تیار ہیں۔ پولیس نے بھی ظلم کے سارے حربے آزما لیے۔ عدالتیں کبھی چھوڑتیں ہیں کبھی نہیں چھوڑتیں۔ اور بے وقوف قوم دلدل میں دھنستی ہی جارہی ہے۔"

"آپ تو جذباتی ہو گئے۔ تاریخ اپنے رنگ بدلتی رہتی ہے۔ دیکھیے نا ایران سے مسلمانوں نے ہم کو باہر کیا تھا۔ اسپین میں مسلمانوں کو باہر کیا گیا۔ اس ریاست کو ہم آصف جاہی سلطنت کے چرچے سن کر آئے تھے۔ ہمارے اجداد کو سالار جنگ اول نے مدعو کیا تھا۔ انتظامیہ میں ہمیں شامل کیا گیا۔ میر محبوب علی خان نے ہمیں خطابات سے نوازا تھا۔ نواب سہراب نواز جنگ، فرام جی جنگ، فریدون الملک وغیرہ وغیرہ فارسی یہاں کی سرکاری زبان تھی اور اردو عوامی زبان۔ بریانی، نوابوں اور موتیوں کا شہر۔!! گجراتی، مارواڑی، سندھی سبھی آبسے تھے۔ سب کو آزادی حاصل تھی سب نے اپنی اپنی عبادت گاہیں تعمیر کر لیں۔ شاہی خزانے سے مدد بھی ملتی تھی۔ ہمارے لیے تو بہت سازگار ماحول تھا۔ بڑا عجیب معاشرہ تھا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا "آپ کو یاد ہے؟ نہیں آپ تو بہت چھوٹے رہے ہوں گے۔ تھیٹر میں جب ہم فلم دیکھنے جاتے تو درمیان میں ایک سلائیڈ دکھائی جاتی۔ "وقفہ برائے نماز" لوگ جلدی جلدی فرض نماز پڑھ کر تھیٹر لوٹ آتے۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی والا معاملہ تھا۔"

"آپ کو شاہی دور پسند تھا؟"

"نہیں رواداری پسند تھی۔ معاشرے کا کھلا پن اچھا لگتا تھا۔ اب تو کٹر پن آ گیا ہے ہر قوم میں۔!"

"ہاں مسلمان بھی خدا حافظ کی جگہ اللہ حافظ اور نماز کے بجائے صلوٰۃ کہہ کر بہت خوش ہونے لگے ہیں" میں نے کہا۔

"مئے کدہ" آپ نے کیوں بند کر دیا؟" مشیر نے اچانک پوچھا۔

"ارے ہاں میں تو اصل بات ہی بھول گیا" میں نے چونک کر کہا۔

"چھوڑیے۔"

"نہیں بتایئے نا کیا ہوا تھا؟" میں نے اصرار کیا۔ کافی دیر تک وہ خاموش رہا۔ پھر دھیرے سے کہا

"مسلمانوں نے حکومت سے شکایت کی کہ "مئے کدہ" مسجد سے بہت قریب ہے جو خلاف قانون ہے" میں سناٹے میں آ گیا۔ تو یہ مسلمانوں کا کارنامہ ہے۔ میں نے سوچا۔

"لیکن مسجد اور مئے کدہ برسوں سے اسی جگہ ہیں پھر؟"

"وہ شاہی دور تھا۔ اب جمہوریت ہے۔!! مسلمان اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ اس کا خیال رکھنا حکومت کا فرض بھی تو ہے۔"

"مسلمان بھی بہت کٹر ہوتے جارہے ہیں" مشیر نے کہا۔ نشہ چڑھنے لگا تو ہم کٹر مسلمانوں کو نوازنے لگے۔

"مسلمان ہی کیوں" سہراب نے ہمیں روکا سب کا یہی حال ہے خود مجھے دیکھیے۔ میں نے شادی نہیں کی کیوں کہ پارسی غیر مذہب میں شادی نہیں کر سکتے۔ اس مذہبی شرط کی وجہ سے ہماری تعداد گھٹتی جارہی ہے۔ اکثر تاخیر سے شادی کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ اب پورے شہر میں بارہ سو پارسی رہ گئے ہیں۔"

"واقعی؟"

"ہاں دوسرا مسئلہ موت کا ہے۔ وہی پرانا دخمہ۔ برہنہ نعش کو جلتی دھوپ میں چھوڑ دیتے ہیں۔ اب تقریباً بیس برس سے گدھوں نے شہر کا رخ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اب مختلف الخیال گروپ بن گئے ہیں کوئی کہتا ہے نعش کو دفن کر دینا چاہیے۔ کوئی جلانے کے حق میں ہے۔ الکٹرک بھٹی کے بارے میں بھی غور کیا جارہا ہے۔ کچھ لوگ گدھوں کی Artificial Incimination کے خطوط پر افزائش کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ میں تو پرانے طریقے کو ترجیح دوں گا کہتے ہیں کوئی نیک آدمی مرتا ہے تو گدھ آتے ہیں۔ پتہ نہیں ہمارا کیا حشر ہوگا۔!! آپ کے عقیدے کے مطابق شراب بیچنے والا جہنمی ہوتا ہے نا؟" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ہاں۔۔۔اور شراب پینے والا بھی۔ اللہ معاف کرے۔!" میں نے کہا۔

ملازم نے آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔

"آپ نے تکلف کیوں کیا۔ اتنی اچھی شراب پینے کے بعد کھانے کی بالکل اشتہا نہیں ہے۔"

باقی صفحے پر ملاحظہ کیجیے

''خاک کا پُتلا''

حمد

زندگی کیا ہے ترے حسن کی رعنائی ہے
تیرے ہی قرب کی مخلوق تمنّائی ہے

ظلمتیں چیر کے جو روشنی ہم تک پہنچی
یہ کرم تیرا ہی دراصل توانائی ہے

خاک کا پُتلا کہاں اور کہاں اک انساں
تیری بخشش ہے کہ مٹی کی پذیرائی ہے

آئینہ خانے میں ہوں قید تو تیری وحدت
دل کے آئینے میں خاموشی در آئی ہے

زندگی ختم ہو تو ایک حیاتِ ابدی
جس کو مل جائے وہی تیرا شناسائی ہے

ہے ازل تا بہ ابد سارے زمانوں پہ محیط
لمحے لمحے میں تری انجمن آرائی ہے

صرف رنگوں میں نمایاں نہیں تیرا جلوہ
پھول میں خوشبو بھی تو نے ہی تو مہکائی ہے

کہکشاؤں کے تسلسل کا نظامِ عرفاںؔ
کتنا مربوط ترا حلقہ گیرائی ہے

غالب عرفان
(کراچی)

نعت رسول مقبولؐ

قدرت کے نورِ فکر کا فیضان آپؐ ہیں
مصرع ہے کائنات تو دیوان آپؐ ہیں

کرتا ہے جس کی وقت تلاوت بصد نیاز
وہ رحل کائنات پہ قرآن آپؐ ہیں

ہے کوئی ماورائے زبان و مکاں اگر
تو بعد ربِّ کعبہ وہ انسان آپؐ ہیں

تصنیف کی جو دست خدا نے کتاب زیست
اس کے ہر ایک باب کا عنوان آپؐ ہیں

نوع بشر رہے گی سدا جس کی زیر بار
انسان پر خدا کا وہ احسان آپؐ ہیں

قیصرؔ سمجھ سکا ہے فقط اس قدر حضورؐ
اللہ کے وجود کی پہچان آپؐ ہیں

قیصر نجفی
(کراچی)

قربانی

نندکشورو کرم
(دہلی، بھارت)

شہر سے کوئی دو میل دُور ایک نئی بستی وجود میں آئی تھی اور وہ لوگ جو کرایہ دے دے کر تنگ آچکے تھے یا جن کنبوں کے تین نسلوں کے افراد میں گزشتہ کئی دہوں سے اضافہ ہو جانے کی وجہ سے جگہ بہت کم پڑ رہی تھی انہوں نے اپنی تنگ و تاریک اور گنجان گلیوں سے نکل کر اس نئی بستی ''باغِ جنت'' کی جانب رُخ کیا تھا، حالانکہ وہاں جنت والی کوئی بات نہیں تھی۔ بس کچھ لوگوں نے شہر سے ڈیڑھ دو کلومیٹر کی دُوری پر کچھ کھیت خرید کر وہاں سوسو، دو دو سو گز کے پلاٹ کاٹ کر مذکورہ غیر قانونی کالونی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ جہاں کچھ افراد نے اپنے پرانے مکان بیچ کر یہاں پہلے مکان سے تین گنا زیادہ زمین پر مکان تعمیر کر لیا تھا اور کچھ روپیہ بچا لیا تھا۔ کچھ نے قرض لے کر اور بیوی کے زیور بیچ کر کسی نہ کسی طرح سے یہاں اپنے رہنے کے لئے زمین خرید کر اُس پر ایک دو کمرے تعمیر کر لئے تھے اور اس طرح یہ بستی آہستہ آہستہ آباد ہونے لگی تھی۔

چونکہ زمین سستی تھی لہذا کچھ معاشی طور پر کمزور لوگوں نے سستی جگہ دیکھ کر رہائشی مکان بنانے کی غرض سے بھی وہاں پلاٹ خرید لئے اور چار دیواری ڈال کر اندر ایک کمرہ اور رسوئی تعمیر کر کے وہاں رہنا شروع کر دیا تھا جہاں نہ بجلی دستیاب تھی اور نہ پانی کا کنکشن۔ رات کو وہ لوگ لیمپ جلا کر گزارا کرتے اور پانی پینے کے لئے سب نے گھروں میں اپنے اپنے پمپ لگوا رکھے تھے۔ کالونی میں اکثر پلاٹ خالی تھے کیونکہ کچھ پیسے والوں نے مستقبل قریب میں قیمتیں بڑھنے کی امید پر منافع کی غرض سے پلاٹ خرید کر انہیں خالی چھوڑ دیا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہاں نہ تو قاعدے کی گلیاں تھیں اور نہ رہنے کی سہولیات۔ اور موسم برسات میں تو پانی گھٹنوں گھٹنوں تک آجاتا اور اِکے دُکے تعمیر مکانوں تک پہنچنا بہت تکلیف دہ اور دشوار ہو جاتا۔ نہ مکان پوری طرح سے تعمیر ہوئے تھے اور نہ کوئی اشیائے ضرورت خریدنے کی سہولت۔ آمد و رفت بھی آسان نہ تھی۔

نریش نے بھی اپنے والد کے انتقال کے بعد بھائیوں سے الگ ہونے کے بعد دو سو گز زمین خرید کر یہاں رہنے کے قابل ایک مکان بنا لیا تھا۔ لیکن اس کا مکان چاروں طرف سے خالی تھا۔ اور اس اُوبڑ کھابڑ گلی میں جو مکان تھے بھی، وہ بھی ایک دوسرے سے دُور۔ جب کوئی نیا آدمی اس کالونی میں اپنا مکان بنانا شروع کرتا تو وہاں کے باشندوں کو بڑی خوشی ہوتی کہ چلو کوئی تو کالونی میں آیا۔ لیکن نریش کا مکان کوئی ایک سال تک بالکل تنہا کھڑا تھا نہ اُس کے دائیں کوئی مکان تھا نہ بائیں نہ عقب میں اور نہ بالمقابل۔ دن تو کسی طرح کٹ جاتا لیکن رات کو وہ اور اُس کی بیوی ایک نامعلوم ڈر سے خوفزدہ سے رہتے کہ آگے پیچھے کوئی سننے والا نہیں اگر رات کچھ ہو جائے تو......؟

لیکن ایک دن ایشور نے اُن کی بھی سُن لی۔ اور وہ صبح اُٹھے تو اُن کے سامنے واالے خالی پلاٹ کی بنیادیں کھودنے کے لئے چند مزدور جمع تھے۔ انہیں دیکھ کر نریش کو انتہائی خوشی ہوئی اور اُسنے جلدی سے اپنی بیوی کو آواز دی جو کہ رسوئی میں چائے بنانے میں مگن تھی۔ وہ بھی اُس کی آوز سے سمجھ گئی تھی کہ کوئی غیر معمولی بات ہے جو وہ اتنے زور سے اُسے بلا رہے ہیں۔ باہر آئی تو اُس نے سامنے مزدوروں کو بنیادیں کھودتے ہوئے دیکھا جس سے اسے بے پناہ خوشی ہوئی جیسے اُس کی لاٹری نکل آئی ہو۔

اس کے بعد نریش نے باہر جا کر بنیادیں کھدوا رہے صاحب سے دعا سلام کی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ جناب میرا نام نریش ہے اور یہ سامنے کا مکان میرا ہے۔''

اس پر پلاٹ کے مالک نے بڑے زور سے اُن سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔''جی میرا نام سید الطاف علی ہے۔ ہم بریلی کے رہنے والے ہیں۔ مَیں یہاں سیکرٹریٹ میں ملازم ہوں۔ کرائے پہ رہنے کی وجہ سے گزر اوقات مشکل ہوتی تھی۔ سوچا یہاں اپنے دو کمرے اور رسوئی کھڑی کر لیں۔ کم از کم کرائے سے تو نجات ملے گی۔

''جی بہت اچھا وچار ہے۔ نریش نے کہا آیئے سامنے کمرے میں بیٹھیں۔ آج دھوپ کچھ زیادہ ہی ہے۔''

پھر نریش الطاف علی کو گھر لے آئے اور بیٹھک میں بٹھا کر اندر سے شربت لے آئے اور پھر اُن میں کچھ ہی دنوں میں قربت اتنی بڑھ گئی کہ جب بھی الطاف علی صبح و شام تعمیر کی رفتار دیکھنے، مستریوں کو ہدایات دینے اور اُن کی ضرورت کا سامان بہم پہنچانے کے لئے آتے تو نریش سے بھی صلاح مشورہ ضرور کرتے۔ بلکہ کبھی کبھار تو نریش کو بھی خبر گیری اور نگرانی کے لئے بھی کہہ دیتے۔

اور جب مکان تعمیر ہو گیا تو الطاف علی کی فیملی بھی وہاں منتقل ہو گئی۔ فیملی کیا تھی میاں بیوی اور دو بچے۔ ایک چار سال کا لڑکا ارشاد اور ایک دو سالہ بیٹی نسرین۔ وہ لوگ بھی جلد ہی نریش کی فیملی سے گھل مل گئے کیونکہ نریش کا بیٹا سریش بھی کوئی چار پانچ سال کا تھا۔ اُن دونوں بچوں میں اچھی دوستی ہو گئی اور اتفاق سے ُن دونوں کا داخلہ بھی ایک ہی اسکول میں ہو گیا جس سے دونوں اکٹھے اسکول جاتے اور اکٹھے ہی واپس آتے۔ اور یہی نہیں دونوں میں اتنی قربت ہو گئی کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہ پاتے۔ کبھی ارشاد سریش کے گھر چلا جاتا تو کبھی سریش اُس کے گھر چلا جاتا۔

یہی نہیں دونوں کی بیویوں میں بھی گہری دوستی ہو گئی اور وہ بھی اپنے فرصت کے اوقات اکٹھے کاٹتیں۔ جب شوہر دفتر اور بچے اسکول چلے جاتے تو دونوں سہیلیاں اکٹھی بیٹھ کر اپنے دُکھ سُکھ بانٹتیں اور ایک دوسرے کو مشورے دیتیں۔ دونوں گھروں میں اتنی قربت ہو گئی کہ الگ الگ ہوتے بھی ایک ہی دکھائی دیتے۔ شام کو جب الطاف اور نریش واپس آتے تو وہ بھی کوشش کرتے کہ اکٹھے بیٹھ کر چائے پئیں۔ کبھی الطاف نریش کے ہاں آجاتے اور کبھی نریش الطاف کے

گھر۔ان دونوں نے مل کر کالونی کی بھی ایک سوسائٹی قائم کر لی تھی اور وہ ہر اتوار کو اکٹھے ہو کر کسی ایک کے گھر میٹنگ کرتے جس سے سبھی کالونی والوں میں میل جول بڑھنے کے ساتھ ساتھ کالونی کو سدھارنے کی کوششیں بھی کی جانے لگیں۔

الطاف علی پڑھے لکھے نوجوان تھے۔انہوں نے ایم اے تک تعلیم پائی تھی اور وہ مرکزی سرکار میں کسی ڈپٹی سیکرٹری کے پی اے تھے اور انگریزی میں خوب مہارت رکھتے تھے۔کالونی والوں نے انہیں اپنے ویلفیئر سوسائٹی کا سیکرٹری بنا دیا جس سے وہ سوسائٹی کے لئے وزیرِ اعلیٰ اور دوسرے افسران کو اپنی دشواریوں سے آگاہ کرنے لگے۔نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے وہاں بجلی فراہم کر دی گئی اور پھر پمپ کی جگہ انہیں کارپوریشن کا پانی بھی فراہم کر دیا گیا۔

پانی اور بجلی کے آنے سے کالونی کی قسمت ہی بدل گئی۔کالونی میں پلاٹوں کے ریٹ بڑھ گئے اور ساتھ ہی دھڑا دھڑ مکان بننے لگے اور ضرورت کی دکانیں بن جانے سے ہر چیز کالونی میں ہی دستیاب ہونے لگی۔

الطاف بڑے دیندار قسم کے انسان تھے۔وہ نماز روضے میں کبھی قضا نہ کرتے اور انسانوں کی خدمت کرنا سب سے بڑا ضروری کام سمجھتے تھے۔کالونی والے بھی جب بھی کوئی دقت ہوتی اُن کے پاس آتے اور اپنے مسائل اُن کے سامنے رکھتے اور وہ اس سلسلے میں اُن کی آواز افسران تک پہنچانے کے لئے کئی درخواستیں بھیجتے اور اُن کے کام سنور جاتے۔

ایک دن الطاف علی شام کو دفتر سے لوٹے تو اپنے ساتھ ایک دو تین ہفتے کا میمنا بھی لے آئے تاکہ چند ماہ بعد آنے والی بقرعید کے موقع پر اس کی قربانی دے کر ثواب کمائیں۔جوں ہی وہ میمنا لے کر داخل ہوئے اُن کا بیٹا رضا خوشی سے پاگل سا ہو گیا اور وہ کبھی اُسے گود میں اُٹھاتا کبھی اسے بسکٹ اور روٹی کھلاتا۔پھر وہ اُس ننھے سے بکرے کو اُٹھائے سریش کے گھر پہنچ گیا اور اپنے دوست سریش کو دکھا کر کہنے لگا۔''دیکھ سریش میرے ابا میرے لئے کیا لائے ہیں؟''

سریش حیرانی سے اُس ننھے منے میمنے کو دیکھنے لگا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ بھی اُس سے گھل مل گیا۔اور انہوں نے اُس کا نام 'سلطان' رکھ دیا۔وہ دونوں اُسے ''سلطان سلطان'' کہہ کر پکارتے تو وہ بھی کان کھڑے کر لیتا۔وہ دونوں سارا دن اُس سے کھیلتے رہتے ور اُس کی خوب خدمت کرتے۔کبھی اُسے گھاس کھلاتے تو کبھی بسکٹ اور ڈبل روٹی۔جس سے دیکھتے ہی دیکھتے میمنا بڑھتے بڑھتے ایک شہ زور بکرے کی شکل اختیار کرنے لگا۔حتیٰ کہ اس میں اتنی طاقت آ گئی کہ وہ ان دونوں سے سنبھالا بھی نہیں جاتا تھا۔اب وہ اُسے زیادہ تر باندھے رکھتے اور مختلف اشیا سے اُس کی خاطر تواضع کرتے۔وہ اُن کے لئے کھلونا بھی تھا اور اُن کا خاص مہمان اور ساتھی بھی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے 'سلطان' اتنا قدآور اور زورآور ہو گیا کہ جو بھی دیکھتا اُس کی تعریف کئے بغیر نہ رہتا۔الطاف علی اور اُن کی بیوی نسرین خوشی سے پھولے نہ سماتے کہ عید میں اس بکرے کی قربانی دے کر وہ ثواب کمائیں گے اور اپنی آخرت کو سنواریں گے۔مگر ننھا رضا اور سریش ان باتوں سے بے نیاز بکرے کی روٹی بسکٹ، ڈبل روٹی، سبز گھاس اور سبزیوں سے خوب خاطر تواضع کرنے اور اُس کے ارد گرد گھومنے اور کھیلنے میں منہمک رہتے۔

مگر ایک دن ایسا آیا کہ جب لوگ عید کی خوشیاں منا رہے تھے اور قربانی کے لئے اپنے پالے پوسے بکروں کی قربانی دینے کی تیاری کر رہے تھے تو اپنے بکرے 'سلطان' کی قربانی کی خبر سُن کر رضا اور سریش دونوں اُداس ہو گئے۔الطاف علی نے اپنے بیٹے رضا کو بہت سمجھایا کہ قربانی کرنا ہمارا مذہبی فریضہ ہے اور ہر مسلمان اپنی توفیق کے مطابق قربانی دیتا ہے مگر یہ بات اُن بچوں کو نہیں بھا رہی تھی اور وہ 'سلطان' کی قربانی کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے کیونکہ وہ بکرا انہیں اپنی جان سے بھی عزیز تھا۔مگر اُن کی ذرا بھی نہ چلی اور عید کی صبح الطاف حسین نے بکرے کو کھونٹے سے کھولا اور سب عزیزوں کی موجودگی میں اسے قربانی کے لئے قصاب کے پاس لے جانے لگے۔یہ دیکھ کر اُن بچوں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔''ابا اسے مت لے جاؤ۔ہم کس کے ساتھ کھیلیں گے۔وہ ہمارا دوست ہے......ہمارا ساتھی ہے مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور بکرے کو زبردستی کھینچتے ہوئے قصاب کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے اور بچے روتے روتے تھک کر گہری نیند سو گئے اور انہوں نے عید بھی نہ منائی۔

شام تک عید کی گہما گہمی بھی مدھم پڑ گئی مگر رضا پھر بھی نہ جاگا۔تب الطاف علی کمرے میں اُسے جگانے کے لئے پہنچے مگر کئی آوازیں دینے کے بعد بھی وہ نہ جاگا تو اُنہوں نے اُسے جھنجھوڑ کر جگایا اور بڑے پیار سے کہا۔

''بیٹا اُٹھو دیکھو ہم تمہارے لئے کیا لائے ہیں'' مگر رضا پھر بھی نہ اُٹھا تب انہوں نے کہا۔دیکھو باہر تمہارا دوست 'سلطان' تمہیں بُلا رہا ہے۔''

سلطان کا نام سنتے ہی وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر کی طرف دوڑ پڑا جہاں سلطان بندھا ہوا تھا۔وہ اُسے دیکھ کر اُس سے لپٹ گیا اور اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے اور اُس نے زور زور سے سریش کو آواز دی۔''سریش دیکھو سلطان واپس آ گیا ہے۔''

سلطان کا نام سُن کر سریش اور اُس کے گھر والے بھی دوڑے دوڑے آئے۔سریش بھی رضا کی طرح سلطان کے گلے مل کر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔اور جب دونوں اس کے ساتھ کھیل رہے تھے تو نریش نے الطاف سے اپنی حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔''الطاف بھائی یہ کیسے ہوا......؟''

الطاف علی نے بڑی سنجیدگی سے رُک رُک کر کہا۔''نریش بھائی مَیں بچوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر سلطان کو لئے قربانی کے لئے قصاب کے ہاں جا رہا تھا اور بچوں کے رونے اور چیخنے کی آوازیں میرا تعاقب کر رہی تھیں اور میرا ضمیر نہ مانا لہٰذا مَیں نے دوسرا بکرا قربانی کے لئے خریدا اور اُس کی قربانی دی اور سلطان کو واپس گھر لے آیا کیونکہ کسی کو ناخوش کر کے یا دل دُکھا کر کوئی قربانی دینا شاید اللہ کو بھی منظور نہیں۔''

سَنک

انل ٹھکّر
(دہلی، بھارت)

نہیں

کیوں؟

میں بے وقوف ہوں اس لیے۔

ایسا نہیں۔۔۔

جیسا بھی۔۔۔مگر یہ نہیں ہوگا۔

میں کمرا بُک کرا کے آیا ہوں۔

کینسل کرادو۔

مگر کیوں؟

خدارا بحث مت کیجیے۔

اتنا کہتے ہوئے میری بیوی کا گلا بھر آیا۔آواز تھرّ انے لگی۔آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے جنہیں پونچھتے ہوئے وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔میں اپنے غصّے کی لاش کو مجبوری کے کفن میں لپیٹے اپاہج کی طرح اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

میری بیوی سنکی ہے۔جب بھی اس پر دورہ پڑتا ہے تو میں اپاہج ہو جاتا ہوں اور جب اس کی مرضی کی بات پوری ہوجاتی ہے تو وہ سنک کا طوفان آ کر گزر جاتا ہے۔مگر میری اپاہج انا کی رگوں میں محبت کے خون کی گردش شروع ہونے میں کچھ دن لگ جاتے ہیں اور میں تب تک کڑھتا رہتا ہوں۔

ویسے وہ بُری نہیں ہے۔عام بیویوں کی طرح وہ بھی بعد خُدا کے شوہر کو درجۂ دوم کے تخت پر عزت و پیار سے بٹھا کر رکھتی ہے۔مگر جب بھی اس کو دورہ پڑتا ہے تو وہ تختِ دوم ببول کے کانٹوں کے مسند کی طرح میری رگ رگ میں چبھ کر میری چاہت کو چھلنی کر دیتا ہے۔ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔ان بائیس برسوں میں ہماری چاہت میں کبھی زوال نہیں آیا۔ہماری محبت کی لہریں ہمیشہ کاملِ حد کی جانب بڑھتی رہی ہیں اور نتیجتاً چاہت کے سمندر سے ہمیں دو موتی ملے ہیں۔پہلے لڑکی۔۔۔شبنم پھر لڑکا۔۔۔جاوید۔

کئی مرتبہ چاہا اسے کسی سائیکاٹرسٹ (Psychiatrist) کے پاس لے جاؤں۔اس کا علاج کراؤں تاکہ میری انا کو فالج نہ مار جائے مگر وہ ہے کہ سنتی ہی نہیں۔اسے کسی غیر مرد کے سامنے بے پردہ ہونا منظور نہیں۔غیر تو غیر میرے دوست احباب میں سے بھی کسی نے اس کی صورت نہیں دیکھی ہے۔کبھی کسی پارٹی یا جلسے میں جانے کی بات کروں تو ایک ہی جواب دے کر ٹال جاتی ہے۔میں اور میری ہر چیز آپ کے لیے ہے،نمائش کے لیے نہیں۔۔۔میں نہیں چلوں گی۔۔۔اگر میں غلطی سے بھی اصرار کروں تو اسے دورہ پڑ جاتا ہے۔۔۔

نہیں،وہ ان پڑھ،گنوار نہیں ہے۔کالج میں دوسال تعلیم حاصل کر چکی ہے۔اور ایسا بھی نہیں کہ وہ نقاب اور پردے کے ساتھ ہی پیدا ہوئی تھی۔کالج کے زمانے میں وہ بے پردہ رہی۔بعد نکاح کے ریسپشن میں بھی وہ بے پردہ تھی یہاں تک کہ شادی کے بعد چار چھ مہینوں تک اس کے پاس پہننے کو برقع نہیں تھا۔

ہماری شادی کو چار پانچ مہینے ہوئے تھے۔ابھی تو ہمارے دل کی دھڑکنوں نے ایک دوسرے کے لمس کو ٹھیک سے پہچانا بھی نہ تھا کہ ایک دن اس کے والد آ کر اسے بلا لے گئے۔وہ ایک مہینہ میکے میں رہی اور اس ایک مہینے میں اس نے جو خطوط مجھے لکھے وہ صفیہ جاں نثار اختر کے خطوط سے کسی طرح کم نہ تھے۔دراصل ان خطوط کے سہارے ہی میں اس کے بغیر ایک مہینہ جی سکا۔ایک دن بغیر اطلاع کیے اسے واپس لے آنے میں اپنے سسرال بیجاپور جا پہنچا۔میرے یکا یک پہنچنے سے میری بیوی کی طرح میرے سسرال کے کرائے کے دو کمرے بھی خوشی سے چہکنے لگے۔گھر کی آبادی کو پھیلانے میں میرے سسر صاحب نے کوئی کنجوسی نہیں برتی تھی۔لہٰذا میری بیوی کے بعد تین سالیاں اور چار سالے ہیں جو مجھے گھیر کر باتیں کرتے۔خیر سسر صاحب نے تھیلی اٹھائی اور گوشت لانے بازار کی طرف لپکے،ساس میری بیوی کو لے کر پکوان کی تیاری کرنے لگی مگر وہ باورچی خانے کی مصروفیت سے بچتے بچاتے کسی نہ کسی بہانے ہم جہاں بیٹھے تھے اس کمرے کا چکر لگا کر میری پلکوں میں مسکراہٹ کے موتی پرو جاتی۔

سسرال کی مہمان نوازی کے خمار میں میں نے دوپہر ڈھلتے ڈھلتے طے کر لیا کہ کم از کم ایک ہفتہ تو یہاں ڈیرہ ڈال دیا جائے مگر میرے سامنے ایک بڑا مسئلہ تھا رات کو سونے کا۔۔۔دو کمرے،اتنے افراد۔۔۔ان افراد سے کئی گنا زیادہ بیجاپور کے شاہی مچھر۔ان سب میں لمس کی جس پیاس کو لے کر میں یہاں آیا تھا اس کا کیا ہوگا!! بہرحال رات کی بات پر چھوڑ کر میں بیوی کو لے کر تاریخی مقامات دیکھنے کے بہانے گول گنبد کے باغ میں پہنچ گیا۔وہ باغ میں چہکتی رہی اور میں اس کی آواز کی موسیقی سے مدہوش ہوتا رہا۔

گول گنبد کے باغ سے متصل درگاہ کے دودھیا گنبد کے پیچھے زرد آفتاب اپنی دکان بڑھانے کی تیاری میں تھا۔میری بیوی نے باغ کے سبزے پر پھیلے اپنے آنچل کو سمیٹا اور ہم ٹہلتے ہوئے گھر کی جانب لوٹنے لگے۔راہ چلتے باتیں کرتے ہوئے اس کا شانہ بار بار میرے جسم کو چھونے لگا یا یوں کہیے کہ وہ قصداً اپنا جسم میرے جسم سے مس کرنے لگی۔جیسے شیرنی اپنا جسم شیر کے بدن سے رگڑ کر اسے اُکساتی ہے۔میں نے دیکھا،آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے۔

راہ چلتے ہوئے اتفاقاً میری نظر ایک بڑے بورڈ پر ٹک گئی۔میرے ذہن میں برق سی لہرائی۔میں نے محسوس کیا نفسی پیاس کے مسئلے کا حل مجھے مل گیا ہے۔میں نے فوراً اپنی بیوی کو سمجھانا شروع کیا وہ اپنی امّی کو راضی کر لے تو ہماری آگ پر لمس کی بارش ہو سکتی ہے۔پہلے تو وہ میری بات سُن کر سٹ پٹا گئی مگر میرے

بار بار اصرار کرنے پر، کچھ سوچ کر کہ میں خفا نہ ہو جاؤں اور کچھ تو اس کے جلتے بدن کو بھی ٹھنڈک کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ اپنی امّی کو منانے کے لیے راضی ہو گئی۔ میں جانتا تھا اس کی امّی کتنی بھی دقیانوسی ہوں انکار نہیں کریں گی۔ کیونکہ سسر داماد سے ڈرے نہ ڈرے مگر ساس تو نئے داماد سے سہمی سہمی رہتی ہے اور اگر ساس مان جائے تو بیچارے سسر کو کلین بولڈ ہی سمجھئے۔

کچھ اس طرح بے پناہ مسرتوں سے بھرپور رات ہم نے کچھ جاگتے کچھ جھپکیاں لیتے ہوئے ہوٹل میں گزاری۔ علیٰ الصّباح پرندوں نے چہکتے ہوئے پر تولے تو میری بیوی نے گھر جانے کی تیاری شروع کی۔ وہ گھر جلد پہنچنا چاہتی تھی تا کہ میرے پہنچنے تک ناشتہ تیار کر سکے۔ رات جس ٹانگے میں ہم دونوں آئے تھے اسی ٹانگے والے کو میں نے صبح آنے کو کہہ رکھا تھا۔ بیوی کے تیار ہوتے ہی میں نے باہر جا کر دیکھا۔ ٹانگے والا آ چکا تھا۔ میں نے ٹانگے میں بیوی کو گھر بھیج دیا۔

بیوی کے رخصت ہونے کے تقریباً دو گھنٹوں بعد میں چلتا ہوا اپنے سسرال پہنچا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے شبہ ہوا کہ شاید میں اپنے سسرال میں نہیں غلطی سے کسی تاریخی کھنڈر میں چلا آیا ہوں۔ گھر میں چاروں طرف سنّاٹا طاری تھا۔ میرے سالے، سالیاں کونے میں ایسے دبکے پڑے تھے جیسے کبوتر نے چیل کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سن لی ہو۔ سسر صاحب ایک طرف کرسی پر منہ لٹکائے بیڑی پی رہے تھے۔ مجھے یوں دیکھا گویا کسی نے مرنے کی خبر سنانے کے لیے انہیں میرا ہی انتظار تھا۔ ساس باورچی خانے کے دروازے سے لگ کر سر پر ہاتھ رکھے سسکیاں لے رہی تھی۔ نظر نہیں آئی اور بس میری بیوی بھی نظر نہیں آئی۔ خوف سے جیسے میرا دل دہل گیا۔ حوصلہ نہیں ہوا کہ کسی سے پوچھوں کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ اتنے میں میری بیوی پچھواڑے سے داخل ہو کر باورچی خانے سے ہوتی ہوئی سامنے کے کمرے میں آئی۔ وہ مجھے دیکھ کر رُکی اور بولی۔

آج ہمیں جانا ہے۔

کہاں؟

اپنے گھر۔

کیوں؟

بس۔

آخر۔۔۔

میرے چہرے پر پھیلی حیرت کی پروا کیے بغیر وہ کپڑے سوٹ کیس میں بھرنے لگی۔ میں نے اپنے سسر کی طرف دیکھا۔ انہوں نے کرسی سے رگڑ کر بیڑی بجھاتے ہوئے کہا۔

بہت سمجھایا، نہیں مان رہی۔

اُدھر ساس نے روتے ہوئے کہا۔

ہوٹل سے لوٹی ہے تب سے ایک ہی رٹ لگائے ہوئے ہے۔

ہوٹل سے؟ میں نے پوچھا۔

ہاں، ہم نے سوچا تم دونوں میں کوئی جھگڑا۔۔۔

نہیں نہیں۔ بالکل نہیں۔۔۔ میں نے اپنی صفائی میں ساس کی بات کو کاٹا ہی تھا کہ دوسری طرف سے میری بیوی چلائی۔

میں نے کہا نا، کچھ نہیں ہوا۔ آپ تیار ہو جائیے، ہمیں جانا ہے۔

آج ہی؟

ابھی۔

مگر۔۔۔

مگر وگر کچھ نہیں۔

گھر میں تم سے کسی نے کچھ کہا؟

نہیں۔

تو؟

خدارا بحث مت کرو۔

اتنا کہہ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گھبرائی ہوئی ہرنی کی طرح اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ ہم سب نے بہت سمجھایا۔ بہت پوچھا مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ وہ صرف اڑی رہی اپنی ضد پر۔

یہ اس کی سنک کا پہلا دورہ تھا اور پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ میں اپاہج ہو رہا ہوں۔ اس لیے میں نے جلدی سے اپنے خیمے کے کھونٹے نکالے، تنبو لپیٹا اور بیوی کو لے کر گھر سے باہر نکل رہا تھا کہ وہ جیسے ڈر کر پلٹی اور اپنی امّی سے کہا۔

امّی مجھے تمہارا برقع چاہیے۔

برقع!!امّی نے پوچھا

ہاں۔

میرے پاس تو پُرانا ہے۔

چلے گا۔

یہ ضد بھی اس نے پوری کی اور اس دن پہلی مرتبہ اس نے برقع پہنا جو آج بائیس برسوں کے بعد بھی اس کے جسم سے چپکا ہوا ہے۔ اور شاید اس کے مرنے تک اس کے وجود سے جڑا رہے گا۔ زندگی باوجود اس سنکی دوروں کے بھی بڑی خوشگوار گزر رہی تھی مگر آج کا دورہ بالکل اس دورۂ اوّل جیسا شدید ہے۔ وہی رونے کا انداز، ویسے ہی جسم کا کانپنا، وہی طرزِ گفتگو۔۔۔ خدا کا شکر ہے بچے گھر میں نہیں ہیں۔ ورنہ آج میں کہیں کا نہ رہتا۔ داماد آج ہی بمبئی سے آیا ہے۔ شبنم اور جاوید اس کے ساتھ فلم دیکھنے گئے ہیں۔

ویسے تو صبح سے ہی اس کا موڈ کچھ اکھڑا اکھڑا تو تھا ہی جب شبنم اپنے شوہر کے ساتھ بے پردہ بازار جانے لگی تو یہ اسے ٹوکتے ٹوکتے خاموش ہو گئی۔ مگر جب وہ بغیر برقع کے فلم دیکھنے جانے لگی تو اس نے اسے ٹوک ہی دیا۔ مگر داماد نے اس دقیانوسیت پر ہنستے ہوئے فقرہ کسا اور شبنم اور جاوید کو لے کر چل دیا۔ ان کے جانے کے بعد یہ شیرنی کی مانند بھڑ گئی۔ کیونکہ اس نے شروع سے ہی

بچوں کو ماں کی ممتا سے پالا پوسا ہے تو نہایت سخت گیری سے ان کے اخلاق کی نگرانی بھی کی ہے۔اس کو بپھرا دیکھ کر میں نے اپنی سلامتی اسی میں جانی کہ گھر سے نکل جاؤں اور میں بازار کی طرف چلا گیا اور لوٹتے ہوئے داماد اور بیٹی کے لیے ایک شاندار ہوٹل میں کمرہ بک کرا کے آیا۔کیونکہ میرے پاس کُل ڈیڑھ کمرے کا گھر ہے۔داماد بمبئی کا، پھر وہ پہلی بار سسرال آیا ہے۔خاطر داری میں کوئی کمی نہ رہ جائے ورنہ آج کل کے لونڈوں کی طرح کہیں اکھڑ گیا تو مشکل ہو جائے گی۔یہ سوچ کے میں نے ہوٹل میں کمرہ بک کرایا مگر میری بیوی پر یہ سنتے ہی دورہ پڑ گیا اور میں اپاہج ہو گیا۔

میں اپنے اپاہج جسم و جاں کو گھسیٹتا ہوا باورچی خانہ تک پہنچا تو محترمہ اندر سسکیاں لے رہی تھی۔ان کا جسم اب بھی کانپ رہا تھا۔میری سمجھ میں نہیں آیا کیا کروں؟ میں نے پاس میں پڑے اسٹول کو کھینچا اور اس پر بیٹھ کر سگریٹ جلائی اور پینے لگا۔سگریٹ پیتے ہوئے کتنا وقت گزر گیا اس کا خیال نہ رہا۔سگریٹ کا پیکٹ خالی ہوا تو خیال آیا کہ اسٹول پر بیٹھے میرا جسم اکڑ سا گیا ہے۔میں یہ سوچتے ہوئے اسٹول سے اٹھ کر اب تو کسی طرح خاموشی کی یہ دیوار گرانی ہوگی یہ سوچ کر اٹھا۔میں نے حوصلے کو مجتمع کر کے کچھ کہنا چاہا کہ میرے قدموں کے پاس بجتی بجاتی ایک پرچھائی وہاں جا کر رُکی جہاں میری بیوی مصالہ پیس رہی تھی۔میں نے پلٹ کر دیکھا میرے پیچھے شبنم ٹھہری ہوئی تھی۔وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔میں نے ہٹ کر اسے راستہ دیا وہ لپک کر اپنی امّی سے بولی۔

امّی آپ رہنے دیجیے میں مصالہ پیس دیتی ہوں۔

نہیں، پہلے کپڑے بدل کر ہاتھ منہ دھو لے پھر انور میاں کے لیے چائے بنا دے۔میں نے بیوی کی طرز گفتگو سے اندازہ لگا لیا کہ طوفان آ کر گزر نہیں گیا وہ ابھی بھی اس ڈیرھ کمرے کے گھر میں چھپا ہوا ہے۔

رات آٹھ بجنے کو تھے شبنم اور اس کی امّی آدھے کمرے میں شام سے ہی انور میاں کے لیے بریانی پکانے میں لگی ہوئی تھیں۔پورے کمرے میں یعنی ہمارے دیوانِ عام جیسی میری خواب گاہ میں انور میاں کسی فلمی رسالے کا مطالعہ کر رہے تھے۔جاوید پڑھائی میں مشغول تھا اور میں کرسی پر سکڑا ہوا مچھر مارتے ہوئے بار بار پہلو بدل رہا تھا۔جب بھی پہلو بدلتا میری جیب میں رکھی ہوٹل کے کمرے کی چابی بج اُٹھتی۔چابی کی آواز سُن کر دُولہے میاں رسالے میں چھپی ہوئی کسی فلمی اداکارہ کی تصویر سے نظریں ہٹا کر میری جیب کی جانب دیکھتے اور میں اس چابی کی موسیقی سُن کر خدا کو یاد کرتا۔

بعد کھانے کے گلی کے نکڑ پر پان کی دکان کے پاس سگریٹ پیتے ہوئے میں سوچنے لگا۔کسی شاعر نے پائل کو کوستے ہوئے نگوڑی کہا ہے۔کیونکہ اس کے بج اُٹھنے سے اس کی معشوقہ کا راز کُھل جاتا ہے یہ سب سوچتے ہوئے میرے چہرے پر درد بھری مسکراہٹ آ کر چلی گئی۔میں نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور گھر کی طرف چل دیا تو سامنے سے جاوید کو آتا دیکھا۔اس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں۔میں نے اسے روکا اور پوچھا۔

کہاں جا رہے ہو؟

دوست کے گھر پڑھائی کرنے۔

امّی سے پوچھا؟

جی۔

کب لوٹے گا؟

صبح۔

اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔میں سوچنے لگا کہ یہ سنک کا اونٹ نہ جانے آج کس کروٹ بیٹھے گا؟ کیونکہ جس عورت نے کبھی اپنے بچوں کو وقت بے وقت گھر سے باہر قدم رکھنے نہیں دیا آج اس نے جاوید کو دوست کے گھر جانے کی اجازت کیسے دے دی!!

میں تیز قدموں سے گھر پہنچا۔مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میری دیوانِ عام جیسی خواب گاہ مکمل سجی سجائی خواب گاہ بن گئی تھی۔میں یہ سب دیکھ کر کچھ سوچوں سمجھوں اُس سے قبل میری بیوی نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔کہاں چلے گئے تھے؟

جی۔۔۔سگریٹ۔۔۔میں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

اب چلیے۔دیر ہو رہی ہے۔۔۔اتنا کہتے ہوئے اس نے نقاب چہرے پر ڈالی اور گھر سے باہر نکل گئی۔میں بھی اس کے پیچھے ہولیا۔بھاگ کر گلی میں اس کے قریب پہنچ کر میں نے آہستہ سے پوچھا۔

ہم کہاں جا رہے ہیں؟

آپ نے کمرہ بک کرایا ہے نا؟۔۔۔اس نے چلتے ہوئے جواب دیا۔

یہ سنتے ہی میرا دماغ سُن پڑ گیا۔میرے سوچنے کی قوّت کُند پڑ گئی۔

اُس نے سامنے سے آنے والے آٹو کو روکا اور اس میں سوار ہو گئی۔میں بھی بیٹھ گیا۔آٹو ڈرائیور نے پوچھا کہاں جانا ہے؟ میری بیوی نے مجھے کہنی مار کر جواب دینے کا اشارہ کیا۔میں نے آٹو ڈرائیور کو ہوٹل کا نام بتا دیا۔

☆

آپ نے اس کی تو سُنی۔اب میری بھی ذرہ سن لیجیے۔

میں آٹو میں بیٹھی۔میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں مگر میں سسک نہیں سکتی کیوں کہ یہ گھر کی چار دیواری نہیں ہے۔بُلبل بھی رونے کے لیے قفس پسند کرتی ہے۔

آج سے کئی سال پہلے ایسی ہی ایک رات میں اور میرے شوہر بیجاپور میں ٹانگے پر سوار ہو کر ہوٹل گئے تھے۔اس رات میں ایک اجنبی خوشی میں ڈوبی جا رہی تھی۔اور آج ڈر سے کانپ رہی ہوں۔اُس رات میرا پورا وجود مسکرا رہا تھا اور آج میرا رواں رواں ماتم کُناں ہے۔اس رات میں مسرتوں کا خزانہ اپنے شوہر پر لٹانے جا رہی تھی۔آج میرے پاس مجبوریوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

باقی صفحہ ۸۸ پر ملاحظہ کیجیے

لمبا لیٹ

شموئل احمد
(پٹنہ، بھارت)

فرمان علی بیٹے قربان علی کی پیٹھ پر لمبا لیٹ گیا تھا۔اور بیٹا بھی قریب المرگ باپ کو اینیس Aeneas کی طرح پیٹھ پر لادے شہر شہر گھماتا تھا۔ بیٹے کی پیٹھ دکھتی نہیں تھی۔باپ کی قربت میں اس کے چہرے پر سورج کی روپہلی کرنوں کی تمازت ہوتی اور آنکھیں دوپہر کی طرح روشن.....

اور بیوی......

بیوی کی آنکھوں میں دھواں سا تیرتا۔وہ بڑبڑاتی۔''ایک ہی رہ گئے ہیں....جیسے اور بیٹے ہیں ہی نہیں.....

اور بیٹے بھی تھے۔ایک دبئی میں رہتا تھا مرجان علی اور دوسرا اسی شہر میں عثمان علی۔کہا نہیں جاسکتا کہ دبئی والا بیٹا کیا کرتا تھا۔ہوسکتا ہے جھاڑو لگاتا ہو لیکن جب گھر آتا تو رنگ ڈھنگ کمپنی کے مینیجر جیسے ہوتے۔وہ پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے کھڑا رہتا اور بیمار باپ کو اس طرح دیکھتا جیسے بستر پر پڑے کسی قریب المرگ کو اس کے دور کا رشتہ دار دیکھتا ہے۔وہ اپنی گفتگو میں انگریزی کے دو الفاظ بار بار دہراتا ''یس'' اور ''نو''۔گھر کے آنگن میں چہل قدمی کرتا اور سگار کے کش لگاتا۔

عثمان علی کے لیے آبائی مکان چھوٹا پڑتا تھا اور اس کی بیوی پھیل کر رہنا چاہتی تھی۔وہ کسی آئی ٹی کمپنی میں ملازم تھا اور الگ مکان میں رہتا تھا۔عثمان علی کی کمپنی باپ کو بھی طبّی امداد بہم پہنچاتی تھی جس کے لیئے اسپتال میں بھرتی ہونا لازمی تھا۔طبیعت کی ذراسی گرانی پر عثمان علی بزرگ باپ کو اسپتال میں بھرتی کرادیتا اور اضافہ کے ساتھ دوائیوں کا بل بنواتا۔لیکن قربان علی نہیں چاہتا تھا بار بار اسپتال کا منہ دیکھنا پڑے۔بوڑھے کو دل کا عارضہ نہیں تھا بلکہ پھیپھڑہ کمزور تھا جس سے سانس لینے میں اکثر تکلیف ہوتی تھی۔قربان علی نے آکسیجن ماسک خرید کر دیا تھا لیکن ڈاکٹر نے پھیپھڑے کی ورزش بھی بتائی تھی۔اس طرح کی ورزش ایک دستی مشین سے عمل میں آتی تھی جو قربان علی نے فوراً خرید لی۔بوڑھا مشین میں لگی نلکی منہ میں لے کر متواتر الٹی سانسیں لیتا اور پھیپھڑے میں ہوا بھرتا اور خارج کرتا۔پھیپھڑے کی ورزش سے بوڑھے کو راحت ملی اور قربان علی خوش ہوا لیکن بیوی کی آنکھوں میں دھواں سا تیر گیا۔اس نے مشین کی قیمت کا دل ہی دل میں اندازہ لگایا اور سوچنے پر مجبور ہوئی کہ اس کی کلائی گھڑی سے سونی ہے۔ اس دن کھانا دیر سے بنا تو قربان علی نے وجہ پوچھی۔وہ جیسے اس سوال کا انتظار کر رہی تھی۔ٹھنک کر بولی کہ اس کی کلائی پر گھڑی نہیں بندھی ہے کہ وقت دیکھ کر کام کرے ۔قربان علی اسے بازار لے گیا۔بیوی نے گولڈن چین والی گھڑی خریدی۔

قربان علی نے اور چیزیں بھی خریدیں۔مثلاً شوگر چیک کرنے کے لیے گلوکومیٹر، بلڈ پریشر دیکھنے کا آلہ،۔بلغم نکالنے کا آلہ، اسٹیم لینے کی مشین، اور بیوی ہر بار ٹھنکی۔اسے ہر بار کمی کا احساس ہوا۔کبھی کان کی بالیاں بدرنگ لگیں، کبھی لگا ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں..لیکن جب قربان علی نے آکسیجن کی مشین اور گیس سلینڈر خریدا تو بیوی بستر پر پٹ ہوگئی۔''کوئی پچاس ہزار کا ہوگا'' اور اس کو احساس ہوا کہ اس کے پاس زیور کی کمی ہے۔اسے دبئی والی بھابی یاد آگئی۔وہ جب دبئی سے آتی تو سونے کے بسکٹ ایک بیگ سے نکال کر دوسرے بیگ میں رکھتی اور مرجان علی سگار کے کش لگاتا۔

بیوی دو دن تک پٹ پڑی رہی کہ سر میں درد ہے۔قربان علی نے سمجھا مائگرین ہوگیا ہے۔اس بیچ کام والی بھی نہیں آئی۔قربان علی نے برتن دھوئے۔ کھانا ہوٹل سے آیا۔لیکن بیوی نے بوڑھے کے لیے پرہیزی گھر میں بنائی۔قربان علی خوش ہوا کہ خیال رکھتی ہے اور بیوی ٹھنکی ''چوڑیاں گھس گئی ہیں.....''

قربان علی اسے بازار لے گیا۔اس نے جڑاو کنگن خریدے۔

قربان علی نے گھر کو ہی جیسے پنج ستارہ کلینک بنادیا تھا۔مریض کی سہولت کی وہ تمام چیزیں گھر میں تھیں جو اسپتال میں دستیاب ہوتی ہیں۔وہ صبح صبح شوگر چیک کرتا اور بلڈ پریشر ناپتا۔ناک اگر نزلے سے بند رہتی تو سر کو ڈھک کر مشین سے بھاپ دیتا۔پھیپھڑے کی دستی مشین سے سانس کی ورزش کراتا۔بوڑھے کو اکثر کھانسی کا دورہ اٹھتا تھا۔کھانستے کھانستے اس کی آنکھیں کٹورے سے ابلنے لگتیں۔وہ بہت سا بلغم اگلتا جسے فرمان علی اپنی ہتھیلی پر روکتا۔ہاتھ دھو کر آتا تو دیر تک پیٹھ سہلاتا اور پاؤں دباتا۔لیکن اب اس نے بلغم نکالنے کی مشین خرید لی تھی۔مشین کی کٹوری منہ میں لگادیتا اور ربر کی نلکی سے جڑے بلاڈر کو آہستہ آہستہ پمپ کرتا۔بلغم منہ سے نکل کر کٹوری میں جمع ہونے لگتا۔

ایک بار بوڑھے نے پیٹ میں درد بتایا۔درد شدّت کا نہیں تھا۔اور بلّی کی نظر چھیچھڑے پر ہوتی ہے۔عثمان علی باپ کو اسپتال میں بھرتی کرنے کے درپے ہوا۔قربان علی کو لگا معمولی سا درد ہے۔دوا سے ٹھیک ہوسکتا ہے۔ڈاکٹر سے فون پر بات کی۔ڈاکٹر نے فون پر ہی دوا تجویز کی اور کھانے میں پرہیز بتایا۔بوڑھے کو دوا سے افاقہ ہوا اور اسپتال میں بھرتی ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ عثمان علی ناراض ہوا اور قربان علی کی بیوی مسکرائی۔

اور وہ مسکراتی تھی اور اسپتال کے منظر نامے کو دوربین سے دیکھتی تھی کہ دھان کوٹے قربان علی اور کوٹھی بھرے عثمان علی۔

لیکن قربان علی کو اس بات کی فکر نہیں تھی کہ کتنا دھان کوٹھی میں گیا اور کتنا اس کے کھاتے میں آیا۔وہ اپنے فعل سے مطلب رکھتا تھا اور باپ کے علاج پر بے دریغ خرچ کرتا تھا۔بوڑھے باپ کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانا اس کی زندگی کا نصب العین تھا۔اور باپ کبھی سرہانے اُٹھ کر بیٹھنا چاہتا تو پیچھے تکیہ لگادیتا۔تکیہ لگا کر چلا نہیں جاتا تھا۔دور کھڑا دیکھتا اور خوش ہوتا کہ باپ کو آرام مل رہا ہے۔بوڑھے کو کلین شیو رہنے کی عادت تھی۔قربان علی روز اس کی داڑھی بناتا ناخن کترتا،غسل دیتا۔بھیگے جسم کو تولیئے سے خشک کرتے ہوئے باپ کی آنکھوں میں مسکراتے ہوئے

جھانکتا....اور وہ لمحات مقدّس ترین لمحات ہوتے۔اس وقت کوئی باپ نہیں ہوتا۔ کوئی بیٹا نہیں ہوتا۔دوانسان ہوتے....ان کے درمیان محبت ہوتی.....الوہی بندھن ہوتا....فرمان علی کے چہرے پر ایک سکون سا ہوتا قربان علی کا چہرہ خوشی سے دمک رہا ہوتا..دونوں کی آنکھیں ان دیکھی چمک سے خیرہ ہوتیں....اور دونوں ہونٹوں پر دھوپ جیسی مسکراہٹ لیئے ایک دوسرے کو نہار رہے ہوتے....انبسات کی بے کراں لہروں میں ڈوب رہے ہوتے.....ابھر رہے ہوتے.....

دوبئی والی بھابی سال میں ایک بار آتی تھی۔اس بار آئی تو اس سے پہلے کہ سونے کے بسکٹ اس بیگ سے نکال کر اُس بیگ میں رکھتی نند نے جڑاؤ کنگن پہن لیئے اور گلے میں سچّے موتیوں کی مالا بھی ڈالی جوان دنوں لی تھی جب قربان علی نے باپ کے لیئے اسٹیم لینے والی مشین خریدی تھی۔

مرجان علی باپ کے سرہانے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ایک نظر ڈالی۔

''نو....نو....بہت کمزور ہو گئے ہیں۔''

قربان علی کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔کمزور ہو گئے ہیں تو اور احساس دلاو...؟ بیوی کو بھی برا لگا۔مرجان علی باپ کے لیئے کوٹ بھی لایا تھا قربان علی خوش ہوا لیکن بیوی نے محدّب شیشے سے دیکھا۔کوٹ کا ایک بٹن دوسرے رنگ کا تھا۔اس نے کوٹ الماری میں سینت دیا۔''ہمارے اتنے برے دن بھی نہیں آگئے ہیں کہ بزرگ باپ کو اُترن پہنائیں''۔قربان علی کو بھی برا لگا۔مرجان علی چلا گیا تو اس نے نیا کوٹ خریدا۔

کسی بوڑھے کے پاس بیٹھ جاؤ تو وہ ماضی میں چلا جاتا ہے۔قربان علی سے فرمان علی کی والہانہ باتیں ہوتی تھیں لیکن بزرگ نے کبھی اپنی عمر گذشتہ کی کتاب نہیں کھولی۔وہ مصری صنمیات کے قصّے سناتا اور کبھی بزرگان دین کے۔طوفان نوح کے ذکر میں یہ بات ہمیشہ دہراتا کہ ایک عظیم سیلاب کا تذکرہ ہر قوم میں ملتا ہے۔قربان علی بہت انہماک سے سنتا۔کبھی کبھی سوال بھی کرتا۔وہ ایسے سوال بھی کرتا جس کا جواب اس کو معلوم ہوتا۔اصل میں اس نے محسوس کیا تھا کہ سوال پوچھنے پر باپ کو خوشی ہوتی ہے۔لیکن ادھر کچھ دنوں سے گفتگو کا موضوع بدل گیا تھا۔بوڑھا موت کے قصّے بیان کرنے لگا تھا۔امام غزالی کے بارے میں بتایا کہ ان کو موت کی آگاہی ہو گئی تھی۔پانی منگا کر وضو کیا،نماز پڑھی اور چادر تان کر سو گئے تو پھر نہیں اٹھے،اس نے ایک جسم سے دوسرے جسم میں جان منتقل کرنے کے بارے بھی بتایا کہ کس طرح جوگی اور صوفیائے کرام لمس کے ذریعہ کسی بیمار کی رگوں میں جان منتقل کرتے ہیں۔لاہری مہاشئے کی مثال دی کہ وہ جسم لطیف میں چلتے تھے اور پران ٹرانسفر کرتے تھے۔رانی کھیت میں اپنے حاکم کی بیمار بیوی کو اسی طرح صحت یاب کیا تھا۔پھر اس موضوع کی مزید وضاحت کی تھی کہ تم جب کسی کو چھوتے ہو تو لمس ایک رابطہ قائم کرتا ہے۔اس رابطے میں ان دیکھی قوت بھی شامل ہوتی ہے۔جس طرح دو تاروں کو جوڑنے سے ان میں بجلی رواں ہو سکتی ہے اسی طرح لمس کے ذریعے ایک سے دوسرے جسم میں توانائی بحال کی جا سکتی ہے۔یہ اس بات پر منحصر ہے کہ تمہارے جذبات میں شدّت اور روح میں طاقت کتنی ہے۔پھر بوڑھے نے بابر بادشاہ کی مثال پیش کی تھی۔وہ یہ کہ ہمایوں جب بیمار پڑا اور دوا بے کار گئی تو بابر نے بیمار ہمایوں کی چارپائی کا طواف کیا اور دعا مانگی کہ اس کی زندگی ہمایوں کو مل جائے۔ہمایوں اچھا ہونے لگا اور بابر بیمار رہنے لگا۔ادھر ہمایوں مکمّل طور پر صحت یاب ہوا ادھر بابر نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔لیکن بوڑھے نے یہ بھی بتایا کہ اس واقعہ کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔پھر بھی اس کا مثبت پہلو ہے۔اس کا ذکر ہوتے رہنا چاہیے۔وہ واقعہ جو مثبت اقدار کا حامل ہے وقت کے ساتھ تاریخ میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔

فرمان علی کو بھی موت کے سپنے آنے لگے۔وہ عجیب وغریب خواب دیکھنے لگا۔ایک بار دیکھا کہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے اور ایک قبرستان سے گذر رہا ہے۔اچانک ایک نوجوان سامنے آ گیا۔وہ نوجوان اس کا باپ تھا۔اس نے خواب فرمان علی کو سنایا تو وہ ہنسنے لگا۔اس نے فرائڈ اور یونگ کی بابت بتایا کہ فرائڈ نے خواب کو لاشعور تک پہنچنے کی شاہراہ بتایا ہے اور یونگ نے خواب کے تحیّر آمیز تجزیے کیئے ہیں۔اور تب اس نے بیٹے کے خواب کا تجزیہ کیا کہ اس کے لاشعور میں یہ بات پنپ رہی ہے کہ باپ کو مرنا نہیں چاہیئے،اس لیے اس کو جوان دیکھا اور خود کو بوڑھا۔یعنی اس کے بڑھاپے تک بھی باپ تنومند رہے۔پھر اس نے سرگوشی کی کہ موت سے کس کو رستگاری ہے...؟

اگلے مہینے شہر میں پستک میلہ لگا تو بوڑھا مچل گیا کہ میلہ گھومے گا۔ بیٹے نے گھبراہٹ سی محسوس کی۔اصل میں بوڑھے کی ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔وہ واکر کی مدد سے کسی طرح بستر سے کھانے کی میز تک کی دوری طے کرتا تھا۔پھر بھی قربان علی وقتاً فوقتاً باپ کو تفریح گاہوں اور جلسوں میں لے جایا کرتا کہ معذوری کا کوئی احساس نہ ہو۔میلے میں گرد بہت اڑتی تھی۔پھیپھڑے میں انفکشن کا خطرہ تھا۔یہی وہ بات تھی کہ قربان علی کو میلہ جانے میں قدرے تامّل تھا۔لیکن باپ بہ ضد تھا۔آخر اس نے وہیل چیئر نکالی۔بیوی بھی ساتھ ہو لی۔دونوں نے مل کر بوڑھے کو وہیل چیئر پر بٹھایا۔بیوی چیئر چلاتی ہوئی بوڑھے کو کار تک لائی۔کار میں واکر رکھا۔بیگ میں پانی اور جوس پیک رکھا۔قربان علی نے باپ کو گود میں اٹھا کر کار کی اگلی سیٹ پر بٹھایا۔

میلہ پہنچ کر بزرگ خوش ہوا۔وہ اسٹال پر طائرانہ سی نظر ڈالتا تو قربان علی کتاب کا نام پوچھتا لیکن باپ اگلے اسٹال کی طرف اشارہ کرتا....پھر اگلے اسٹال کی طرف.....کئی اسٹال جھانکنے کے بعد بھی بوڑھے نے کوئی کتاب پسند نہیں کی۔قربان علی کو حیرانی تھی کہ آخر تلاش کس چیز کی ہے؟ تب بوڑھے کی آنکھیں چمکیں۔اس نے سرگوشیوں کے انداز میں کہا کہ تم کسی کتاب کو ڈھونڈتے ہو تو کتاب بھی تمہیں اسی شدّت سے ڈھونڈتی ہے اور تمہیں کھینچ کر اپنے پاس لے آتی ہے۔پھر ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ گیلری کے آخیر میں کچھ فاصلے پر ایک چھوٹے سے اسٹال کی طرف اشارہ کیا کہ کتاب وہاں بلا رہی ہے۔بہو نے وہیل چیئر کا رخ ادھر موڑ دیا۔اسٹال پر آتے ہی اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی اور

اچانک بچّے کی طرح خوش ہو کر بولا۔''وہ دیکھو...ابن خلدون کا مقدمہ'' قربان علی کا چہرہ حیرت و مسرّت سے کھل گیا۔ بیوی حیران ہوئی لیکن متاثر نہیں ہوئی۔اس نے سوچا اسٹال پر پبلشر کا نام پڑھ کر اندازہ لگایا ہوگا۔

کتاب خرید کر وہ فوڈ اسٹال پر آئے۔ بیٹے نے برگر لیا، بیوی نے گول گپّے کھائے اور باپ نے جوس پیا جو بہو گھر سے لے کر آئی تھی۔واپسی میں قربان علی نے اپنے لیئے ڈائری خریدی، بیوی نے اسلامیہ بک ڈپو سے کچھ تغرے خریدے اور ایک نعتیہ سی ڈی لی۔

میلے سے آکر بوڑھے کو کھانسی رہنے لگی۔ ایک دن سینے میں درد ہوا۔قربان علی نے اسے اسپتال میں بھرتی کر دیا۔ڈاکٹر نے پھیپھڑے میں ورم بتایا۔چار دنوں تک وہ آئی سی یو میں رہا۔قربان علی نے بھی اسپتال میں ڈیرہ جمایا۔ اس کو الگ سے اٹینڈنٹ روم مل گیا تھا۔ بیوی گھر سے ٹفن لے کر آتی تھی۔عثمان مزاج پرسی کے لیئے آتا تھا۔کبھی صبح آتا کبھی شام۔ڈاکٹروں سے بات کرتا۔ چارٹ پر دوائیوں کی انٹری چیک کرتا اور چلا جاتا۔لیکن قربان علی دن بھر سرہانے بیٹھا رہتا۔آنکھوں میں تفکّر کے بادل گھر آئے تھے،....چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا بیوی نے قربان علی کو اس سے پہلے اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا۔وہ دلاسہ دیتی کہ اللہ کارساز ہے،سب ٹھیک ہو جائے گا۔

فرمان علی چار دنوں بعد صبح قریب گیارہ بجے اسپتال سے ڈسچارج ہوا۔اس بار بل ایک لاکھ چوالیس ہزار کا بنا تھا۔عثمان علی بہت خوش تھا۔دھان کوٹے قربان علی اور کوٹھی....اور بیوی کی آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔اس نے ڈسچارج سمری سے فرمان علی کی آئی ڈی چپکے سے نکال لی۔عثمان علی کو پتہ نہیں چلا کہ بل کے ساتھ آئی ڈی نہیں ہے۔

فرمان علی اسپتال سے گھر آیا تو کمزور ہو گیا تھا۔اس کی ٹانگوں کا درد بڑھ گیا تھا۔واکر سے چلنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔اب کھانا بستر پر ہی کھانے لگا۔ باتھ روم تک کسی طرح چلا جاتا لیکن غسل کرنا پسند نہیں کرتا تھا،غسل کے عمل میں جانفشانی تھی۔اس کا داڑھی بنانا بند نہیں ہوا تھا۔قربان علی بھیگے کپڑے سے جسم پونچھ دیتا اور سر پر مالش کر دیتا۔داڑھی بناتا کریم لگاتا بالوں میں کنگھی کرتا اور باپ ہنستی ہوئی آنکھوں سے بیٹے کو دیکھتا۔اس کا جسم کمزور ہو گیا تھا لیکن چہرے پر نور تھا۔وہ کمزور سے کمزور تر ہوتا گیا لیکن قربان علی کو باپ نہ بوڑھا نظر آیا نہ کمزور۔وہ بس خدمت میں لگا تھا اور زیادہ سے زیادہ وقت دے رہا تھا اور بیوی بڑبڑاتی.... جیسے ایک یہی رہ گئے ہیں...اور بیوی کو لگتا بوڑھا باپ مکڑی کا جالہ ہے جس میں بیٹا مکھی کی طرح پھنسا ہوا ہے۔

پھیپھڑے کی ورزش اب رک گئی تھی۔وہ الٹی سانس نہیں لے پاتا تھا۔آکسیجن سلینڈر کا ماسک لگا کر زور زور سے سانس لیتا۔بوڑھا بستر سے لگ گیا۔کپڑے گیلے رہنے لگے۔بیوی بستر بدل دیتی۔کپڑے قربان علی دھوتا۔باپ کو جب ہلکا ہلکا بخار بھی رہنے لگا تو بیٹے کو تشویش ہوئی۔خون جانچ کے بعد ڈاکٹر نے کچھ دوائیوں کے نام لکھے۔لیکن دوائیاں کام نہیں کر رہی تھیں اور بخار تھا کہ اتر نہیں رہا تھا۔فرمان علی کی قوت مدافعت جیسے ختم ہو گئی تھی۔ٹسٹ کی ایک دوا رہ گئی تھی جو کہیں مل نہیں رہی تھی۔یہ دوا امید کی کرن تھی۔قربان علی کو یقین تھا کہ اس کے استعمال سے بخار اتر جائے گا۔اس نے انٹرنیٹ پر بھی کھوج کی۔آخر گوگل سرچ سے معلوم ہوا کہ دوا کرشنا فارمسی ممبئی میں دستیاب ہے قربان علی نے صبح صبح ممبئی کی فلائٹ پکڑی اور رات تک دوا لے کر آ گیا۔

دوا کا کچھ اثر ہوا۔بخار کم ہو گیا لیکن ایک دم نہیں اترا۔قربان علی کو کچھ راحت ملی۔اس دن عثمان علی بھی پہنچے۔آتے ہی مژدہ سنایا کہ ایک لاکھ چوالیس ہزار کا بل منسوخ ہو گیا۔بل کے ساتھ آئی ڈی نہیں تھی۔قربان علی سے الجھ گیا کہ ڈسچارج سمری کے ساتھ آئی ڈی کیوں نہ چیک کی۔قربان علی کو ہوش کہاں تھا۔وہ تو باپ کے وائرل بخار میں الجھا پڑا تھا۔اچانک باپ کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔قربان علی دوڑ کر پہنچا۔بلغم حلق میں پھنس گیا تھا۔باپ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ بلغم اگل نہیں پا رہا تھا۔اس کی آنکھیں ابلنے لگیں اور سانسیں اکھڑنے لگیں۔ قربان علی گھبرا گیا۔اس کو لگا باپ کا دم سینے میں گھٹ جائے گا۔اس کے حلق میں اپنا ہاتھ ڈالا اور پھنسے ہوئے بلغم کو صاف کیا۔ایسا متواتر دو تین بار کیا تو باپ کی سانسیں ہموار ہوئیں۔عثمان علی کھڑا دیکھتا رہا۔قربان علی نے ہاتھ دھوئے۔

باپ کا بخار تو اتر گیا لیکن بیٹے پر چڑھ گیا۔شام تک بخار بہت تیز ہو گیا۔بیوی گھبرا گئی۔اس نے فیملی ڈاکٹر کو فون کیا۔اس نے آکر دیکھا اور دوائیاں لکھ دیں۔کوئی افاقہ نہیں ہوا۔فرمان علی کا بدن جیسے آگ میں جل رہا تھا۔بیوی رات بھر سرہانے بیٹھی رہی۔صبح ڈاکٹر پھر آیا۔خون کی بھی جانچ ہوئی لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ مرض کیا ہے۔ڈاکٹر کو تشویش ہوئی۔قربان علی کوما میں چلا گیا۔

ادھر باپ بھی بستر مرگ پر پڑا تھا۔اس کا پرسان حال کوئی نہیں تھا۔ بیوی کا روتے روتے برا حال تھا۔بوڑھے کے کانوں میں سب کی آواز جا رہی تھی لیکن کوئی اسے کچھ بتا نہیں رہا تھا۔وہ چپ چاپ بستر پر پڑا چھت کو گھور رہا تھا۔رات تک بھی قربان علی کو ہوش نہیں آیا۔بیوی سجدے میں چلی گئی۔

آدھی رات کے قریب کمرے میں کھٹ کھٹ کی آواز گونجی۔بوڑھا واکر گھسیٹتا ہوا قربان علی کے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔بیوی ایک طرف کرسی پر گٹھری بنی اونگھتے اونگھتے سو گئی تھی۔باپ کسی طرح بیٹے کے بستر تک پہنچا اور سرہانے بیٹھ گیا۔اس کا چہرہ پرسکون تھا۔اس نے ایک بار دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھائے۔دعا مانگی۔بیٹے کے چہرے کا دونوں ہاتھوں سے کٹورا سا بنایا۔ پیشانی چومی۔پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلانے لگا۔وہ اس کے سارے جسم پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر بیٹے کے جسم پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

صبح بیوی کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا فرمان علی بیٹے پر لمبا بے جان پڑا تھا اور بیٹا بھیگی آنکھوں سے چھت کو گھور رہا تھا۔

نقلی چہرے

رخسانہ صولت
(اسلام آباد)

جینی آج تمہارے آنکھیں سرخ ہیں۔ بے موسم برسات ہونے لگی ہے کیا......! جمی نے کہنے کو تو کہہ دیا......مگر پھر سوچنے لگا۔ بس اب شروع ہوگئی......! جنگ......! اور پھر اگر واقعی ایسا ہوگیا تو پھر حالات بس میں نہیں رہیں گے......! جمی کو منانا بھی بہت مشکل کام ہے......! اور اس کو جب تک منا نہ لوں......تو پھر رات بھر آنکھیں نیند کی راہ تکتی رہیں گی......!

مگر ...... چند لمحے گزرے اور پھر چند منٹ...... اجنبی کی زبان خاموشی کا گوند چکھ چکی تھی......! جیمی نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا......! ساکت سمندر میں اسے اپنا ہی عکس نظر آیا۔

جان! خیریت تو ہے کچھ بتاؤ......! ٹکراؤ تو نہیں ہوا تمہارا......!

اس کے لہجے میں اضطراب کے سنگریزے چھپے ہوئے تھے۔ جیمی ......! یہ کیسی زندگی ہے......! میں تو تنگ آ چکی ہوں اس لعنت کے طوق کو گلے میں ڈالے ڈالے میں خود ایک لعنت بن گئی ہوں......! تم سے ایک مشورہ کرنا چاہتی ہوں......! کچھ بولو......! درست مشورہ دوں گے......!

خاموشیوں کے سمندر سے طوفان اٹھنے لگا۔ جوار بھاٹے نے حالات کے گرداب میں اس کا وجود اس طرح پھنسا دیا...... کہ وہ ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح لہروں کے مرکز پر ڈولنے لگی۔

جینی! گھبراؤ مت......میں شاید تمہاری کچھ مدد کرسکوں!

اوہ تم......! طنز کے تیر اس کے ہونٹوں کی کمانی سے نکلے......اور جیمی کے دل میں پیوست ہوگئے......!

''تم! تم نے غلط سمجھا جینی! میں تم سے نفرت نہیں کرتا......! میں تمہیں کمزور بھی نہیں سمجھتا......! جو تم سے ہمدردی کروں......! میں تمہارا دوست ہوں اور یہ دوستی کا تقاضہ ہے کہ اگر تم کسی مشکل میں ہو تو تمہاری مدد کروں۔ ہاں! جیمی! میں اتنی بچی بھی نہیں......! کہ تمہیں وضاحتوں کی ضرورت درپیش ہو......! دراصل......!

اوہ پلیز......! جینی! اگر تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو تو بابا معاف کردو میں......! بھی کتنا بے وقوف ہوں......! تمہارا مزاج بھی نہ سمجھ سکا......! اچھا خیر......! چھوڑو......! اصل بات بتاؤ؟

وہ ایسا ہے جیمی اماں اور ابا نے کل مجھ سے اپنی آخری خواہش کا اظہار کردیا ہے۔ تم جانتے ہو ان کی خواہش کیا ہے......!

''نہیں'' تو میں بتاتی ہوں......! عادل ہے نا......اماں کی بیوہ بہن کی نشانی......! اور ابا کے چہیتے بھائی کی اولاد......! مجھ سے شادی کا خواہشمند ہے......اس کے بعد وہ پھر خاموش ہوگئی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے......! مگر اس سے تمہاری اماں اور ابا کی آخری خواہش کا کیا تعلق......!؟

اوہو! کوڑھ مغز ہو تم......! اب یہ بھی نہیں سمجھے......وہ چاہتے ہیں کہ میں ایک ہفتے کے اندر اندر اس سے شادی کرلوں......! اب آیا عقل شریف میں......!

جینی۔ جھنجھلانے کی کیا بات ہے......! مجھے تو ہنسی آ رہی اگر تم اجازت دو۔ تو ذرا کھل کر ہنس لوں......! جیمی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا......!

اور جینی غصے میں ناگن کی طرح بپھرنے لگی......!

ہوں......! جیمی ......! تم سب مرد ایک جیسے ہو۔ خودغرض لالچی کمینے......! اوباش......! تنگ نظر......تنگ دل......اور جانے......بس یا کچھ اور بھی......!

جیمی۔ نے مداخلت کی......! محترمہ......! آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے......!

اوہ جیمی کے بچے تم میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے تیار بیٹھے ہو......!

مگر جینی ......! عادل کا قصور تو بتاؤ......! ماشاء اللہ ہینڈسم نوجوان ہے۔ تنہا جان......وہ بھی تمہاری دیوانی......اور پھر بزنس مین......! لاکھوں میں کھیلتا ہے......اور سب سے زیادہ تمہارے والدین کی رضا بھی شامل ہے......! نہیں اچھی زندگی گزارنے کے لیے اس سے زیادہ کوئی گولڈن چانس نہیں ملے گا......! میری مانو تو فوراً تیار ہوجاؤ......!

'' تم بھی یہی کہتے ہو جیمی......! میں تو سمجھتی ہوں کہ تم میرے دوست ہو میری نیچر کو تم سے زیادہ کون سمجھے گا......مگر تم جو خود بہت لبرل بنتے ہو......نیچرل لبرٹی کا پرچار کرتے ہو......مجھے خود کو آہنی زنجیروں میں مقید ہونے کا درس دے رہے ہو......!

نہیں جینی......! شادی ایک مقدس بندھن کا نام ہے۔ پھر عادل کی پسند اس کی نیچرل لبرٹی ازم کی علامت ہے......تم یہ کیوں بھول جاتی ہو......اس کی چاہت آہنی زنجیروں کا پیرہن نہیں......! خلوص کی مدھر لو میں تمہارا عکس اس کی دل کے مندر میں پوجا پاٹ ہے جینی......! سچے جذبے کی توہین مت کرو......! تم گنہ گار ہوجاؤ گی......!۔

اوہ نو......جینی......! میں ان جذبوں کو منافقتوں کا نام دیتی ہوں اس سے زیادہ مرد کی خودغرضی کیا ہوگی کہ وہ خود جس کو چاہے اس کو پالینا اس کی شان ہے اس کی انا ہے......مگر یہ کہاں کی شرافت ہے......یہ کیسی محبت ہے......کہ جہاں

چاہت نام کی کوئی چیز ہی نہ ہو...... جہاں دلوں کے مندر میں کوئی گھنٹی نہ بجتی ہو......اسے پوجا پاٹ بنالینا......! یہ بھلا ذی ہوش لوگوں کا کام ہے......! غلط بالکل غلط یہ کمزور مردوں کی خودستائیاں ہیں۔کون کس کا مت......! یہ فلسفہ ہمیشہ سے غلط ثابت ہوا ہے......! تم خود مرد ہو مردوں کی حمایت کرنا چاہتے ہو...... کمزور......! مجھے کسی کی کب پرواہ ہے......!

پھر بھی! تمہارا مقصد کیا ہے؟ میری تو عقل بھی کام نہیں کرتی! جیمی نے پریشان ہوکر جینی کے انداز کو بدلنے کی کوشش کی۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ جیمی کہ اماں اور ابا نے مجھے ایک ایسے دوراہے پر کھڑا کردیا ہے کہ میں خود الجھن میں مبتلا ہوگئی ہوں۔ عادل سے میں نے شادی سے انکار کردیا ہے......! اس کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو اس سے نفرت بھی نہیں کرسکتی......! محبت تو دور کی بات ہے۔ اب یہ صورت پیدا ہوگئی ہے کہ انہوں نے یہ حکم دیا ہے کہ عادل سے نہیں تو جس سے دل مانے فوراً ایک ہفتہ کے اندر اندر شادی کرو......!

ماں کی حالت زیادہ خراب ہے......! اور وہ پھر تم جانتے ہو کہ وہ میرے سہاگ کے پھول کھلنے کی منتظر ہیں کتنی حسرت سینے میں دبائے ہوئے ہیں میں سوچتی ہوں......! کہ میرے دوست تو بہت ہیں مگر میں نے زندگی کے اس پیمانے پر کسی کو نہیں پرکھا......! کون جیون ساتھی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے......! بنیادی بات جو سب مردوں میں مشترک ہے وہ ہے حاکمیت کا رجحان......! جبکہ میں مردوں کی اس مناپلی سے سخت الرجک ہوں......! میں تو یہ جانتی ہوں کہ شادی دو مخلص دوستوں کے درمیان ایک ایسا پیمانہ ہوتا ہے جو ایک دوسرے کی نہ صرف جذبات کی قدر کرتا ہے بلکہ زندگی کے ہر قدم پر ہر مرحلے پر ایک دوسرے کو لازم وملزوم بنادیتا ہے......!

اس وقت تو جینی تم بڑی فلسفیانہ باتیں کررہی ہو۔ مگر زندگی کے اصل حقائق کے بارے میں تمہارا نظریہ کافی حد تک غلط ہے‘‘

یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو......!؟

میرے سامنے اپنے دوستوں کی زندہ مثالیں موجود ہیں خود تمہاری اپنی مثال موجود ہے جو چاہتوں کے مندر کسی اور دیوتا سے آباد کرتے رہے......! اور جیون کی ڈوری کسی اور سے باندھتے رہے۔ صرف اس لیے کہ وہ تمہارے چہرے کے نقاب سے ہی رشتہ رکھے......! اندر کے اس انسان کو نہ دیکھے جس کا باطن انسانیت کا مجرم ہے سچے جذبوں کا قاتل ہے......!

جینی......جینی......! خدا کے لیے بس کرو......! تمہیں یہ سوچیں کس نے دی ہیں چلو تم ہماری حقیقت سے تو واقف ہوگئیں......تو پھر تمہیں کس بات کا دکھ ہے......تمہارا باطن تو صاف ہے جاؤ سچائیوں کو گلے سے لگالو......!

نہیں یہ بھی غلط ہے سچائی تو وہ نور ہے......جو باطن کے اندھیروں کو نگل لیتا ہے......! پھر میں کیسے لفظوں کا بیوپار کرنے والوں کو سچا مان لوں۔ اپنی انا بیچ نہیں سکتی......تم جانتے ہو کہ میں نظریہ حاکمیت کے سخت خلاف ہوں...... برابری اور مساوات کا اصول میرے نزدیک زندگی کی ایک واضح حقیقت ہے جو مرد اور عورت کے رشتے کو عزت کو مریم کے سانچے میں ڈھال کر صحیح معنوں میں ایک دوسرے کا شریک بنانے میں ممد ثابت ہوتا ہے......! اور اسی رشتے میں وہ چاہتیں جلوہ گر ہوتی ہیں جنہیں نیچرل لبرٹی کے اصولی بنیاد کہا جاتا ہے‘‘

ویری گڈ! جینی......! اب بولو......ماں باپ کی آخری خواہش پوری کرنی ہے......!؟

ہاں! مگر مسئلہ تو یہی ہے کہ یہ ہوگا کیسے سب! میں اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس تلخ حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرچکی ہوں مگر کڑا مرحلہ باقی ہے......! وہ کون ہے جو میرا ہم سفر بننے کا اہل ہے......میری آزادیوں کا لٹیرا نہ ہو...... بلکہ نگہبان بن کر خود بھی میری فکر کی راہیں تلاش کرنے میں میرا ساتھ دے ......! اور جب وہ بندھن ہم دونوں کے لیے ایک زنجیر کی شکل اختیار کرنے لگے تو دونوں کو دیانتداری کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے اپنے اپنے راستے پر تمہارواں دواں ہوجانا چاہیے......!

’’ہاں‘‘ جینی! میری اور تمہاری سوچ زندگی کے اس زاویے کے بارے میں بالکل ایک ہے۔ مگر یہ علیحدہ بات ہے کہ میں نے زندگی کا ایک اہم فیصلہ ایک غلط جذبے سے وابستگی کی بناء پر کیا تھا......جو ظاہر ہے میرے لیے بہتر نہ تھا اب تم یہ بتاؤ......کہ تم اگر سنجیدہ ہو تو فیصلہ ابھی کیے لیتے ہیں......یا پھر ایک آدھ دن کے بعد......! جیسا تم کہو......!

’’جیمی......! واقعی سنجیدہ ہو......! دیکھ لو......! یہ بڑی تلخ حقیقت ہے تمہارے گلے کا طوق نہ بن جائے......!

یہ میرا مسئلہ ہے جینی۔ اگر ایسی صورت ہوئی۔ تو تمہارے فلسفے کی آخری کڑی اس کا حل ہوگا یقیناً تم اتفاق کروگی......! او ہاں......!

میں یہ بھول گئی کہ تم نے میرا مسئلہ حل کردیا ہے......!

اور......پھر......ایک ہفتے کے اندر اندر زندگی کے بارے میں ایک جدید نظریہ رکھنے والی جینی نے جیمی کی صورت میں ایک تلخ حقیقت کو اپنا چکی تھی دن مہینے اور سال گزر گئے۔ سمندر کی سطح پر طوفان آتے رہے جوار بھٹا اٹھتا رہا گرداب بنتے رہے اور پھر سمندر پُرسکون ہوگیا اب پھر ٹھیک دس سال بعد جینی اس ریسٹورنٹ میں بیٹھی تھی سادہ سی مگر خوبصورت اور قیمتی ساڑھی میں ملبوس......! سیاہ گھنے لمبے بالوں میں سفیدی کا شیڈ تھا......! جوانی کچھ سست سست نظر آرہی تھی مگر چہرے کی سختی اور رگوں کا تناؤ زندگی کے بارے میں اس کے حقیقت پسندانہ نظریئے کی غمازی اسی طرح کررہا تھا......وہی باوقار انداز اب کے وہ تنہا تھی!

اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ کی اس مخصوص ٹیبل پر جہاں جیمی اس کا پارٹنر ہوتا تھا وہ تنہا بیٹھی کافی پیتی رہی......! اور چند لمحوں کے بعد جیمی اس جگہ پر ایک نوخیز دوشیزہ کے ساتھ آیا ہال میں کوئی میز خالی نہ تھی......اور جینی نے ان کو

باقی صفحہ ۶۹ پر ملاحظہ کیجیے

''چاند کے روبرو''

آصف ثاقب

(بوئی، ہزارہ)

چاند کو روبرو نہیں کرتے
تم سے ہم گفتگو نہیں کرتے

گفتگو میں ادب لحاظ کریں
آپ کہتے ہیں ''تو'' نہیں کرتے

سارا جنگل ہی جاگ اٹھتا ہے
ہم تو ہولے سے ''ہو'' نہیں کرتے

ایک مرکز پہ گاڑ دیتے ہیں
ہم نظر ''چارسُو'' نہیں کرتے

اس کو مٹی بنا کے رکھتے ہیں
اپنے دل کو لہو نہیں کرتے

چائے دیں ہم غریب خانے کی
پیش جام و سبُو نہیں کرتے

گیت ہی کچھ سنائیں بچپن کے
عذر تو خوش گلو نہیں کرتے

غیر لہجے میں آپ بولے ہیں
بات کیوں ہو بہو نہیں کرتے

دل گنوایا تو اس کی خاطر ہم
جستجو، آرزو نہیں کرتے

روٹھ جاتے ہیں یار سے ثاقب
اور جھگڑا کبھُو نہیں کرتے

○

محمود الحسن

(راولپنڈی)

روزِ روشن کہ رات کیا ہو گی
آنے والی حیات کیا ہو گی

جن کے دن بھی ہیں تیرہ و تاریک
دوستو اُن کی رات کیا ہوگی

بات کرنے کی آرزو ہے مگر
آ گئے وہؐ تو بات کیا ہو گی

اب تو دل ہی نہیں ہے پہلو میں
اب یہاں واردات کیا ہو گی

ہائے شکر فشائیاں اُن کی
اور شاخِ نبات کیا ہو گی

اُن کے رستہ میں موت سے بڑھ کر
زندگی کی زکوٰۃ کیا ہو گی

اُن سے بڑھ کر جہان میں کوئی
ذاتِ والا صفات کیا ہو گی

وہ نہ ہوں گے تو آپ ہی سوچیں
رونقِ کائنات کیا ہو گی

بے حضوری کی مشق ہے واعظ
اور تیری صلوٰۃ کیا ہو گی

سوچتا ہوں کہ انتہا تیری
عالم بے ثبات کیا ہو گی

ہم نہیں التفات کے قابل
نگہہِ التفات کیا ہو گی

جس میں قربانیوں کا نام نہ ہو
ایسی مردہ حیات کیا ہو گی

جو نہیں گُم تری محبت میں
اُن سے تکمیلِ ذات کیا ہو گی

جس کی کھائے خُدا قسم محمودؐ
وہ قلم، وہ دوات کیا ہو گی

اختر شاہجہاں پوری
(بھارت)

خیال و فکر میں خدشہ نئے عذاب کا ہے
ارادہ اس لیے اپنے بھی احتساب کا ہے

صلیبِ قامتِ زیبا پہ جان و دل قرباں
کہ جیسے کام یہ کوئی بڑے ثواب کا ہے

ابھی تو خیمۂ الفاظ کی پناہ میں ہوں
مرا وجود بھی حصّہ تری کتاب کا ہے

ہمارے دشتِ بدن پر برس گیا کیسے
سحابِ وقت تو عنوان خیال و خواب کا ہے

حسابِ دوستاں در دِل کی بات کرتے ہو
مگر فساد یہ سارا اُسی حساب کا ہے

کبھی کبھی تو وہ اک حرفِ ناشنیدہ لگا
وہی جو حرفِ محبت ترے خطاب کا ہے

وہ کم نُما نظر آئے گا خواب میں اختؔر
اسی لیے تو مجھے انتظار خواب کا ہے

❍

غالب عرفان
(کراچی)

صحرا میں بود و باش کرنا
ذرّوں میں خود کو تلاش کرنا

بے خواب ہر شب گزار دینا
پھر صبح تلاشِ معاش کرنا

اپنا چہرہ دکھائی ہی نہ دے تو
آئینے ہی کو پاش پاش کرنا

اپنا بُت تراشنے کی دُھن میں
خود کو نذرِ سنگ تراش کرنا

ماں کی گود میں بھوکا اِک بچہ
معصوم لبوں کا اِرتعاش کرنا

تاریخِ عرفاؔں کے ورق اُلٹنا
تہذیب کا راز فاش کرنا

❍

مہندر پرتاپ چاند

(انبالہ، بھارت)

اس سے اب کیا؟ کوئی غم خوار ملا یا نہ ملا
غم تو یہ ہے کہ کوئی غم کا شناسا نہ ملا!

جھانک کر دیکھا جو ماضی کے دریچوں میں کبھی
دشتِ تنہائی میں کوئی بھی یگانہ نہ ملا

سالہا سال سے پس ماندہ ہے جو خلقِ خدا
آج تک حیف! اسے کوئی مسیحا نہ ملا!

وقت نے پھونک دیے خواب سنہرے سارے
دل نے چاہا بھی مگر پھر کوئی تجھ سا نہ ملا!

آہ! اب مُلک میں پہلی سی وہ قدریں نہ رہیں!
ہم کو جو بھی ملا، اخلاص سے بے گانہ ملا

یوں تو پاؤں میں بھنور باندھ کے اُترے ہم بھی
جس میں لہریں ہوں فلک بوس وہ دریا نہ ملا

اُف! وہ ماں باپ کہ خود اپنے ہی گھر میں جن کو
سر چھپانے کے لیے کوئی ٹھکانہ نہ ملا!

خیر، وعدے تو کیے تُو نے، نوازش یہ تری
یہ الگ بات کہ ایفا کا بھروسا نہ ملا

مرحبا! چاؔند! کہ چرچے ہیں تیری وحشت کے
تیرے اپنوں کو بھی تجھ سا کوئی رُسوا نہ ملا!

○

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

رکھتا ہے اگر آنکھ تو زخموں کے نشاں دیکھ
تنہائی کا احساس نگاہوں سے عیاں دیکھ

مدت سے لگی آگ مرے خیمۂ جاں میں
لپٹا ہوا اب دل کی طنابوں سے دھواں دیکھ

دیکھی نہ گئی تشنہ لبی دشمنِ جاں کی
سیراب ہوا کیسے کوئی تشنہ وہاں دیکھ

آنا ہے اگر شوق سے آ دشتِ وفا میں
آغاز میں ہوتا ہے یہاں جی کا زیاں دیکھ

میں قامتِ نیزہ پہ تری دید کا پیاسا
اک خون کا دریا مری آنکھوں سے رواں دیکھ

کردار کی عظمت ہے نہاں ضبط میں لیکن
اس درد کے قصّے میں مرا طرزِ بیاں دیکھ

اترا تھا کبھی تیر کی صورت مرے دل میں
اس شخص کو جھکتے ہوئے اب مثلِ کماں دیکھ

رکھتا ہے یہ دل ربط اسی جانِ غزل سے
اس عمرِ گریزاں میں تمنا کو جواں دیکھ

اندیشۂ جاں رہتا ہے اس راہ میں ہر دم
بے کار حسنؔ جاتی ہے سب آہ و فغاں دیکھ

○

نسیمِ سحر
(راولپنڈی)

دعوے سے کہہ رہا ہوں، مِرا دل چراغ ہے
یعنی مِرے لہو میں بھی شامل چراغ ہے
مَیں تیرگی کے ہاتھ پہ بیعت نہ کر سکا
میری تمام عمر کا حاصل چراغ ہے
محفل سے میں اٹھا تو اُنہیں تب پتہ چلا
جو کہہ رہے تھے، رونقِ محفل چراغ ہے
میری یہ رمز کوئی سمجھ ہی نہیں سکا
خارج میں جو بھی ہوں، مِرا داخل چراغ ہے!
یہ تیرگی سرنگ ہے، اِس میں مرا سفر
لازم ہے یوں کہ میری تو منزل چراغ ہے
مرعوب اُس کے حجم سے ہرگز نہیں ہوں مَیں
میرے لیے تو یہ مہِ کامل چراغ ہے!
دریا میں تو چراغ جلے ہیں جگہ جگہ
لیکن بجھا ہوا سرِ ساحل چراغ ہے
منزل کی سمت جانے کی خواہش تو ہے مگر
میں کیا کروں کہ راہ میں حائل چراغ ہے!
مشکل یہ ہے بجھانا نہیں چاہتا اُسے
مشکل یہ ہے کہ میرے مقابل چراغ ہے
اب اُنگلیاں جلانے لگا ہے مرا چراغ
اب میرے واسطے نئی مشکل چراغ ہے
لوگوں کے دل کی تیرگیاں جب نہ مِٹ سکیں
کس کام کا بھلا سرِ محفل چراغ ہے؟
کیوں جنگلوں میں روشنی کرنے نہیں گیا؟
کیا تیرگی سے ڈرتا ہے، بُزدِل چراغ ہے؟
مجنوں کو کب چراغ ضرورت ہے دشت میں؟
اُس کے لیے تو لیلیٰ کا محمِل چراغ ہے!
اِس کے سیاہ رنگ پہ مت جائیو نسیم
رخسارِ یار پر یہ سیہ تِل چراغ ہے!

○

مسلم شمیم
(کراچی)

حریمِ جبر میں خاموش بھی رہا نہ گیا
سفیرِ شب کو نقیبِ سحر کہا نہ گیا

عجیب کیفیتِ کرب ہے فضاؤں میں
گلوں نے بارہا چاہا مگر ہنسا نہ گیا

شبِ ستم کا بیاں جرم ہی سہی کیجیے
گماں نہ ہو کہ سرِ بزم کچھ کہا نہ گیا

خیالِ طرز ساقی کی خیر، رندوں میں
کہیں بھی تذکرۂ تشنگی سنا نہ گیا

دیارِ عشق ہے گویا دیارِ کرب و بلا
یہاں سے اٹھ کے کوئی درد آشنا نہ گیا

عجب طرح کے مسافر تھے ہم کہ بیٹھ رہے
بھٹک کے راہ سے دوگام بھی چلا نہ گیا

ہزار مرحلۂ جبر سے ہوئے دو چار
دلِ شمیم سے جینے کا حوصلا نہ گیا

○

کرامت بخاری

(لاہور)

غم کا مجھ کو غم نہیں باوجود اس کے کہ ہے
یہ بھی صدمہ کم نہیں ہے باوجود اس کے کہ ہے

برسرِ پیکار ہے دل گردشِ ایّام سے
دم میں اتنا دم نہیں ہے باوجود اس کے کہ ہے

ہے رقیبِ روسیا میرا مگر کیا کیجیے
وہ مرا محرم نہیں ہے باوجود اس کے کہ ہے

ٹمٹماتا ہے چراغِ آرزو اک عمر سے
اس کی لَو مدہم نہیں ہے باوجود اس کے کہ ہے

زلفِ پیچاں ہے مزاجِ یار کی عکاس بھی
دوش پر برہم نہیں ہے باوجود اس کے کہ ہے

ہے کشش کافِ کرم کی یا کرامت ہے کوئی
آنکھ میری نم نہیں ہے باوجود اس کے کہ ہے

○

اشرف جاوید

(لاہور)

جو مزارع بھی زمیں دار ہُوا جاتا ہے
گاؤں کا رازق و مختار ہُوا جاتا ہے

ناں وہ یوسف ہے، نہ یہ مصر کا بازار، مگر
جو بھی آتا ہے، خریدار ہوا جاتا ہے

اور سے اور ہُوئے جاتے ہیں تیور اُس کے
عجز بھی صورتِ پندار ہُوا جاتا ہے

جتنا آسان سمجھتے تھے محبت کرنا
مرحلہ اُتنا ہی دشوار ہوا جاتا ہے

شہر میں چرچے ہُوئے اُس کی مسیحائی کے!
جو بھی سُنتا ہے، وہ بیمار ہوا جاتا ہے

بات ، جو مانعِ اِظہار ہُوئی جاتی تھی
آج اُسی بات کا اِظہار ہُوا جاتا ہے

اُس کے قدموں پہ پھریں رنگ نچھاور ہوتے
راستہ راستہ گلزار ہُوا جاتا ہے

جس سے مہتاب کبھی جھانک لیا کرتا تھا
وہ دریچہ بھی تو دیوار ہُوا جاتا ہے

مدّتوں بعد کسی یاد کا جھونکا آیا
میرا کمرہ بھی ہَوادار ہُوا جاتا ہے

○

بھولو

آغا گل
(کوئٹہ)

بہت دنوں سے شوق تھا کہ میرے پاس بھی کوئی پالتو جانور ہو، جو میرے ساتھ ساتھ گھومے پھرے اور میرے ایک ہی اشارے پر میرے دشمن کا قلع قمع کر دے۔ بڑے بھائی احمد کے پاس یہ لمبی سی گردن اور خطرناک چونچ والی بطخیں تھیں۔ جوڑا یوں تو پُر امن ہی رہتا مگر کسی بھی اجنبی کو دیکھ کر اعلانِ جنگ کرتے ہوئے چونچوں کو آگے بڑھا کر ایسا خوفناک منظر پیش کرتیں کہ اجنبی گھبرا کے بھکیل ہونے لگتے۔ چھوٹے بھائی آصف کے پاس ایک جنگجو مرغ تھا۔ عام مرغوں سے کئی گنا بڑا۔ غصّے میں آتا تو اس کی گردن کے پر پھول جاتے۔ قابو سے باہر نکل جاتا سنبھالے نہ سنبھلتا۔ چھتوں پہ کودتا پھرتا۔ مجھے بہت ارمان تھا کہ میرے پاس ایک بکرا ہو۔ میں ایک لیلا لے کر پالوں۔ اسے ٹکریں مارنے کی تربیت دوں۔ میرا اشارہ پاتے ہی دشمن کے چھکّے چھڑا دے۔ ٹکریں مار مار کے بھگا دے۔ جو لڑ کے مجھ سے لڑنے کو آئیں تو اُن کا بھرکس نکال دے۔ احمد کو بطخیں میر خوشدل خان مرغزانی نے دی تھیں۔ آصف کو مرغ کا تحفہ بھی میر عطا محمد ولہاری نے کچھ ولہاری میں دیا تھا۔ میں چونکہ منجھلا تھا میں اکثر تہی دست ہی رہتا۔ کوئی بڑے بھائی کو تحفہ دیتا تو کوئی چھوٹے کو۔ چھوٹے سے لڑتا تو ڈانٹ پڑتی کہ یہ تو چھوٹا ہے، شفقت کرو، اسکا بازو بنو۔ بڑے سے لڑتا تو بھی ڈپٹ دیا جاتا کہ بڑے کا احترام کرو۔ بڑا بھائی باپ سمان ہوتا ہے۔ ان دنوں ہم ہندو محلّہ میں رہتے تھے۔ ویسے تو بٹوارے پہ ہندوؤں کا قتل عام ہوا تھا۔ اُن کی جائیدادیں چھین لی گئیں، ان کے مکانوں کو نذر آتش کیا گیا، بوڑھیوں کو قتل اور جوانوں کو ایمان کی دولت سے سرفراز فرماتے ہوئے بیویاں بنا لیا گیا۔ یہ مجاہدانہ قصے کہانیاں سن سن کر میرا خون بھی جوش مارتا کہ کاش چند برس پہلے پیدا ہوتا تو میں بھی ہندوؤں کے گھروں سے ایک بکرا ہی کھول لاتا۔ بابا کہا کرتے کہ پیسے بچایا کرو۔ جو جیب خرچ ملتا ہے، تہواروں پہ ملتا ہے۔ ان میں سے کچھ بچا بھی لیا کرو۔ چینٹیوں کو دیکھو، گلہریوں پہ نگہہ ڈالو۔ پرندے بھی تو کچھ نہ کچھ بچاتے ہیں۔ ڈاکخانہ ہمارے گھر کے قریب ہی تھا۔ بابا ایک دن ہم تینوں کو ڈاکخانے لے گئے اور تینوں کے Minor اکاؤنٹ بھی کھلوا دیئے۔ پوسٹ ماسٹر بچہ خان نے بھی حوصلہ افزائی کی۔ ان دنوں ڈاک خانے میں بچوں کے لیے کارڈ ملا کرتے۔ جس پر چار آنے سیونگ ٹکٹ لگتے۔ بچے جب چار چار آنے کے چار ٹکٹ لگاتے تو پوسٹ ماسٹران پہ کالی مہر لگا کر منسوخ کرتے ہوئے اکاؤنٹ میں ایک روپیہ جمع کر دیتا۔ اگلی بار جو میں کاؤنٹر پہ گیا اور ہانگ لگائی ''پاولی کا ٹکٹ دیوٗ''، تو جواباً بچہ خان بھی گرجا ''کون ہے بھائی سامنے آؤ'' میرا قد چھوٹا تھا، وہ دیکھ نہ پایا، اٹھ کے جھانکا ''اڑے عمو۔ تم ہے؟ اندر آ جاؤ۔'' یوں رفتہ رفتہ میرے سیونگ بینک اکاؤنٹ میں تین روپے جمع ہو گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ منڈی مویشیاں کی بجائے کسی کلّی (گاؤں) سے خریدوں گا۔ گاؤں بہت سستے ہوا کرتے تھے، دودھ، انڈے، مرغیاں، بھیڑیں وغیرہ کلیوں (گاؤں) وافر مقدار میں ملتے۔ بلکہ انہیں خود ہی گاہکوں کی تلاش رہتی۔ انڈے وغیرہ تو تحفتہً ہی دے دیا کرتے۔

شام میں ہمارے ہاں خوب منڈلی جمتی۔ اس وقت بابا سرکاری ملازم کو چھٹی دے دیا کرتے۔ مہمانوں کی خوش آمدی (استقبال) کرنا۔ ان کے لیے چائے لانا مجھے اور میرے بھائی احمد کو سونپا جاتا۔ ٹرے کا وزن زیادہ تھا یہ کام احمد کا تھا جبکہ کپ، پانی کے گلاس، ایش ٹرے جھاڑنا میری ذمہ داری تھی۔ بہت سے مہمان شاموں میں آیا کرتے، کڑک کے داد محمد قاضی مزدوروں کے لیڈر تھے جبکہ عبدالرحمان غوّر خود ایک مزدور لکھاری تھے۔ ملک اللہ بخش وزیر دربار قلات میر نصیر خان احمد زئی، وڈیرہ نور محمد بنگل زئی بھی دوستوں میں شامل تھے۔ نسیم تلوی بھی چلے آتے میر غوث بخش بزنجو کے علاوہ سیوی میلے کے دوران سردار دودا خان سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ البتہ نواب خیر بخش مری کا اپنا پروٹوکول تھا۔ میں نے کبھی ہنستے مسکراتے نہ دیکھا۔ بڑا دبدبہ تھا ان کا۔ مہمانوں میں خوب بحث مباحثہ ہوا کرتا۔ ٦۔ اکتوبر ١٩٥٠ء پر اذان کے وقت شاہی محل قلات پر حملے کی باتیں ہوئیں۔ شہزادہ محی الدین نے مینار پر مورچہ بند ہو کر بے جگری سے مقابلہ کیا۔ بنگل زئی اور کرد ناموس وطن کے لیے میدان میں کود پڑے۔ وادی جوہان نرمک کے لہڑی اور رند کلوئی سر پر کفن باندھ کے دھرتی ماں کی حفاظت کے لیے نکل پڑے۔ مجھے حیرت ہوئی نہ کسی مرغ، بطخ کی بات کرتے نہ ہی بکروں کا ذکر ہوتا۔ عجیب عجیب سی باتیں کرتے رہتے۔ چائے پیتے سگریٹ پھونکتے وہ بے حد جذباتی ہو جایا کرتے۔ میں ان کے لیے پانی اور چائے لاتا، ایش ٹرے خالی کر کے دوبارہ دریوں پہ رکھتا چلا جاتا۔ اکثر ایک کونے میں دبکا رہتا۔

پھر کسی اسکندر مرزا کی بات کرتے جس کا جدامجد میر جعفر بنگالی تھا۔ جس کا نام ہی غداری اور وطن فروشی کا سمبل تھا۔ جس نے ایرانی سفارت خانے کے افسر کی بیوی ناہید سے شادی رچا لی اور بلوچستان کا ایک بڑا حصہ رضا شاہ پہلوی کے ہاتھوں فروخت کر ڈالا تھا براہوی ریاست کا نوحہ پڑھتے ہوئے پھر کسی لیاقت علی خان کی بات کرتے جسے سر عام تقریر کرتے ہوئے شہید کر دیا گیا تھا۔ یوں تو وہ کرنال کا نواب زادہ تھا، مگر شہادت کے وقت اس کی ایک جراب بھی پھٹی ہوئی تھی۔ اس نے سب کچھ لٹا دیا تھا۔ ایک گروہ سبھی کو مارے جا رہا تھا۔

بابا گرجتے برستے ''بلوچستان میں بس شکار ہی کرنے آتے ہیں۔ کبھی غلام محمد چلا آتا ہے تو کبھی خواجہ ناظم الدین جوہان میں آ کر شکار کرتا ہے۔'' آذات جمالدینی نے دانت پیستے ہوئے گرہ لگائی ''جی ہاں! بلوچستان کو ایک شکار گاہ بنا رکھا ہے، مگر محض جانوروں تک رہیں تو بات بنتی ہے یہ تو انسانوں کا شکار

کرتے ہیں۔سارے ہی بندوقچی آدم خود ہیں۔'' میرعطامحمد ولہاری سے نہ رہا گیا ''خان قلات نے غلام محمد کو اکیس توپوں کی سلامی دی تھی، میں اگر ہوتا تو ایک توپ کا رخ غلام محمد کی طرف کر دیتا۔ ایک ہی گولے میں اس کے چیتھڑے بکھر جاتے۔'' سیٹھ دھنّی چند میرے کلاس فیلو بسنت کا باپ دھیرے دھیرے بولتا ''بھولا ناتھ نے غلام محمد کی زبان ہی چھین لی۔ یہ کرم کی خاطر دھرم سے منہ موڑ لیتے ہیں مگر بچ نہیں سکتے۔جو کرو، سو بھرو۔''

کبھی وہ ریاست قلات کے دوسو ملازمین کی بات کرتے۔ بہ یک جنبش قلم جن کی نوکریاں موقوف کر کے انہیں جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ پھر کسی بوجھ بجھکڑ درانداز نے سوچا کہ ان پہ الزام کیا لگے گا؟ ان پر مقدمے کس جرم میں چلائے جائیں گے۔ رات میں جیل کا پھاٹک کھول دیا گیا۔ بندی خانوں کے دروازے بھی وا کر دیے۔ جس قدر محبوس تھے انہیں کہا کہ بھائی بندوق اور توپ سے تم لڑنے کے نہیں۔ وہ تو آسمان سے بھی آگ برسانے کے قابل ہے۔ وہ تو دین و دنیا کا دشمن دجال ہے۔ ہمارا تو خیال تھا کہ ڈھال تلوار لے کر Civvies میں گدھے پہ بیٹھ کر آئے گا۔ دنیا بھر کی قومیں مل کر اس پہ فتح نہ پا سکیں گی۔ تو بھلا مٹھی بھر براہوی کہاں تک لڑیں گے۔ دجال کا نام سن کر اکثریت غم اور بے بسی سے مغلوب جیل سے نکل کر چلے گئے۔ مگر ملک عبدالصمد خواجہ خیل جیسے مضبوط انسان یا ملک عطامحمد دہوار اور دیگر انکاری ہو گئے کہ وہ رات کے اندھیرے میں جیل سے نکلے تو گویا اپنے موقف سے ہی ہٹ گئے۔ لہٰذا وہ ایک یقینی شکست کے باوجود دجال کا مقابلہ کریں گے۔ دجّال نے انہیں ڈھاڈر جیل منتقل کرا دیا اور Lench Law کے تحت مختلف سزائیں بھی سنا دیں۔ حالانکہ ان کا کوئی جرم نہ تھا۔ نہ اخلاقی نہ ہی مالی۔ مجھے ان بزرگوں پہ حیرت ہوئی وہ دورانِ گفتگو غضب ناک ہو جایا کرتے۔ کبھی ملک عبدالحئی کاکڑ اور عبدالصمد خان اچکزئی۔ میر امیر جان محمد شہی کی گرفتاری کی باتیں کرتے۔ کبھی اخبار نکالنے کا سوچتے۔ اخبار چھاپنے، بیچنے اور پڑھنے پہ چونکہ پابندی تھی لہٰذا وہ سوچتے کہ کراچی سے اخبار نکال کر زیرِ زمین اخبار چلائیں۔ اور دنیا کو مظالم سے زیادتیوں سے قتل و غارت مار دھاڑ سے آگاہ کریں۔ مگر یہ بھی جان جوکھوں کا کام تھا۔ قدم قدم پہ خفیہ پولیس پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے ان کے ذوق سے مایوسی ہوتی۔ دنبوں، بکروں، مرغوں، بطخوں سے انہیں دلچسپی نہ تھی۔ بس وہ کہتے کہ دجال تو لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی نافذ کر رہا ہے۔

میرے پاس تین روپے جمع ہو چکے تھے۔ میرا سرمایہ آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے ایک کجا بھی خرید لیا۔ جو تھا تو کچی مٹی کا مگر اس میں ٹکہ، آنہ، دونی محفوظ رہتی۔ اسے چھنکا کے محسوس بھی کیا جا سکتا تھا۔ پھر کجا توڑ کر میں نے دو روپے نکال لیے اور بچہ خان کے پاس اپنے ٹکٹوں والے کھاتے میں جمع کروا دیئے۔ بچہ خان نے بتلایا کہ یہ رقم میں خود نہیں نکال سکتا۔ دستخط والد کے ہی کرانا ہوں گے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ رقم میری ہے مگر نکالے گا کوئی اور۔ پھر خیال آیا کہ ریاست براہوی ہے حکومت کرتا ہے کوئی اور۔ یہ سوچ کر تسلی ہوئی چلو دنیا کا ایسا ہی دستور ہے۔

میں نے بچہ خان سے دریافت کیا ''دجال میرے پیسے تو نہیں لے جائے گا؟'' بچہ خان چونکا۔ پھر مسکرایا ''کیا مجال ہے دجّال کی میں اسے قدم نہ رکھنے دوں ڈاک خانے میں۔'' اسی رات بڑوں کی جذباتی محفل میں، میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ''بابا! بچہ خان کہتا ہے کہ دجّال ڈاک خانے میں نہیں جا سکتا۔ یہ سارے لوگ ڈاک خانے میں کیوں نہیں چلے جاتے۔'' فضا یک دم بدل گئی، سبھی ہنسنے لگے۔ جس سے مجھے حوصلہ ملا، میرا اعتماد بڑھا کہ میں ان سبھی سے زیادہ عقل مند ہوں۔

بابا دور دراز علاقوں میں گھوڑوں پہ جایا کرتے۔ ایک بس سیوی سے چلتی جیکب آباد کے لیے ایک کوئٹہ سے نکلتی۔ بس یہی کُل ٹرانسپورٹ تھی۔ آس پاس کے قصبات، گلیوں میں جانے کے لیے مین روڈ پہ ہی اترنا پڑتا۔ یہاں کرائے کی گھوڑا گاڑیاں، بیل گاڑیاں، اونٹ موجود رہتے۔ کرایہ طے پاتا تو چل نکلتے۔ البتہ جب پٹ میں سیلاب آتا تو راستے بند ہو جایا کرتے۔ سیوی والے دنیا سے کٹ کے ہی رہ جاتے۔ کسی کو کسی کی خبر نہ ہو پاتی طوفان نوح جیسی خاموشی طاری رہتی۔

ایک روز میرے ایک دوست نے جس کے والد کی حلوائی بازار میں اسٹیشنری کی دکان تھی یہ خبر سنائی کہ تحصیل دفتر کے سامنے روز ٹرکوں سے مال مویشی اتارے جاتے ہیں اور کوڑیوں کے مول بیچے جاتے ہیں۔ ان کے والد فرغانہ کے نام پہ ہی دکان کا نام تھا۔ میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر تصدیق کی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ ''تم مت خریدنا۔ خبردار! ورنہ خان سے شکایت کروں گا۔'' مجھے بہت تپ چڑھی۔ بابا تو لنڈ سے، ڈینگرہ، ڈمبولی سے ہوتے ہوئے بیل پٹ اور جھٹ پٹ جانب نکل چکے تھے۔ ایک طویل سرکاری دورہ تھا۔ اگلے ہی روز میں اسکول سے چمپت ہو گیا اور گلے میں بستہ ڈالے ہاتھ میں تختی لیے تحصیل کے دفتر جا نکلا۔ سامنے ہی ایک شامیانہ تھا جس میں سرکاری اہلکار اور نائب تحصیل دار درمحمد جعفر براجماں تھے، ان کے سامنے ہی میز پہ بہت سی فائلیں اور رجسٹر دھرے تھے۔ میرے بابا کے وہ دوست تھے، میں نے قریب جا کر سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا ''تم کہاں چلے آئے؟ تمہارا کیا کام ہے عمو۔'' ان کا بیٹا حفیظ جسے پیار سے چھوڑ پکارا جاتا میرا ہم جماعت تھا۔ جس کے باعث وہ زیادہ دلجوئی کرتے۔

''میں نے بھی بکرے کا بچہ خریدنا ہے۔''

وہ بے حد مصروف تھے۔ انہوں نے ایک لیویز اہلکار کو اشارے سے پاس بلایا۔ ''یہ انسپکٹر کبیر خان کا بیٹا ہے۔ اسے ایک بکرے کا بچہ دو۔'' میں خوشی خوشی چل دیا۔ اونٹ، بھیڑ، بکریاں، دنبے غرضیکہ ریوڑ کے ریوڑ تھے یوں لگتا تھا جیسے کہ مویشیوں کا عید میلہ ہو۔ اس نے مجھے ایک بچہ ڈھونڈ دیا ''یہ لو! کیا یاد کرو گے۔'' میں

نے پوچھا ''یہ کتنے کا ہے؟'' اہلکار بھی جلدی میں تھا ''بس دو روپے دے دو'' رقم میرے پاس نہیں تھی ''میں لے آؤں۔ اسے اور کسی کو نہ دینا'' اتنا سستا بچہ؟ میں نے سپنوں میں بھی نہ سوچا تھا۔ اہلکار نے تسلی دلائی ''مگر ایک گھنٹے تک آ جانا اور ہاں ایک رسی بھی ساتھ لانا۔'' اس نے ہانک لگائی ''دیر مت لگانا'' میں دوڑتا ہوا ڈاک خانے پہنچا۔ بچہ خان کو ادب سے سلام اور دو روپے طلب کیے۔ بچہ خان کو حیرت ہوئی ''خان کدھر ہے؟''

میں نے بتلایا کہ کچھی کے دورے پر ہیں۔ بچہ خان نے دو روپے دیئے اور ایک فارم پر نشان بھی لگا دیئے کہ بابا جب آئے اس پر دستخط کرا کے لا دینا۔ دو روپے جیب میں ڈال کر میں بھاگا بھاگا تحصیل دفتر پہنچا۔ اچانک یاد آیا کہ رسی تو لایا ہی نہیں۔ وقت کم تھا کہ عجب کوئی اور خرید لے جاتا۔ میں نے بچہ خان سے جا کر رسی مانگی۔ وہ حیران ہوا ڈاک خانہ اور رسی۔ پھر اس کے اشارے پر ملازم نے ڈاک کے تھیلے باندھنے والی ایک رسّی مجھے لا دی۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا تحصیل دفتر پہنچا۔ بہت سے جانور لوگ ہانک لے جا چکے تھے۔ میں نے اہلکار کو دو روپے تھمائے تو اس نے میری رسّی سے بچے کی گردن میں گرہ لگا کر ایک محفوظ پھندا لگایا۔ میں کشاں کشاں اسے گھر لے آیا۔

میری ماں کو تعجب ہوا کہ مرغی کی قیمت مدغو ہے (لیلا) بھلا کیسے ملا ہے۔ سبھی اس کے گرد جمع ہو گئے، وہ کچھ سہما ہوا سا تھا، گھبرایا گھبرایا سا پریشان سا۔ جیسے کسی ظالم ماسٹر کے قابو آیا ہو۔ ہم نے کھانے پینے کو دیا تو اس کا خوف دور ہو گیا۔ اور ہم سے کھیلنے لگا۔ اب اس کے نام کی فکر ہوئی مجھے شوق تھا کہ میری خاطر لوگوں کو ٹکریں مارے۔ طاقتور ہو۔ میں نے اس کا نام بھولو پہلوان رکھ دیا۔ کثرت استعمال سے پہلوان تو جاتا رہا۔ سبھی اسے بھولو پکارنے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ ہمارے کنبے کا حصہ ہی بن گیا۔ کھا پی کے زیادہ ہی چست و چالاک ہو گیا۔ تحصیل کے سامنے میدان میں سرکاری ٹرک مال مویشی لاتے رہے۔ سپاہی انہیں اتار کر اپنی راہ لیتے اور چند روز بعد ہی دوبارہ دریائے بیجی کے ساتھ ساتھ دھول اڑاتے Nari Gorge سے برآمد ہوتے۔ لیکن میرا بھولو آ چکا تھا پھر میں نے آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ ایک روز میں نے حفیظ سے دریافت کیا کہ اس کے بابا اس قدر مال مویشی کوڑیوں کے مول فروخت کر رہے ہیں وہ اپنے لیے کوئی دنبہ بکرا کیوں نہیں خرید لیتا۔ ان کا تو گھر بھی خاصہ بڑا ہے۔ ''میرے بابا کہتے ہیں کہ انہیں خریدنا گناہ ہے۔'' اس نے ترت جواب دیا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی ''گناہ ہے تو بیچ کیوں رہے ہیں؟'' حفیظ کے پاس جواب تیار تھا ''میرے چچا نے بھی پوچھا تھا، کہنے لگے کہ یہ سرکاری مجبوری ہے، ورنہ نوکری سے جاؤں گا۔ کیا عجیب قید ہی کر لیں۔'' مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ مگر میں نے گھر میں کسی سے ذکر نہ کیا کہ کہیں بھولو کی محبت ہی کم نہ ہو جائے اور اسے نکالنے کا سوچا جائے، بھولو دن بھر کھیلتا رہتا۔ سکول میں بھی بے چینی سی رہتی کہ جلدی گھر پہنچوں۔ پھر بہت دنوں بعد بابا لوٹ آئے۔ سبھی کھل اُٹھے، بھولو کا تعارف کرایا وہ بھی خوش ہوئے مگر تاکید کی کہ بھولو کی خاطر تعلیم کی جانب توجہ کم نہ کروں۔ یہ خوشی پائیدار نہ رہی۔ اگلے ہی روز انہوں نے ماتھے پہ ہاتھ مارا اور مجھ سے مخاطب ہوئے

''شامت اعمال ماصورت نادر گرفت
اندریں در میرتم ملک خدارا جابر گرفت''

''تم یہ بھولو جا کر مریوں کو واپس دے آؤ۔ ان کی معاشی تباہی کے لیے سپاہی اسلحے کے زور پر ان کے مال مویشی چھینتے جا رہے ہیں۔ یہ گناہ تم نہیں کرو گے۔'' یہ نادر شاہی حکم تھا۔ میرے بھائی بھی سہم گئے۔ ملازم دادو نے جھٹ تانگہ منگوایا اور بھولو کو لے کر چلتا بنا۔ میں نے حسرت سے بھولو کو آخری بار دیکھا اور دانت بھینچ لیے۔

گھر اچانک سائیں سائیں کرنے لگا۔ ریلوے اسٹیشن سے دخانی انجنوں کی اداسیاں سیٹیاں سنائی دیتیں۔ سیوی بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ زندگی اچانک ہی ویران اور بے معنی ہو کر رہ گئی۔ لالٹین کی ٹمٹماتی روشنی میں مجھے بھولو کے منمنانے کی آواز آئی جیسے وہ کسی مری کے گیدان کے باہر مجھے تلاش کرتا ہو۔ میں اگلی صبح بے دلی سے اسکول گیا۔ سہ پہر میں بابا نے بلوا کر تسلی دی کہ مجھے بلبل یا طوطا دلوا دیں گے۔

☆

- بقیہ -

نقلی چہرے

اپنی ٹیبل پر بیٹھنے کی آفر کر دی......! جیمی نوخیز دوشیزہ کا تعارف کرا رہا تھا جس سے اس نے طویل رومانس کے بعد تیسری شادی کر لی تھی۔۔

وہ سوچ رہی تھی......کہ قصور اس کا بھی نہیں......اس کے ماں باپ کا بھی نہیں۔ قصور اس کا اپنا ہے کہ وہ ایک صدی پہلے پیدا ہوگئی تھی۔ یہی اس کا المیہ ہے اس کی سوچیں اس کی زندگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی تھیں مصیبت تو یہ ہے کہ کوئی بھی مرد اس کا ہم سفر بننے کے لیے تیار نہیں۔ صرف اس لیے کہ ذہنی لحاظ سے وہ اس سے برتر کیوں ہے......! سوچوں کے ذہن میں کروٹیں لیتے ہی اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی اور جینی کے چہرے پر پھیلی بکھری کربناک پیلاہٹ نے زندگی کی تلخ حقیقت کی قلعی کھول دی......واقعی محبت کا اصل نام منافقت ہے اور منافقت اس دور کی سب سے حسین لعنت ہے۔

''کھارے سوڈے کی بوتل''

سیما پیروز (لاہور)

اس چھوٹے سے شہر کی چھوٹی سی کالونی میں مسٹر اینڈ مسز قاسم کی آمد اس طرح اثر انداز ہوئی جیسے کھارے سوڈے کی بوتل میں کسی نے نمک کی چٹکی ڈال دی ہو۔ عورتوں نے مسز قاسم کو دیکھا تو حسد سے جل کر کباب ہو گئیں۔ اور مردوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جیسے ہی شام میں وہ اپنے چھوٹے بچے کو پرام میں ڈال کر واک کے لیے نکلتی۔ کالونی کے سارے ہی مردوں کو کوئی نہ کوئی کام یاد آ جاتا۔ کسی کو مارکیٹ جانا ہوتا کسی کو واک کا خیال آ جاتا یا سومنگ کی یاد ستاتی۔ جوان پاس سے گزرتے ہوئے سیٹی میں کوئی رومانٹک گانا گاتے اور ادھیڑ عمر کسمساتے ہوئے چور نظروں سے دیکھتے ہوئے گزرتے۔ وہ نہ جانے کس مٹی کی بنی تھی کسی کی سیٹی، کسی کے فقرے اور دبی آہوں کو توجہ کے لائق نہ گردانتی اور کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ نہ وہ شرماتی نہ لجاتی بلکہ اس کی طبیعت میں عجیب سی بے نیازی تھی۔

انگریزوں کی بنائی ہوئی کھاد فیکٹری کی اس کالونی میں اپنی ہی دنیا آباد تھی۔ باقی شہر سے الگ تھلگ چار دیواری کے اندر جنگل میں منگل کے مصداق تھی۔ بمشکل پچاس ساٹھ گھر تھے جن میں پندرہ بیس کنوارے رہتے تھے باقی فیملیز تھیں۔ کالونی کے اندر ہی چھوٹی سی مارکیٹ (جس میں ضرورت کی ہر چیز ملتی تھی) ڈسپنسری، جوگنگ ٹریک، کلب اور سومنگ پول تھا۔ اس لیے ہر کسی سے دن میں کئی بار ملاقات ہو جاتی۔ ورنہ شام میں تو کلب میں ضرور ملاقات ہو جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ سب لوگ نئے جوڑے کے عادی ہو گئے اور وہ میاں بیوی بھی سب سے گھل مل گئے تھے۔

میری شادی کو تقریباً چودہ سال ہو گئے ہیں۔ ہمارا کوئی بچہ نہیں ہے۔ کافی ڈاکٹروں کو دکھا چکے ہیں۔ میڈیکلی ہم دونوں ٹھیک ہیں۔ بقول ڈاکٹروں کے جب اللہ کو منظور ہو گا تو وہ ہمیں اولاد سے نواز دے گا۔ ہم نے اولاد کی کمی کو روگ نہیں بنایا۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن ہیں لیکن نہ جانے انسان کیوں سیدھے راستے پر چلتے چلتے بھٹک جاتا ہے۔ اور بلاوجہ اوبڑ کھوبڑ راستوں پر چلنے لگتا ہے۔

مسز قاسم کی آمد سے اور تو شاید کسی کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی ہو البتہ میری تو اچھی بھلی زندگی تہہ و بالا ہو گئی۔ میں کوئی رفنگاں اور آوارہ مزاج آدمی نہیں ہوں کہ پرائی عورتیں تاڑتا پھروں۔ یا میں نے اس سے پہلے کوئی حسین عورت نہیں دیکھی۔ مانا کہ وہ انتہائی سمارٹ اور حد درجہ حسین عورت ہے لیکن جو اثرات مجھ پر مرتب ہوئے وہ ہرگز لائق تحسین نہیں ہیں۔

اللہ جانے مجھ پر اس کا اس قدر رعب کیوں تھا۔ رعب حسن تھا یا میرے دل کا چور تھا۔ اس کی آواز سن کر میری نگاہیں جھک جاتیں۔ دل عجیب انداز سے دھڑکنے لگ جاتا۔ میرے اوپر منوں بوجھ آ پڑتا۔ اس کے روبرو جانے سے میری جان جاتی۔ وہ میری بیوی سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی ہوتی تو میرا دل چاہتا کہ دور کسی کونے میں کھڑے ہو جاؤں اور اس کو دیکھتا رہوں۔

میں جتنا اس سے گریزاں تھا میری بدقسمتی پٹخ پٹخ کر اس کے راستے میں ڈالتی تھی۔ میل جول بڑھا تو وہ میری بیوی کی دور پار کی کزن نکل آئی۔ میری بیوی کی نانی اور اس کی دادی دونوں سگی بہنیں تھیں۔ بس پھر کیا تھا میری بیوی کا زیادہ وقت اُن کے ہاں گزرنے لگا۔ ویسے بھی گھر میں کون سا خاص کام ہوتا تھا۔ بچوں کے ساتھ مصروفیت ہوتی ہے ان کے چار بچے تھے دو بیٹیاں اور دو بیٹے۔ چھوٹا بیٹا چندو بمشکل ایک سال کا تھا بہت ہی پیارا بچہ تھا۔ خوامخواہ اس پر پیار آتا۔ میری بیوی کو تو جیسے کھلونا مل گیا۔ آدھا وقت چندو ہمارے گھر ہوتا اور آدھا وقت میری بیوی ان کے ہاں ہوتی۔ ان کے گھر جاتے ہوئے میری بیوی مجھے بھی گھسیٹتی میں اکثر ٹال جاتا کئی بار قاسم مجھے زبردستی لے جاتا۔

''تم گھر میں اکیلے کیا کرو گے۔۔۔؟ چلو گیتی نے آج پائے پکائے ہیں۔ شاہد اور اس کی بیوی بھی آئے ہیں؟ ناچار مجھے جانا پڑتا۔

وہ دونوں میاں بیوی بہت ملنسار اور محبت والے تھے۔ لیکن ہمارے ساتھ زیادہ اپنائیت رکھتے تھے۔ ایک تو میری بیوی کا رشتہ دار ہونا دوسرے شاید انہیں احساس تھا کہ بچوں کے بغیر ہماری زندگی سونی ہے۔

میں ان کے ہاں جاتا تو ایک لفظ نہ بول پاتا۔

قاسم میرا مذاق اڑاتا۔۔۔ ''یار سیفی۔۔۔ کیا بات ہے؟ بولنے پہ کوئی ٹیکس لگتا ہے جو تم اتنا کم بولتے ہو۔''

''کم بولنے والے اور یہ۔۔۔'' میری بیوی طنزیہ ہنستی۔ ''میرے ساتھ لڑتے ہوئے ان کی زبان چلتی دیکھا کریں۔ نہ جانے آپ کے گھر آ کر اتنے مہذب کیوں بنے رہتے ہیں۔''

''شاید سالی کے رعب میں آ جاتے ہیں'' قاسم نے فقرہ چست کیا۔

''کون سالی۔۔۔؟'' میں نے احمقوں کی طرح سوال کیا۔

''بھئی میں۔۔۔ آپ کی بیوی کی کزن ہوں تو آپ کی سالی ہوئی نا۔'' گیتی نے وضاحت کی۔

میں لاکھ کوشش کرتا کہ پہلے کی طرح گپ شپ لگاؤں۔ میں ایک نارمل انسان تھا۔ ہنسی مذاق کرتا تھا۔ لطیفے بازی، باتیں، قہقہے۔ اب نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ سب ہی میری اس تبدیلی کو محسوس کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اولاد نہ ہونے کا غم مجھے ستا رہا ہے۔ شکر ہے بھرم قائم تھا ورنہ کسی کو کیا بتاتا۔ یہ میرا خود کا ہی پاگل پن تھا۔ کاش یہ لوگ نہ آئے ہوتے ہم اپنی زندگی میں کتنے خوش تھے۔ بیچاری میری بیوی کو پتہ چلے تو نہ جانے اس کا کیا حال ہو۔

کلب میں جشن بہاراں تھا۔ خواتین کے اپنے پروگرام تھے۔ ڈانس، لڈیاں، ٹیبلو اور فینسی ڈریس شو وغیرہ۔ مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ میرا گھر کلب کے بالکل ساتھ تھا۔ میں اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اچانک ایک خوشبو کا جھونکا

آیا وہ اور میری بیوی باتیں کرتی ہمارے بیڈ روم میں چلی آئیں۔ مجھے دیکھ کر وہ جھجک کر دروازے میں رک گئی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ ''آ جاؤ یہ تو سو رہے ہیں'' میری بیوی نے اسے کمرے میں بلا لیا۔

''اسی غسل خانے میں آ جاؤ۔''

''ارے نہیں سیفی بھائی ڈسٹرب ہونگے۔ دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''یار اس میں پانی نہیں آ رہا۔۔۔آ جاؤ۔۔۔ان کی نیند بڑی پکی ہے۔''

''اتنی گرمی ہے کہ کوئی حد نہیں۔۔۔اوپر سے ناچ ناچ کر حشر ہو گیا ہے۔'' اس نے مجھے سوتا جان کر دوپٹہ اتار کر صوفے پر رکھ دیا۔ وہ دونوں غسل خانے میں گھس گئیں۔ وہ بیسن کے پاس کھڑی ہو کر جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھی۔ میں کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ بازو میں نے آنکھ پر رکھے ہوئے تھے۔ آنکھ کی جھری سے میں نے اسے دیکھا۔ شیفون کے ہلکے گلابی لباس میں وہ گلاب کی ادھ کھلی کلی لگ رہی تھی۔ پھر اس نے پائنچے اوپر کیے اور کھڑے کھڑے لوٹے سے پانی کی دھار پاؤں پر ڈالی۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ ان دودھیا بلوریں پاؤں سے لپٹ جاؤں۔

مجھے بہت دن ہو گئے تھے ان کے گھر گئے ہوئے۔ تقریباً روزانہ ہی کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی اور میں رات بھر کروٹیں بدلتا گزار دیتا۔ میرے دکھ کا کوئی مداوا نہیں تھا۔ کبھی دل چاہتا نوکری چھوڑ دوں اور واپس لاہور چلا جاؤں پھر سوچتا نوکریاں ملنی ویسے ہی مشکل ہو گئی ہیں اتنی اچھی نوکری چھوڑ کر کھائیں گے کہاں سے۔ کبھی سوچتا یہ لوگ یہاں آئے ہی کیوں۔

میری بیوی میرے دل پر لگے گھاؤ سے بے خبر۔ میرے لیے پریشان رہتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ میں بیمار ہوں۔ لاہور گئے تو زبردستی سارے ٹیسٹ کرائے سب کچھ ٹھیک تھا۔ میں اسے اپنا روگ کیا بتاتا بیچاری معصوم عورت۔ جو میری دشمن جان تھی وہ اس کی گوڑھی سہیلی تھی۔ میری بیوی دن رات ان کی تعریفوں میں رطب اللسان رہتی۔ گیتی کی خوبصورتی، گیتی کا سگھڑاپا، گیتی کی یہ بات گیتی کی وہ بات۔ قاسم بھائی کی شان میں ڈھیروں قصیدے اور سب سے بڑھ کر بچوں میں تو اس کی جان تھی خاص طور پر چندو۔

ان کے گھر جاتے تو دونوں میاں بیوی کھانا کھلائے بغیر ملنے نہیں دیتے تھے۔ میری کوشش ہوتی کہ کھانے سے پہلے نکل جائیں گیتی زبردستی بٹھا لیتی۔

''نہیں بھئی کھانا کھائے بغیر آپ نہیں جا سکتے۔ میز لگی ہوئی ہے۔''

میں گیتی کی شفقت، توجہ اور التفات کو عجیب عجیب معنی پہناتا۔ جیسے کھانے کی میز پر میری پلیٹ میں کچھ نہ کچھ ڈالتی جاتی میرے انکار کے باوجود وہ اصرار کرتی ''یہ مچھلی کا پیس لیں۔ میں نے خود فرائی کی ہے'' جیسے ماں اپنے بچے کی پلیٹ میں ڈالتی ہے یا کوئی محبوبہ اپنے محبوب کو کھلا کر خوش ہوتی ہے۔ جیسے ہی یہ احساس میرے دل میں جاگتا تو میں احساس ندامت سے زمین میں گڑ جاتا۔ اور دل ہی دل میں لاحول پڑھنے لگتا۔ جب وہ اپنے خاوند کی طرف پیار سے دیکھتی تو میرے دل پر سانپ لوٹ جاتا۔ دل کرتا وہ مجھے پیار سے دیکھے۔ عجیب دیوانی سوچیں تھیں میری۔ بلکہ شرمناک تھیں۔ ایک دوبار تو میں کھانا ادھورا چھوڑ کر طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر چلا آیا۔

ایک روز میری بیوی مجھ سے جھگڑ پڑی۔

''آخر آپ قاسم بھائی کے ہاں جانے سے اتنے گریزاں کیوں ہیں؟''

''تمہیں الہام ہوا ہے۔''

اُن دونوں نے گلہ کیا ہے خاص طور پر قاسم بھائی نے کہا ہے ''سیفی کو ہمارے ہاں آنا پسند نہیں ہے۔ ہم تو تمہیں اپنی بہن اور سیفی کو بھائی سمجھتے ہیں۔ ہمارے بچے خاص طور پر چندو تم لوگوں سے کتنا مانوس ہے۔ سارا دن (خالہ) آلہ آلہ کی رٹ لگائے رکھتا ہے۔ وہ دونوں بہت آزردہ تھے۔'' میری بیوی تقریباً رو ہی پڑی۔

''تم اور وہ دونوں ہی پاگل ہو۔ ان کے ہاں جانا کیوں ناپسند ہوگا۔ اتنے اچھے اور پرخلوص لوگ ہیں وہ۔''

''تو پھر ان کے ہاں جا کر عجیب وغریب حرکتوں کی وجہ؟ وہاں جاتے ہی آپ کو سانپ سونگھ جاتا ہے'' ''یار میں ان کی باتوں کے جواب تو دیتا ہوں۔''

''خاک! جی اور ہاں کے علاوہ ایک لفظ نہیں بولتے اور پھر جو کھانا ہی چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔''

''ایک دو بار ہی ایسا ہوا ہے۔ مجھے متلی ہو رہی تھی۔ کیا اچھا لگتا کھانے کے بیچ میں کوئی ڈرامہ کرتا'' میں چڑ کر بولا۔ ''اور کیا کرتا ہوں ان کے ہاں جا کر۔''

''اچانک بیٹھے بیٹھے اٹھ کر کبھی دیواروں پر ٹنگی ہوئی تصویریں دیکھنے لگتے ہیں۔ کبھی پردے ہاتھ میں لے کر ان کا جائزہ لینے لگتے ہیں۔ آپ پہلے تو ایسے نہیں تھے۔ آپ کے دل پر کیا بوجھ ہے مجھے بتائیں۔ ہم دونوں اچھے دوست بھی تو ہیں۔''

''یار کوئی بوجھ نہیں۔''

''میری آنکھوں میں دیکھ کر کہیں۔''

''آنکھوں میں دیکھنے سے کیا ہوگا؟''

''میں جانتی ہوں۔ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ بچہ نہ ہونے سے پریشان رہتے ہیں۔'' میں خاموش رہا۔

اس نے میرے گھٹنوں پر سر رکھ کر رونا شروع کر دیا۔

''پاگل ہو گئی ہو۔ نہیں بابا! مجھے نہ بچہ ہونے کا کوئی غم نہیں۔ وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ (میرے درد کا علاج بھی کسی کے پاس نہیں) چلو آؤ قاسم بھائی کے گھر چلیں'' میں نے اپنے آپ کو بشاش ظاہر کیا۔ میں اسے کیا بتاتا۔۔۔؟ کیسے بتاتا۔۔۔؟ اللہ نہ کرے میری وجہ سے اتنے

پیارے اور شفیق لوگوں کی زندگی میں زہر گھلے۔
روز ہی دعا مانگتا۔۔۔ یہ لوگ چلے جائیں یہاں سے۔۔۔ ورنہ میرا پاگل پن جانے کیا گل کھلائے۔ ابھی تو میرے دل کے گھاؤ کی کسی کو خبر نہیں ہے۔
اللہ کا کرم یہ ہوا کہ اچانک ہی قاسم کی پروموشن ہوگئی اور وہ کراچی ہیڈ آفس جا رہا تھا۔ یہ سن کر پہلے تو میرے دل پر کٹاری سی لگی کہ وہ عورت جو گزشتہ ڈیڑھ سال سے میرے رت جگوں کی مالک تھی میرے خوابوں خیالوں کا محور تھی چلی جائے گی۔ لیکن ساتھ ہی میں نے سکھ کا سانس بھی لیا کہ ہم سب کتنی بڑی انہونی اور پریشانی سے بچ گئے تھے۔ میری بیوی کا رورو کر بُرا حال تھا وہ لوگ بھی اداس تھے۔
وہ دونوں اتنے ہر دلعزیز تھے کہ کلب میں ہر روز اُن کے لیے الوداعی پارٹیاں ہو رہی تھیں۔ ہم نے بھی انہیں الوداعی پارٹی دی۔ اس روز وہ شفق رنگ ساڑھی جو ہی کے پھولوں سے سجے جوڑے اور کانوں میں مونگے کے آویزاں کے ساتھ کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ میں تو اسے نظر بھر کر دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ مبادا وہ خود یا کوئی میرے دل کا چور پکڑ لے۔ الوداعی کلمات میں گیتی نے سب کے شکریے کے علاوہ ایک ایسی بات کہی جس پر میں جھینپ گیا اور باقی سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔
"ہمارے جانے سے اور سب تو اداس ہوں گے لیکن سیفی بھائی شکرانے کے نفل پڑھیں گے۔ کیونکہ ہم نے ان کی بیگم کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔ (حسین ساحرہ کاش تم جان سکتیں تم نے یرغمال کسی اور کو بنایا ہوا ہے) ان کے جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔ سوچ سوچ کر میرا دل ڈوبتا رہتا۔ عجیب پاگل سوچیں مجھے گھیرے رکھتیں۔ نیند جیسے مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ مدھو کی وجہ سے دم سادھے پڑا رہتا۔ موسمی اثرات تھے یا پھر اندر لگی آگ سے ہی بخار نے مجھے آن گھیرا۔ دفتر سے چھٹی لے کر بستر میں ہی پڑا ہوا تھا۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ مجھ میں ڈاکٹر کے پاس جانے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ مدھو نے ڈاکٹر کو فون کیا تھا تو انہوں نے دو گھنٹے بعد آنے کا کہا۔ وہ پریشان ہو کر خود ہی ڈاکٹر کو لینے چل پڑی۔ حالانکہ میں نے منع کیا تھا کہ "معمولی بخار ہے۔ پیناڈول لے لیتا ہوں۔ بخار اتر جائے گا۔" پر وہ مانی ہی نہیں۔
مدھو کے جانے کے بعد میں نے جی بھر کے اپنے آپ کو ملامت کی۔
"مجھ سے کتنا پیار کرتی ہے۔۔۔ میں بھی تو کرتا ہوں۔۔۔ پر یہ۔۔۔ اب جو کچھ میرے دل و دماغ کی حالت ہے۔ اگر اسے معلوم پڑ جائے تو شاید صدمے سے جان دے دے۔ میں کتنا بُرا ہوں۔ پر میں کیا کروں۔۔۔؟ اگر گیتی اور قاسم جان لیں تو انہیں کتنا دکھ ہوگا۔ مجھے کتنا گھٹیا اور پرلے درجے کا نظر باز سمجھیں گے۔ میں کسی کو بھی نہیں سمجھا پاؤں گا۔" یا اللہ میرے دل سے گیتی کا خیال نکال دے"
سر کے درد میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے سر پر تکیہ رکھ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ برآمدے سے آواز آئی "مدھو کدھر ہو بھئی۔۔۔ صبح سے تم نے چکر ہی نہیں لگایا۔ وہ تمہارا لاڈلا چندو۔۔۔ رو رہا ہے۔ مجھے پینگ نہیں کرنے دے رہا۔۔۔"
وہ آوازیں دیتی میری موجودگی سے بے خبر کمرے میں چلی آئی۔
"ارے آپ ہیں۔۔۔ خیریت۔۔۔ آفس نہیں گئے۔۔۔ مدھو کدھر ہے۔۔۔؟"
"ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔۔۔"
"کیا ہوا مدھو کو۔۔۔؟ بیمار ہے وہ۔۔۔"
"نہیں۔۔۔ مجھے بخار ہے۔۔۔"
"اوہو۔۔۔ بخار کب سے ہے۔۔۔" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔
"غالباً رات ہی ہوا ہے۔۔۔" میں مری سی آواز میں بولا۔
"بلڈ ٹیسٹ کروالیں۔۔۔ آج کل ٹائیفائیڈ بہت پھیلا ہوا ہے۔"
"اچھا میں چلتی ہوں۔۔۔ وہ آئے تو اسے بتا دیں۔۔۔"
میرے سارے وجود پر ایک انجانا سا اضطراب چھا گیا۔ گرمی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اور دل ڈوبنے لگا۔ آنکھوں کے آگے ترمرے ناچنے لگے۔
"سیفی بھائی۔۔۔ سیفی بھائی۔۔۔ کیا ہوا؟ آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔۔۔"
میرے منہ سے یہ ہی نکل سکا "پانی۔۔۔ پانی۔۔۔"
"میں پانی لاتی ہوں۔۔۔" وہ پانی کا گلاس لے آئی۔
"یہ لیں سیفی بھائی پانی۔" میرا دل چاہا کہ گلاس کی بجائے اس کا ہاتھ پکڑ لوں اور دھاڑیں مار مار کر رو پڑوں۔
"میں قاسم کو فون کرتی ہوں" گیتی پریشانی سے بولی۔
"نہیں۔۔۔ پلیز قاسم کو پریشان مت کریں۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ مدھو بھی ڈاکٹر کو لے کر آتی ہوگی۔" میں چاہ رہا تھا میرے ضبط کے بندھ ٹوٹنے سے پہلے وہ چلی جائے۔
تھوڑی دیر بعد مدھو بھی آ گئی۔ "ڈاکٹر نے دوائی دے دی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے فکر کی کوئی بات نہیں۔ آج کل وائرس پھیلا ہوا ہے اور انہوں نے بلڈ ٹیسٹ کا کہا ہے۔ کلینک پر تو جیسے آدھی کالونی کے بچے بڑے بخار سے آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کلینک سے فارغ ہو کر گھر جاتے ہوئے آپ کو چیک کرتے جائیں گے۔"
"چلیں اٹھیں۔۔۔ یہ لیں دوائی کھالیں" میری حالت غیر دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی۔
"سیفی۔۔۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ میرے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اسے تسلی دینا چاہتا تھا مگر الفاظ میرے ہونٹوں تک آ کر رہ گئے اور میرا دل بھی بھر آیا۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر دیر تک روتے رہے۔ روتے رہے۔ پڑوس میں کوئی پرسوز لے میں بانسری بجا رہا تھا۔ باہر لان میں کسی پیڑ پر پپیہا درد بھری آواز میں پی کہاں۔۔۔ پی کہاں۔۔۔ کا راگ الاپ رہا تھا۔

بستر کی سلوٹیں

فرخندہ شمیم
(راولپنڈی)

اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ بشاشت میں گندھی انگڑائی لے کر جونہی وہ اٹھی، سامنے قدِ آدم آئینہ تھا۔ شب خوابی کے لباس سے لپٹے بٹن سرکش تھے۔ وہ بے حد شرما گئی جلدی سے بٹن سمیٹے اور اپنے بستر کی جانب نگاہ کی۔ چادر کی شکنیں ابھی تک سو رہی تھیں۔ رات جب وہ بستر پر لیٹی تھی تو بے شکن تھی چادر...... اتنا تو اُسے یاد تھا۔ پھر شاید چاند پورے کا پورے کمرے کی کھڑکی سے اندر چلا آیا تھا...... ستاروں کو ساتھ نہیں لایا تھا۔ ستارے بھی تو دخل درنامعقولات کے عادی ہوتے ہیں۔ چاند کے ساتھ البتہ سبک خرام ہوا ضرور اندر آئی تھی، زلفیں لہرانے، گال تھپتھپانے اور گدگدیاں کرنے کے لئے اُسے ساتھ آنا ہی تھا۔ گذشتہ رات گہری ہونے سے پہلے اس نے اپنے گھر والوں کے ساتھ شادی کی ایک تقریب میں شہنائی کی آواز بھی سنی تھی اور دلہن کے ساتھ تصویریں بھی بنوائی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ دلہن تازہ موسم میں کھلنے والا ترانہ تھی اور وہ جاتی بہار کے پیچھے نوحہ کرتی ہوئی آواز...... برسوں سے کسی ہنر مند مالی کا انتظار تھا جو زمین ہموار کرلے تاکہ گلستان کی شکل بنے لیکن باغبان کو شاید کسی طویل لگان نے پکڑ لیا تھا۔ وہ شرمیلی تھی خود سے کوئی مالی نہ ڈھونڈ سکی تھی۔

لیکن مجھے یہ سب کچھ بتانے کا حق نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے صرف وہ کہنا ہے جو قدِ آدم آئینے کے سامنے بیٹھی عورت اپنی بیتی رات کے بارے میں کہنا چاہتی ہے۔ اب سب کچھ مختلف تھا۔ وہ تازہ دم تھی۔ صبح سویرے ناشتے سے پہلے اپنے کمرے میں یوگا کرتی تھی۔ دالان میں بھی کر سکتی تھی لیکن اب بھابی اُسے کنکھیوں سے دیکھنے لگی تھیں۔ ایک بار انہوں نے کہا تھا۔ ''یوگا جاتی جوانی کو کب واپس لایا ہے''۔ تب وہ بھابی کی کم علمی پر ہنس پڑی تھی۔ بے علم عورتیں سمجھتی ہیں یوگا شادی کے لئے فٹ ہونے کا نام ہے۔ لیکن یہ چار سال پرانی بات ہے۔ اب تو وہ بھابی کی طنزیہ نظروں کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھی۔ پچھلے چار سالوں کی خوفناک تنہائیوں نے اُسے بے حد پژمردہ کر دیا تھا۔ اس میں دفاع کی صلاحیت اسی طرح ختم ہوگئی تھی جس طرح ہائیڈروبم کے سامنے انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ بارود کھانے کے باوجود زندگی کی خواہش فوت نہیں ہوتی۔ وہ بھی ابھی مری نہیں تھی...... کچھ سال کوما میں رہ کر لوٹ آئی تھی۔ البتہ گھر کے لوگوں کو اس کے لوٹ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ماں ہوتی تو شاید جشن صحت مناتی یا نذر بانٹتی...... لیکن اب وہ اپنی نظر خود ہی اتارنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ جس میں آئینہ اس کا مددگار تھا۔

خود کا خیال رکھتے رکھتے وہ خوبصورت ہو چلی تھی...... آفس کے لوگ اُسے مڑ کر دوبارہ دیکھنے لگے تھے۔ جدید طرز کے تراشیدہ بال اس کے رخسار چومتے تو لگتا نہیں تھا کہ وہ پچاس کے پیٹے میں ہے۔ البتہ وہ خود چالیس سے آگے جان بوجھ کر گنتی بھول جاتی تھی۔

لوگوں کو اس کی زندگی معمہ لگتی لیکن وہ سوچتی وہ تو اتنی سی پہیلی بھی نہیں ہے کہ لوگ اُسے بوجھتے۔ آخر اس نے سب کچھ چھوڑ دیا اور بستر میں رہنے لگی۔ چادر روز بدلتی تھی اور تکیے کے ٹوٹے بدن کو صبح صبح پہلے جوڑتی اور پھر ناشتہ کر کے تازہ دم دفتر جاتی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے نکھرتی کھلکھلاہٹ لوگوں کو نجانے کیا کیا پیغام دیتی لیکن وہ تو ایک چپ چاپ کھڑا پوسٹ بکس تھی جس میں خط محفوظ رہتے ہیں۔

ہر روز سرِ شام ہی وہ اس کے کمرے میں اس کا انتظار کرتا تھا۔

کبھی سنگھار میز پر گلاب رکھ دیتا تو کبھی کھلی کتاب میں پروں والا پین، دفتر سے آ کر وہ جب سنگھار میز کے سامنے دن بھر کے قیدی بال آزاد کرتی تو وہ جھٹ سے اس کے بالوں کا اسیر ہو جاتا۔ کپڑے بدلنے کی باری آتی تو وہ جلدی سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا، ہر وقت ساتھ رہنے والے اس نے کبھی اُسے غسل کرتے نہیں دیکھا تھا کیوں کہ اس کے باتھ روم جاتے ہی وہ دروازہ کھٹاک سے بند کر دیتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں خوبصورت مرد تھا اور وجاہت کے قطرے جگہ جگہ نہیں پھینکتا تھا۔

بھابی کبھی کبھار کسی کھوج میں اس کا کمرہ چھاننے آتی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کمرے میں کوئی بھی دوسرا ذی نفس نہیں ہے۔ انہیں بڑی مایوسی ہوتی جب وہ اس کے کمرے کو کسی خانقاہ کی طرح پاکیزہ پاتیں...... نہ تصویریں، نہ ہیجانی فلمیں، نہ مسرت آگیں اعضاء اور نہ کمرے کی مکین کا جنونی تنفّس جسے دفتر جاتے ہوئے وہ کمرے میں چھوڑ جائے...... بستر کی چادر تک بے سلوٹ...... جیسے اُسے کسی اہم پاکیزگی کے ساتھ چھوا گیا ہو۔ بھابی منہ بسورتی لوٹ جاتیں۔ اصل میں تو یہ سب ہنگامے تو رات بھیگنے پر بپا ہوتے تھے دروازہ بند ہوتے ہی بال الجھ جاتے تھے، کپڑے ترتیب کھو دیتے تھے۔ سنگھار میز تتر بتر ہو جاتا تھا، سائڈ ٹیبل پر رکھا دودھ سرد پڑ جاتا، پھل کتر لئے جاتے اور پانی کا جگ خالی ہو جاتا لیکن پچھلی رات تو غضب ہی ہو گیا...... گھر والوں کے ساتھ شادی کے گھر سے رات گئے کیا لوٹی، اس کا اپنا ہنی مون چاند پر پہنچ گیا...... جھلملاتا لباس بدلنے کی نوبت بھی نہیں آئی، سینڈل پاؤں میں ہی جکڑے رہ گئے بالوں کی پرمنگ نہ کھل سکی، سنگھار چہرے پر چسپاں رہ گیا، ہونٹ کٹنے لگے بستر کی چادر فرطِ نشاط کی تاب نہ لاتے ہوئے تار تار ہوگئی...... وہ دیر تک بے سدھ رہی۔ بے انتہا حسین لگا اُسے اپنا آپ...... بال سمیٹتی اور گنگناتی جب وہ بالکنی میں آئی تو دوسری بالکنی میں وہی نوبیاہتا جوڑا اپنی پہلی صبح ایک دوسرے سے پیٹھ کیے کھڑا تھا۔ بے زاری گندے پرنالے کی طرح چہروں سے بہہ رہی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرائی، اچھا ہوا مجھے سچ مچ کا دولہا نہیں ملا۔

بُو

سیدنصرت بخاری
(راولپنڈی)

آناً فاناً یہ خبر ہر گھر کی دہلیز پار کرگئی کہ دارے کی بیوی گھر چھوڑ کر چلی گئی۔دارے کی بیوی نے گھر اس لیے چھوڑا تھا کہ دارااپنا مردانہ پن کہیں پچھلے جنم میں چھوڑ آیا تھا۔شادی کے چار چھ مہینے خواہشات راہ دیکھتی رہیں لیکن جب دارے کے قدم آگے نہ بڑھے تو دلھن نے خود ہی پیش قدمی کی لیکن ہاتھ کچھ نہ آیا۔علاج بھی آزمایا گیا لیکن کوئی دواسوکھی شاخ پر بہار نہ لاسکی۔

''اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرسکتا؛اور میرا مشورہ یہ ہے کہ اس کیس پر اور پیسا برباد نہ کریں۔ہم ڈاکٹروں کا کیا ہے،فیس لے کر دوائیں لکھتے جائیں گے لیکن سچ بات یہی ہے کہ جو دوائیاں میں تجویز کرچکا ہوں،اس سے بہتر دوائیں ابھی بازار میں نہیں''۔ایک نیک دل ڈاکٹر نے اپنی حد تک سچی اور کھری بات کہہ کر ان کا مزید خرچ بچالیا۔

جب دلھن کو یقین ہوگیا کہ دارے کی مردانگی کی واپسی ممکن نہیں تو اُس نے پہلے دبے لفظوں اور بعد میں واضح طور پر اپنی ماں سے کہہ دیا کہ طلاق کا مطالبہ کیا جائے۔چنانچہ اس کے والدین کو اس کا ہم نوا بننا پڑا۔

''بہن! ہم نے تو بڑے پیار سے رشتہ دیا تھا لیکن اللہ کو جو منظور۔ آپ سے بس اتنی التجا ہے کہ جس محبت سے ہم نے رشتہ جوڑا تھا؛اسی طرح ہماری بیٹی کو آزاد کردیں''۔

''بہن! آپ ٹھیک کہتی ہیں لیکن اگر کچھ اور وقت دے دیں۔علاج جاری ہے۔اللہ سے ناامید نہیں ہونا چاہیے''۔

''آپ سے کوئی گلہ نہیں؛ہمیں پتا ہے کہ آپ نے علاج معالجے میں کوئی کوتاہی نہیں کی؛لیکن نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔اگر دارے کی تن درستی کا امکان ہوتا تو ہم اپنی بیٹی کا گھر کیوں اجاڑتے''۔

جب دارے کے والدین نے ٹال مٹول سے کام لیا تو دلھن کے والدین نے خاندان کے بڑوں سے رجوع کیا۔یہیں سے راز کا سینہ چاک ہوا اور بات گھر سے باہر نکل کر گلی کوچوں میں پھیل گئی کہ دارے کے پاس مردانگی کی سند نہیں۔بس پھر کیا تھا لوگوں نے تسلی،دلاسا دینے کی بجائے چھیڑ خانی شروع کر دی۔ان کے ذومعنی جملے دارے کے دماغ میں پیوست ہوجاتے۔وہ جوں ہی گھر سے باہر قدم رکھتا،کوئی نہ کوئی طعنہ اس کا منتظر ہوتا:

''ارے بھیا خالی پستول لیے پھرتے ہو۔میگزین کہیں رکھ کے بھول گئے ہو۔لیکن فکر نہ کرو ہم ہیں نا؛یاروں کے یار؛جب بھی ضرورت پڑی ہمارا پستول لے جانا؛ہر وقت لوڈ رہتا ہے''۔ایک پڑوسی نے دارے کو چھیڑا

''ارے نہیں دوستو۔اس شریف آدمی پر الزام نہ لگاؤ۔اس نے تو سردی کا توڑ کرنے کے لیے شادی کی تھی''۔دوسرے نے ہمدردی جتائی

''ہم بھی کہیں کہ یہ تین تین مہینے نہاتا کیوں نہیں''۔ایک اور واقف کار نے نشتر چبھویا

"اوئے نہائیں اس کے دشمن۔جون جولائی میں اس کو نمونیا ہوگیا تو''۔

لوگوں کے لفظ مسلسل دارے کا سینہ چھلنی کرتے رہے۔ان کے قہقہے دور تک اس کا تعاقب کرتے۔کچھ دن تو وہ ایسے بے ہودہ لوگوں سے لڑائی جھگڑا کرتا رہا؛لیکن جب دیکھا کہ اس کا اُلٹا اثر ہوتا ہے تو تنگ آ کر گاؤں سے نکل آیا؛گاؤں کی محبت اسے دور تک چھوڑنے آئی۔وہ مسلسل چلے جارہا تھا۔اس کی کوئی منزل نہ تھی۔اس کا صرف ایک مقصد تھا کہ وہ ان لوگوں سے اتنی دور چلا جائے کہ زندگی میں کبھی سامنا نہ ہو۔کچھ دن اِدھرُ ادھر مارا مارا پھرتا رہا؛آخر کار ایک بس اسے شہر میں لے آئی۔مزدور آدمی تھا،مزدوری کرنا اس کے لیے مشکل نہ تھا لیکن اجنبیت نے مزدوری کا حصول مشکل بنادیا۔ایک دن اس سستے ہوٹل میں جہاں روز کھانا کھاتا تھا،اپنے اردگرد ماضی،حال اور مستقبل بچھائے سوچ میں گم تھا کہ ہوٹل کا مالک اسے پریشان دیکھ کر اس کے پاس آبیٹھا:

''کہو بھئی! کیوں پریشان ہو''۔اس نے اس سے ہم دردانہ لہجے میں پوچھا

''نہیں نہیں،کوئی خاص بات نہیں''۔

''کہاں سے آئے ہو اور یہاں کیا کرتے ہو۔میں چند دن سے تمھیں یہاں دیکھ رہا ہوں۔اس شہر میں اجنبی معلوم ہوتے ہو''۔

''مزدوری کے لیے یہاں آیا تھا لیکن مزدوری ملتی ہی نہیں''۔

''تم میرے پاس ہوٹل میں کام کرو۔مجھے ایک محنتی اور ایمان دار آدمی کی ضرورت ہے''۔

دارا اس ہوٹل میں ملازمت کرنے لگا۔مالک کا رویہ اس کے ساتھ ہمدردانہ اور مشفقانہ تھا۔اس نے محسوس کیا تین مہینے ہوگئے دارے کا گھر جانے کا مطالبہ بیدار نہیں ہوا جب کہ باقی ملازمین کی چھٹی کی آرزو ہفتے بعد چہرے پر سجی رہتی ہے۔ایک دن اس نے دارے کو بلا کر پوچھا:

'مناں! سب لوگ مہینے ڈیڑھ مہینے بعد گھر جاتے ہیں لیکن تم نہ کبھی گھر گئے نہ چھٹی کا تقاضا کیا۔تمھارا گھر بار،بیوی بچے نہیں ہیں یا روپے پیسے کا مسئلہ ہے''؟

''بیوی تو ہے لیکن بچے نہیں ہیں۔پیسوں کا بھی کوئی مسئلہ نہیں''۔

''بیوی کے ہوتے ہوئے یہاں پڑے رہتے ہو،اس کی یاد کبھی نہیں آئی''۔

دارا مالک کے سوالات سے گھبرا کر وہاں سے کھسک آیا کہ مبادا اس کو اس بات کا پتا چل جائے جس کی وجہ سے اس نے اپنا علاقہ چھوڑا تھا۔لیکن یہ راز

بھی زیادہ عرصہ دارے کا پردہ نہ رکھ سکا۔ ہوا یہ کہ دارے کے گاؤں کے ایک آدمی نے اسے اس ہوٹل پر کام کرتے دیکھ لیا۔ اور اس نے اس کے گھر والوں کو بتا دیا۔ وہ اس کو ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ فوراً یہاں پہنچے اور دارے کو واپس چلنے کو کہا۔

''میں نہیں جاؤں گا''۔

''ارے بے وقوف! گاؤں میں اس طرح کا تو کوئی پہلا آدمی ہے۔ اور باقی لوگوں نے کیا گھر بار چھوڑ دیا ہے۔ یہ لوگ چار دن کہانیاں بنائیں گے، پھر خاموش ہو جائیں گے''۔

''تُو لوگوں کی بات پر دھیان ہی نہ دے۔ تو گالیاں دیتا ہے تو وہ تجھے اور چھیڑتے ہیں۔ دفع کر جانے دے اور گھر چل''۔

لیکن دارا جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ ہوٹل کے مالک کو پہلے ہی شبہ تھا کہ کوئی وجہ ضرور ہے جس کی وجہ سے دارا گھر نہیں جا رہا۔ اب بات کھلی تو اس نے بھی دارے کو گھر جانے کا مشورہ دیا۔

''جا میرا شیر۔ دو چار دن بعد آ جانا''۔

زہر کھا لوں گا لیکن گاؤں نہیں جاؤں گا''۔ دارے کا فیصلہ اٹل تھا۔

دارا ہوٹل پر کام کرتا رہا لیکن جب ہوٹل کے مالک نے ہوٹل بیچنے کی بات کی تو پریشانی نے دارے کے چہرے پر قبضہ جما لیا۔

''میری مان تو اب واپس چلا جا۔ تیرے ساتھ اچھا وقت گزرا ہے۔ غلط مشورہ نہیں دوں گا''۔

''واپس تو اب میری لاش جائے گی''۔

''ساری دنیا میری طرح نہیں ہے۔ کہیں کوئی ایسا پھنسا دے گا کہ ساری زندگی پچھتاتے رہو گے''۔

جب دارا کسی طرح واپس جانے پر راضی نہ ہوا تو ہوٹل کا مالک جس گوالے سے دودھ لیتا تھا، دارے کو اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے گوالے کو دارے کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ اسے بھی ایسے ہی بے ضرر انسان کی ضرورت تھی، کیوں کہ بھینسوں کا کاروبار اسے دور دراز کی منڈیوں میں لے جاتا تھا، جہاں سے فوراً واپسی ناممکن ہوتی تھی؛ کئی کئی ہفتے منڈیوں کی نذر ہو جاتے۔

گوالے کے پاس دو تین اعلیٰ نسل کے بھینسے بھی تھے اس لیے اس کے باڑے میں معقول معاوضے پر نسل کشی کے لیے بھینسوں کی آمدورفت رہتی تھی۔ دارے کو یہی کام دیا گیا۔ اس ملازمت کے دوران میں اسے ایک تجربہ یہ بھی ہوا کہ جس بھینس سے ایک مخصوص قسم کی بو آتی ہو، وہ بھینسے کو خوش دلی سے قبول کرتی ہے، اور اس کی بو بھینسے کا اضطراب بڑھا دیتی ہے۔ ایک دن ایسی ہی ایک بھینس لائی گئی۔ بھینسے کی بے تابی اور بھینس کی آمادگی کی وجہ سے دارے کے اندر ایک تبدیلی نے سر اُٹھایا۔ اسے یوں لگا جیسے بھینسے کا جوش آہستہ آہستہ اس میں سرایت کر رہا ہے۔ پہلی بار اس کی آنکھوں نے اس منظر میں دل چسپی لی۔ اسی دوران میں پہلی بار خزاں رسیدہ شاخ نے پُر بہار ہونے کا اعلان کیا۔ یہ اس کے لیے نیا تجربہ تھا۔ جسم کے اس حصے میں اس سے پہلے کبھی ایسا لذت آمیز ہیجان پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ بے زاری سے یہ فرض انجام دے رہا تھا۔ لیکن اب تو اسے اس کام میں مزا آنے لگا۔ اس کی آنکھیں اس منظر کی منتظر رہنے لگیں۔ پہلے اسے ایک ندامت اور خوف عورت کی طرف دیکھنے سے منع کرتے تھے لیکن اب اسے عورت کی کشش مضطرب کرنے لگی تھی۔ عورت اسے اس بے چین بھینس کی طرح نظر آنے لگی جس کی تیز چلتی ہوئی سانس بھینسے کے اندر بجلی بھر دیتی تھی۔ اس وقت بھی دارے کے ارد گرد یہی خیالات تصویر بنے بیٹھے تھے کہ گوالے کی آواز مخل ہوئی:

''ارے بھئی دارے کہاں ہو''

''یہاں ہوں جی۔ بھینسوں کے لیے چارہ کاٹ رہا ہوں''

''میں کل منڈی جا رہا ہوں۔ تم یہاں کا خیال رکھنا''

''کیا کوئی بھینس خریدنی ہے''؟

'ارادہ تو نہیں ہے؛ لیکن کوئی جانور پسند آ گیا تو خرید لوں گا۔ اپنی پارٹی جا رہی ہے نا۔ ان کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ تم یہاں کا خیال رکھنا۔ ہو سکتا ہے مجھے دو تین دن لگ جائیں۔ تم یہ پیسے رکھ لو اور ضرورت ہو تو بھابھی سے لے لینا''۔

گوالہ دو تین دن کا کہہ کر گیا تھا لیکن آج اسے گئے بیسواں روز تھا، لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی؛ اگرچہ کاروباری مصروفیت اسے اگلے علاقے کی منڈیوں میں لے گئی تھی لیکن موبائل پر بات ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی دارا اُسی سے بات کر رہا تھا کہ گوالے کی بیوی آ گئی۔

''لیجیے؛ ادھر آپ نے بھابھی کو یاد کیا ادھر وہ آ گئیں۔ ان سے بات کر لیں'' دارے نے اس کی بیوی کو موبائل دیتے ہوئے کہا۔

گوالے کی بیوی حسب معمول دارے کے لیے کھانا لائی تھی۔ دارا کھانا کھانے لگا اور وہ دونوں میاں بیوی آپس میں باتیں کرنے لگے۔ خدا جانے گوالے کی کس بات پر بیوی نے قہقہہ لگایا اور اس کے ساتھ ہی دارے کو اس کے بدن سے اچانک پھوٹنے والی بُو نے گھیر لیا جو آمادہ بھینس کے بدن سے پھوٹتی تھی۔ دارے نے اس بو کی گرفت سے نکلنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کے اندر بھینسے کا اضطراب سرایت کر چکا تھا۔

''ذہین ترین لوگ''

''ذہین'' ترین لوگوں کو ہمیشہ اوسط درجے کے افراط کی شدید ''مخالفت'' اور ''تشدد'' کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ادارے کے مضبوط لوگ اس طرح کی باتوں کو خاطر میں لائے بغیر منزل پر نگاہ مرکوز رکھتے ہیں۔

(البرٹ آئن اسٹائن)

''گلشن کانکھار''

عرش صہبائی

(جموں، کشمیر)

کیا غمِ روزگار دیتا ہے ذہن کو انتشار دیتا ہے
جو اَنا اپنی مار دیتا ہے زندگی کو سنوار دیتا ہے
قرب اُس کا بہار دیتا ہے موسمِ خوشگوار دیتا ہے
آدمی مختلف سی سوچوں میں عمر ساری گزار دیتا ہے
جو بھی کرتا ہے اپنی مرضی سے وہ کسے اختیار دیتا ہے
یہ زمانہ وفا پرستوں کا حسرتوں کے مزار دیتا ہے
دفعتاً اُس کا مسکرا دینا دل کو کتنا قرار دیتا ہے
اور باتیں بھی ہیں کئی لیکن اُس کا انداز مار دیتا ہے
کیا کہوں اُس کو جب ملے فرصت دل کو غم بے شمار دیتا ہے
منزلوں کا پتہ بسا اوقات راستے کا غبار دیتا ہے
جب بھی ملتا ہے غم گسار کوئی زخم دیتا ہے خار دیتا ہے
دل سے اُس کو قبول کرتا ہوں جو بھی پروردگار دیتا ہے
جو محبت کرے وہ دانستہ دل کی ہر بازی ہار دیتا ہے
اُن کا ہوتا نہیں جواب کوئی وہ جو نقطے اُبھار دیتا ہے
جب کبھی وہ گزرتا ہے اس سے گلستاں کو نکھار دیتا ہے
بارہا دل کو انتظار اُس کا لذّتِ انتظار دیتا ہے
جب اُسے مجھ کو آزمانا ہو مجھ کو صدمے ہزار دیتا ہے
ذکر کر کے مری وفاؤں کا عرشؔ وہ مجھ کو مار دیتا ہے

○

نوید سروشؔ

(میرپور خاص)

گھر تک تیرے ساتھ مری حیرانی جائے گی مجھ سے تیری صورت پھر پہچانی جائے گی
دوست سمجھتے ہیں کہ کتنا خوش رہتا ہوں میری سچائی ان سے کب جانی جائے گی
ڈر جاتا ہوں اور یہ سن کر سوچتا رہتا ہوں کب اہلِ دانش کی یہ نادانی جائے گی
کب سے میرے شہر کے ہیں یہ سارے لوگ اداس موسمِ گل کی جانے کب ویرانی جائے گی
محفل سے جب چاہنے والے چلے گئے سب لوگ چاند ستاروں کی بھی اب تابانی جائے گی
یاد، سروشؔ ہے آج بھی ہم کو ہجرت کا وہ کرب اک نہ اک دن بات ہماری مانی جائے گی

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

رہوں میں ناؤ میں، ساحل پہ شام کرتی ہوں
میں انتساب سمندر کے نام کرتی ہوں

رِدا ہوا کی اُڑا لے دلوں سے گرد و غبار
اِک ایسی شام کا ہی اہتمام کرتی ہوں

رہے نہ کوئی مسافر اکیلا ساحل پر
اُسی کے پار اُترنے کا کام کرتی ہوں

جو حرف حرف دیئے پانیوں پہ بجھنے لگے
تو اپنی آج کی سطریں تمام کرتی ہوں

ہو خواب خواب جزیرہ مگر رسائی میں
کچھ ایسے پہلو سے ہی اِنصرام کرتی ہوں!

○

رفیع الدین ذکی قریشی

(لاہور)

جو ڈوبا ئے کی اُفسوں کاریوں میں
کٹی عمر اُس کی بادہ خواریوں میں

زمانہ غرق ہوتا جا رہا ہے
نشاط آثار عصیاں کاریوں میں

نہ جا احباب کی غم خواریوں پر
رِیا شامل ہے اِن غم خواریوں میں

سُنی ہیں غور سے واعظ کی باتیں؟
گھلا ہے زہر خوش گفتاریوں میں

فِدا کیوں دل ہُوا ہے، اُس پہ جس کو
مزا آتا ہے دل آزاریوں میں

ملا کر خواب گوں آنکھوں سے آنکھیں
بَسر کی عمر شب بیداریوں میں

ملے گا کیا تجھے اے دیدۂ تر!
شبانہ روز گوہر کاریوں میں

حریفِ گلستاں دامن ہے جس سے
لُہو دل کا ہے ان گُل کاریوں میں

ذکی! کرتے تھے جو دعویٰ اَنا کا
شمار اُن کا ہے اب درباریوں میں

○

احسان قادر

(لاہور)

ہم نے پتھر سے بت بنائے ہیں
اور پھر ان سے زخم کھائے ہیں

ہم کو صحرا سے خوف کیوں کر ہو
ہم نے صحرا میں گُل کھلائے ہیں

ہم نے بانٹی ہیں شہر میں خوشیاں
پھر پرندوں نے گیت گائے ہیں

یہ محبت ہے جس کے دم سے فقط
ہم خدا پر یقین لائے ہیں

سر کو تن سے جدا ہی ہونا تھا
لوگ دستار لے کے آئے ہیں

اپنے زخموں کو جب ہرا دیکھا
وہ اسی لمحے یاد آئے ہیں

ہم کو اپنی تلاش تھی قادر
الغرض خود کو ڈھونڈ لائے ہیں

○

عارف شفیق

(کراچی)

کیسا ماتم کیسا رونا مٹی کا ٹوٹ گیا ہے ایک کھلونا مٹی کا
اتروں گا آفاق سے جب میں دھرتی پر بھرلوں گا دامن میں سونا مٹی کا
مر کر بھی کب اس سے رشتہ ٹوٹے گا میرا ہونا بھی ہے ہونا مٹی کا
اک دن مٹی اوڑھ کے مجھ کو سونا ہے کیا غم جو ہے آج بچھونا مٹی کا
آنکھوں میں مت رکھنا اس کی یاد کا چاند دریاؤں میں خواب نہ بونا مٹی کا
اس کا سندر روپ ہے سونے چاندی سا میرے گھر کا ہر اک کونا مٹی کا
پھر دھرتی کی چاہت کے تم لکھنا گیت پہلے دل میں درد سمونا مٹی کا
آزادی کی خواہش زندہ رکھنے کو پلکوں پر اک خواب پرونا مٹی کا
اونچا اڑنے کی خواہش میں تم عارفؔ ماؤں جیسا پیار نہ کھونا مٹی کا

○

زیبا سعید

(کراچی)

سر پہ جو آسماں ہے کیا کہیے مُفت کا سائباں ہے کیا کہیے
نام جس کا یہاں پہ ہے دنیا بزمِ سود و زیاں ہے کیا کہیے
اللہ اللہ نگاہ دنیا کی سوئے پیر و جواں ہے کیا کہیے
کھا رہی ہے خزاں گلستاں کو خواب میں باغباں ہے کیا کہیے
اے خرابی کہ برق کی زد میں میرا ہی آشیاں ہے کیا کہیے
جادۂ حسنِ یار کے صدقے زیرِ پا کہکشاں ہے کیا کہیے
عمر گزری تلاش میں جس کی اب وہ زیباؔ کہاں ہے کیا کہیے

○

ملک محمد انور

(واہ کینٹ)

چین آنا محال کرتا ہے من ہزاروں سوال کرتا ہے
عشق مظلوم ہے زمانوں سے ظلم حسن و جمال کرتا ہے
اک اشارہ تمہاری آنکھوں کا سانس اُکھڑی بحال کرتا ہے
قلب کا حال تو خُدا جانے گفتگو بے مثال کرتا ہے
کج زباں کے اذاں نہ دینے پہ وقت رُک کر کمال کرتا ہے
آج کل دَہر میں وفا انور آدمی خال خال کرتا ہے

○

وشال کھلر

(لدھیانہ، بھارت)

کمالِ شبنم ہوا کے جیسا　　خدا نہیں پر خدا کے جیسا
دھنک دھنک ابر بولتا ہے　　وہ ایک منظر صدا کے جیسا
نہ اس کی ہستی زمیں کی جانب　　نہ آسماں ہے ردا کے جیسا
اداس ہونا ہوا کا تھمنا　　یوں اس کا ہنسنا فضا کے جیسا
یہ زندگی بھی اسی نے دی ہے　　جو آگے چل کر قضا کے جیسا

○

ڈاکٹرعلینی وبھانازلی

(ہمیر پور، بھارت)

چلو اس دل کو پھر بچّہ بنا کر دیکھتے ہیں　　کھلونوں سے ہی اپنا دل لگا کر دیکھتے ہیں
چلیں گلشن کی جانب تتلیوں سے کھیلنے کو　　ہتھیلی پر اُنہیں اپنی بٹھا کر دیکھتے ہیں
سمندر کے کنارے بیٹھ کر، لہروں کو دیکھیں　　سُنیں کچھ ان کی، کچھ اپنا سُنا کر دیکھتے ہیں
چلیں دالان میں بیٹھیں، کریں کچھ گفتگو ہم　　مکاں کو آج اپنے، گھر بنا کر دیکھتے ہیں
اُسے وہ غم، اِسے یہ غم۔سبھی ہیں غم کے مارے　　چلیں، سب اپنے اپنے غم بُھلا کر دیکھتے ہیں
بدل کر زاویے اک بار بھولیں رنجشوں کو　　کھُلی سی اس فضا میں جھوم گا کر دیکھتے ہیں
نہ موبائل، نہ کمپیوٹر، نہ دیکھیں آج ٹی وی　　کتابوں سے ذرا نظریں ہٹا کر دیکھتے ہیں
اکیلے میں کریں کچھ بات دیواروں سے دل کی　　ذرا تنہائی میں آنسو بہا کر دیکھتے ہیں
ہماری داستاں ہونا زلی! کیوں سب پہ ظاہر؟　　ہم اپنے زخم دنیا سے چھپا کر دیکھتے ہیں

○

آفتاب خان

(لاہور)

وہ کیسا جام پلا کر نشے میں چھوڑ گیا　　خمار حد سے زیادہ رگوں میں دوڑ گیا
میں اپنی ذات کے صحرا میں ناچتا ہی رہا　　یہ کس زمین سے درویش ربط جوڑ گیا
ذرا سا رُک مرے چہرے پہ پھونک مار نہیں　　بدن کا سارا لہو خوبرو نچوڑ گیا
چلا گیا ہوں ہوا میں اُچھال کر سکّے　　اور اپنے ہاتھ سے کشکول بھی مَیں توڑ گیا
نہ تھا خیال اُسے میری پارسائی کا　　نظر ملا بھی گیا عشق سے بھی جوڑ گیا
یہ صرف دل کے بکھرنے کا احتجاج نہیں　　غضب تو یہ ہے کلائی بھی وہ مروڑ گیا
یہ آفتاؔب سے پوچھو کہ روشنی کیا ہے؟　　مسافروں کو وہی منزلوں سے جوڑ گیا

○

انیس الرحمٰن (سکھر)

جستجوئے زندگی کرتے رہو — یوں غموں کو تم خوشی کرتے رہو
مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لیے — آنسوؤں میں تم کمی کرتے رہو
دشمنوں سے بھی نبھاؤ پیار سے — دوستوں سے دوستی کرتے رہو
زندگی آسان ہو جائے گی یار! — خواہشوں میں بس کمی کرتے رہو
دُور ہوں گی جہل کی تاریکیاں — فکرِ نَو کی روشنی کرتے رہو
مشورے کیوں! صاحبانِ عقل سے — کر رہے جو ، وہی کرتے رہو
کیا صِلہ دے گی تمھیں دنیا انیسؔ! — بس! فروغِ آگہی کرتے رہو

○

عُشّاق کشتواڑی (جموں، کشمیر)

لہو کی ندیاں شباب پر ہیں، رَواں اِدھر بھی رَواں اُدھر بھی — مقامِ حسرت کہ مر رہے ہَیں ، جواں اِدھر بھی جواں اُدھر بھی
زمین آتش اُگل رہی ہے، فلک سے شعلے برس رہے ہیں — ہَیں دونوں جانبِ فراق میں کیا، کِساں اِدھر بھی کِساں اُدھر بھی
اِدھر کہ مانا جمہُوریت ہے، ہے طرزِ ایسا ہی اُدھر بھی لیکن — ہے فرعونؔ مزازی کا سوز پرور، سماں اِدھر بھی سماں اُدھر بھی
زمیں پریشاں زمن بھی حیراں، یہ کُشت وخوں یہ تضاد کیا ہے — یہ کَس ہوَس میں بشر ہے غلطاں، میاں اِدھر بھی میاں اُدھر بھی
چلے گا ایٹم اگر اُدھر سے، چلے گا کیوں نہ وہی اِدھر سے — بنے گا ہیروشِماؔ اِدھر گر، بنے گا ہیروشِماؔ اُدھر بھی
اے بندگانِ خُدائے برتر، بپا نہ محشر کرو زمیں پر — تصادموں سے جلے ہیں اکثر، مکاں اِدھر بھی مکاں اُدھر بھی
خلافِ قدرت کریں جو ہم کُچھ، اصولِ قدرت کے ہے منافی — عمل سے ایسے نصیب ہوگا، زِیاں اِدھر بھی زِیاں اُدھر بھی
امن سے رہنا ہی مصلحت ہے، اسی سے تاباں جہان ہوگا — اِسی سے ہوگا عروج پر پھر، زماں اِدھر بھی زماں اُدھر بھی
ضِیائے مہر مہ سے روشن، زمیں اِدھر کی زمیں اُدھر کی — اِنہیں کے فیض وکرم سے قائم ہے جہاں اِدھر بھی جہاں اُدھر بھی

○

مسعود تنہا (سرگودھا)

(خواجہ الطاف حسین حالیؔ کی نذر)

کان دھرتے نہیں صداؤں پر — ''اُڑتے پھرتے ہیں جو ہواؤں پر''
اب علاجِ غمِ حیات کہاں؟ — اکتفا کیجیے دُعاؤں پر
کتنے عشاق مر گئے ہوں گے — تیری اِن دلنشیں اداؤں پر
لوگ ہنستے ہیں، طنز کرتے ہیں — مفلسوں کی پھٹی قباؤں پر
کر گئے ہیں مجھے سبھی تنہاؔ — دُکھ ہوا ہے یہ آشناؤں پر

○

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یو ایس اے)

قسط......۱۴

وہ کون تھی جو ہوا کے دوش پر میرے کمرے میں آئی اور اپنا جلوہ دکھا کر نہ جانے کہاں چلی گئی تھی؟ اپنے ہاتھ کی پشت پر دیکھا تو میری حیرت پہلے سے سوا ہو گئی۔ اس کے لبوں کا ہلکے رنگ کا عکس اب بھی میرے ہاتھ کی پشت پر تھا۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ اس کے لب کسی مصنوعی لپ سٹک سے لال نہیں تھے۔ اس کا تمام سراپا قدرتی تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نشان کو مسلا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کے لبوں کی مہر میرے ہاتھ کی پشت پر کسی Tatoo کی طرح ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے لبوں کے عکس پر اپنے ہونٹ رکھے تو مجھے ایسے لگا جیسے میں نے اپنے لبوں کو شہد پر رکھا ہو۔ اس کے لبوں کی مہر پر بوسہ دیتے ہوئے بستر پر لیٹ کر اس کے دئے ہوئے گجرے کو اپنے چہرے پر رکھ دیا۔ چنبیلی کی خوشبو نے میرا ذہن معطر کرنا شروع کر دیا اور میں گہری نیند کی آغوش میں گم ہو گیا۔

خلافِ عادت میری آنکھ صبح دیر سے کھلی۔ اس کا دیا ہوا گجرا میرے چہرے پر اب بھی ویسے کا ویسا پڑا تھا جیسے میں نے سوتے ہوئے رکھا تھا۔ گجرے کے پھولوں میں اب بھی رات والی تازگی تھی۔ میرا سامان مہاراج کے کمرے میں پڑا تھا اس لیے میں نے جلدی سے اٹھ کر مہاراج کے کمرے کا رخ کیا۔ مہاراج کمرے میں نہیں تھے۔ نہا کر تیار ہو کر ناشتے کی غرض سے باہر نکلا تو دھرمیندر سے برآمدے میں ملاقات ہوئی۔ وہ بولا، مہاراج ناشتے کی میز پر آپ کو یاد فرما رہے ہیں سرکار۔ شاید رات کے واقعے کی وجہ سے آج دھرمیندر مجھ سے بات کرتے ہوئے کچھ گھبرا رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے ہولیا۔ مہاراج کھانے کی میز پر میرے منتظر تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو کر گلے لگاتے ہوئے کہا پچھلے سترہ ورش بعد کل کی رات میرے سمیت اس بھون کا ہر باسی آرام اور سکون کی نیند سویا ہے۔ رات کو نہ سانپوں کی پھنکار مجھے سنائی دی اور نہ ہی بھون کے کسی خادم نے سنی۔ مہاراج آج خوش تھے۔ ان کے چہرے کی بشاشت بتا رہی تھی کہ آج وہ خاصے مطمئن ہیں۔ انہیں پرسکون دیکھ کر مجھے بھی انجانی خوشی ہوئی۔

ابھی میں نے ناشتہ شروع ہی کیا تھا کہ ایک ملازم نے آکر مہاراج سے کہا، ناگ بھون سے مہارشی سیتارام اور ان کے ساتھ بیس تیس رشی چیلے بھون کے دروازے پر ہیں اور وہ بڑی سرکار کے درشن کرنا چاہتے ہیں۔ تارکِ دنیا لوگوں کا کسی دنیادار کے گھر جانا بھاگوان سمجھا جاتا ہے۔ مہاراج نے اٹھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تم ناشتہ کرلو میں انہیں دیکھ کر آتا ہوں۔ مجھے وہیں چھوڑ کر مہاراج خادم کے ساتھ رشیوں کو دیکھنے چلے گئے۔ ناشتہ ختم کیا اور بغیر کچھ سوچے کیلاش کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ کمرہ اب بھی کھلا تھا۔ فرش کی گرد پر اب بھی صرف میرے پاؤں کے نشان تھے۔ اس انجان ہستی کا دیا ہوا پھولوں والا گجرا ابھی تک میرے بستر پر پڑا تھا۔ میں کیلاش کے بستر پر اپنے ہاتھوں میں گجرا تھامے بیٹھا ہی تھا کہ مجھے برآمدے میں کئی لوگوں کے چلنے کی آواز آئی۔ بستر سے اٹھ کر دروازے سے جھانکنے کے لیے بڑھا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور مہاراج کی قیادت میں کئی رشی ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے تو مہاراج نے مجھے کہا، یہ رشی مجھے نہیں تمہیں ملنے آئے ہیں۔

سب سے آگے آنے والے مہارشی نے کمرے میں ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا، مجھے اس کمرے سے مناسہ دیوی کی کھوسو (خوشبو) آ رہی ہے۔ وہ آئی تھی۔ میری دیوی یہاں آئی تھی۔ پھر وہ میری جانب بڑھا اور میرے آگے زمیں بوس ہوتے ہئے بولا، آپ بھاگوان ہیں کہ دیوی آپ کے درسن کو آوت ہے اور ہم بھی آپ کے درسن کے کارن یہاں آوت ہیں بڑی سرکار۔ ہم بڑے بھاگیا ہیں کہ ہمیں آپ کے چرن چھونے کا گیان ملا ہے۔ اس کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ کل رات مجھے ناگ دیوی مناسہ کا درشن اور بوسہ دان ہوا تھا۔ ساتھ ہی مہارشی نے میرے ہاتھ کی پشت پر اس کے لبوں کی مہر دیکھ کر اپنے لب اس پر رکھے اور میرے چہار سو جذب کے عالم میں ناچنا شروع کر دیا۔ پھر وہاں پر موجود ہر رشی اس کی تقلید میں میرے ہاتھ کی پشت پر مناسہ کے ہونٹوں کی مہر پر اپنے ہونٹ رکھتا اور میرے گرد رقص شروع کر دیتا۔ اس رقص کے عالم میں ایک رشی نے اپنے سینے پر زور زور سے دُھتھڑ مارتے ہوئے ایک دیوانہ وار چیخ مار کر میرے قدموں میں گر کر اپنی جان دے دی۔ میرا خیال تھا کہ باقی رشی اس کو سنبھالنے کے لیے آگے بڑھیں گے لیکن اسے سورگباش ہوتا دیکھ کر جیسے سب کے جنون میں اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے اپنا رقص تیز سے تیز تر کرتے ہوئے مکتی مکتی کے نعرے بلند کرنا شروع کر دئے۔ پھر وہ اپنے ساتھی کی لاش اٹھا کر میرے اردگرد جئے مناسہ الاپتے ہوئے محوِ رقص رہے۔ ان کا جنوں ٹھنڈا ہونے میں خاصا وقت لگا۔ ایک بار پھر تمام رشی چاروں جانب سے میرے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔

مہارشی سیتارام سب سے پہلے اٹھا اور اس نے پیچھے کھڑے ہوئے بھون کے ایک خادم جس نے اپنے کندھوں پر ایک بڑا سا ٹوکرہ اُٹھایا ہوا تھا کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے مناسہ کے دئے ہوئے گجرے کو بڑی عقیدت سے میرے ہاتھوں سے لے کر ایک بوسہ دے کر اس کے پھول ایک ایک کر کے توڑتے ہوئے ٹوکرے کے پھولوں کے ساتھ ملانے لگا۔ ٹوکرے میں جھانک کر مجھے حیرت ہوئی کہ ٹوکرہ چنبیلی کے پھولوں سے بھرا تھا۔ یہ کام ختم کرنے کے بعد اس نے مجھے کہا، ان پھولوں کو اپنے داسوں میں بانٹ دیجئے بڑی سرکاراں۔ میں نے ٹوکرے سے پھولوں کی مٹھی بھر بھر کر وہاں پر موجود رشیوں اور بھون کے خادموں کو دینا شروع کیا۔ پھولوں کی تقسیم کے بعد مہارشی نے پانی کا ایک کٹورہ منگوایا اور مجھے مناسہ کے بوسے کی مہر والا ہاتھ اس میں ڈبونے کو کہا۔ پھر اس نے میرے ہاتھوں کی دھودھن کا کٹورہ مہاراج کو دیتے ہوئے کہا۔ اس کٹورے کا پانی تمام بھون میں چھڑکوا کر تمام بھون کا فرش آج ہی دھوڈالو اور اس بھون سے کیلاش کے تمام املاک نکال کر بھسم کر دو۔ پھر وہ

کمرے میں کیلاش کی بڑی تصویر کے آگے رکا اور بھجن پڑھتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے اس تصویر کو مٹانا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھوں سے کیلاش کی تصویر کسی کچی پنسل سے کھینچی ہوئی لکیر کی طرح مٹنے لگی۔ ساری تصویر مٹا کر وہ ایک بار پھر میری جانب بڑھا، اپنے ہاتھ میرے آگے جوڑے اور جانے کی آ گیا لیتے ہوئے کہنے لگا، بڑی سرکار، بھون میں اپنا کام مکت ہو گیا ہے اور آپ کا کام شروع ہوا ہے۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میرا ابھی اور کون سا کام یہاں باقی ہے لیکن کچھ سوچ کر خاموش رہا۔ پھر تمام رشی ایک ایک کر کے میرے چرن چھونے اور اپنے مرے ہوئے ساتھی کو اٹھانے کے بعد کمرہ خالی کر کے چلے گئے۔ پھولوں کا ٹوکرہ اب بھی وہیں رکھا تھا۔

رشیوں کے جانے کے بعد مہاراج اور وہاں پر موجود ملازمین جیسے کسی خواب سے بیدار ہو گئے۔ سب سے پہلے مہاراج میرے قریب آئے انہوں نے رشیوں کی طرح میرا ہاتھ چوما اور پانی کے کٹورے میں ہاتھ ڈال کر چند چھینٹے کیلاش کے کمرے میں ڈالتے ہوئے دھرمیندر کو کٹورہ دیتے ہوئے کہا، بڑے گرو نے ابھی جو کہا ہے ویسا ہی کرو۔ دھرمیندر کے ساتھ باقی ملازمین بھی اپنے ہاتھوں میں کٹورہ لئے وہاں سے نکل گئے تو مہاراج نے میرے قریب آ کر میرے کندھوں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، مجھے نہیں معلوم کہ اتنے بڑے بڑے رشی تمہارے بھیتر کیا دیکھتے ہیں پر میرے لیے تو تم کسی دیوتا سے کم نہیں ہو۔ آ ؤ، میرے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔

مہاراج کے ساتھ چلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے ابھی مجھے اس بھون میں کیا کرنا ہوگا؟ میرے خیال کے مطابق تو میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ ساری حویلی کے فرش آج دُھل جائیں گے۔ مناسہ نے اپنے درشن سے ایک پل میں اس حویلی کی تقدیر بدل دی تھی لیکن اس میں میرا کوئی کمال نہیں تھا۔ مجھے اب بھی معلوم نہیں تھا کہ دیوتا میرے ہاتھوں یہ سب کچھ آخر کیوں کروانا چاہتے تھے؟ میرے پاس ابھی تک اس سوال کا جواب اس کے علاوہ نہیں تھا کہ دیوتا جیسے چاہیں اور جو چاہیں دان کریں۔ اور کسی نامعلوم کارن مناسہ دیوی نے یہ کام میرے ہاتھوں کروا دیا۔

کمرے میں آ کر مہاراج اپنے بستر پر بیٹھے ہی تھے کہ ایک خادم نے پھر خبر دی کہ کچھ گیانی بڑی سرکار کے درشن کو آئے ہیں۔ مہاراج نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا یہ بھی شاید تمہارے درشن کو آئے ہیں۔ میں نے کہا، آپ آرام کریں میں انہیں جا کر دیکھتا ہوں۔ پھر میں نے خادم سے کہا تم جا کر انہیں بڑی بیٹھک میں بٹھاؤ، میں ابھی وہاں آتا ہوں۔ بڑی بیٹھک کے بارے میں مجھے دھرمیندر نے بتایا تھا کہ وہ مہاراج کے ملاقاتیوں کی جگہ ہے۔ میں مہاراج کو بستر پر لٹا کر ان کے ماتھے پر ایک ہلکا سا بوسہ دیتے ہوئے بیٹھک کی جانب چل پڑا۔ بیٹھک میں واقعی گیانیوں کی ایک بڑی جماعت بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے داخل ہوتا دیکھ کر تمام ہاتھ جوڑے کھڑے ہو گئے۔ پھر سب نے ایک ایک کر کے میرے ہاتھ کی پشت پر مناسہ کے ہونٹوں کی مہر کو بوسہ دیا۔ میں نے ایک خادم کو کیلاش کے کمرے سے پھولوں کا ٹوکرہ لانے کو کہا۔ پھول آنے پر میں نے مٹھی بھر پھول ہر گیانی کے ہاتھوں پر رکھے اور وہ ایک ایک کر کے چلنے لگے۔ ایسے میں گیانیوں، شانوں، رشیوں، منتریوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لگتا تھا مناسہ نے اپنے پجاریوں میں اعلان کروا دیا ہو کہ میرے ہاتھوں پر اس کے لبوں کی مہران کے بوسے کی منتظر ہے۔

دن ڈھلنے لگا تو مجھے غفار سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔ پجاریوں کی مسلسل آمد کی وجہ سے میں اس حالت میں نہیں تھا کہ اٹھ کر وہاں جاتا اور دوسرا میرا وہاں جا کر کیلاش کے بارے میں جاننے کا اب کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ مجھے کیلاش کے پاپوں کی کوئی فہرست نہیں بنانی تھی۔ یا مجھے کیلاش کے مرنے کے سولہ سترہ برس بعد کسی کو یہ نہیں بتانا تھا کہ وہ کتنا بُرا انسان تھا۔ جس کارن میں کیلاش کا ماضی کریدنے گیا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔ اس لیے اب مجھے غفار کے پاس جا کر کیلاش کی لاش کو ننگا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن میرا وعدہ اپنی جگہ تھا۔ اس لیے میں نے دھرمیندر کو بلوایا۔ وہ آیا تو میں نے ایک پرچی پر آج نہ آنے پر معذرت کرتے ہوئے اور پھر کبھی آنے کا وعدہ کر کے اسے دیتے ہوئے کہا یہ پرچی غفار کو جا کر دے آؤ۔ وہ الہ دین کے جن کی طرح جی اچھا کہہ کر چلا گیا۔ مجھے اب یہ سکون تھا کہ کم از کم غفار اور اس کے اہلِ خانہ میرے انتظار کی زحمت سے بچ جائیں گے۔

وہ سارا دن میں نے بیٹھک میں آنے والے رشیوں کے درمیان گزارا۔ آنے والے میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر زمین بوس ہوتے، میرے ہاتھ کا بوسہ لیتے اور میں انہیں ٹوکرے سے مٹھی بھر پھول دیتا اور وہ چلے جاتے۔ دن ختم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی آمد کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کل بھی آئیں گے یا نہیں۔ ٹوکرے کے پھول ابھی تک ختم نہیں ہوئے تھے۔ وہاں سے اٹھ کر ایک بار پھر بھون کے اندر آیا تو گیلے فرش اس بات کی دلیل تھے کہ بھون کے سارے فرش دھوئے جا چکے ہیں۔ ملازموں نے کیلاش کے کمرے کا فرش دھونے کے ساتھ ساتھ کمرے کی اچھی طرح صفائی بھی کر دی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے سے کیلاش کا سارا سامان بھی اٹھوا دیا گیا تھا۔ نئے بستر پر نئی چادریں بچھا دی گئی تھیں اور اس وقت کمرے میں میرا سامان پڑا تھا۔ شاید مہاراج نے مجھے یہاں ٹھہرانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہاں سے نکل کر میں مہاراج کے کمرے میں گیا تو ان کے ہلکے سے خراٹوں کی آواز سن کر وہاں سے باہر نکل کر کھانے کے کمرے میں گیا، جہاں ایک ملازم موجود تھا جس نے میرے لیے کھانا گرم کر کے لگایا۔ کھانا کھا کر میں اپنے یعنی کیلاش کے کمرے میں آیا اور ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا تو کمرے سے کیلاش سے متعلق سب کچھ اس انداز سے ہٹا دیا گیا تھا جیسے اس کا اس کمرے میں پہلے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

کمرے میں پڑے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ نہ جانے کیوں دیوتا میرے ہاتھوں کیلاش کا اس بھون سے نام و نشان مٹانا چاہ رہے تھے؟ ذہن کی ساری تانیں وہیں آ کر رک جاتی تھیں کہ دیوتاؤں کی مرضی اسی میں تھی۔ میں ان سوچوں کی سطح پر ہی ابھی تک تیر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور میرا دل زور سے دھڑکا کہ کہیں یہ مناسہ دیوی تو نہیں؟ پھر مجھے اپنے خیال پر خود ہی ہنسی آئی۔ دیوی، دیوتاؤں کو کسی کے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت لینے کی

کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی، دروازہ کھلا ہے اندر آ جاؤ۔ دھرمیندر ہاتھ جوڑے کمرے میں داخل ہوا۔ پنجابی میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا، میرا رقعہ غفار کو دے آئے ہو دھرمیندر جی؟ اس نے بڑی لجاجت سے کہا، جی سرکار آپ کا رقعہ اور سندیسہ گفار کو دے دیا ہوں۔ وہ کہتا تھا کہ آپ اس کے کچھ لگتے ہیں۔ ہاں وہ میرے منہ بولے ماتا پتا کے خالہ زاد ہیں، میں نے اسے بتایا۔ پھر وہ میرے قریب آ کر بولا، سرکار آپ بڑے کرمانوالے ہیں۔ بڑے بڑے گرو آپ کے چرن چھوتے ہیں۔ آپ کے ہاتھوں کی دھودھن سے یہ بھون دھل کر پوتر ہوا ہے، میری آپ سے ایک بنتی ہے سرکار۔ اس کے باوجود کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کی بنتی کیا ہو گی، میں نے کہا، کہو دھرمیندر جی۔ سرکار میرے بھلوندر کو آپ اپنی سیوا کے لیے چن لیں۔ غریب کی سب سے بڑی آرزو بھی کتنی چھوٹی ہوتی ہے۔ کسی غریب کا بڑے لوگوں کی سیوا کے لیے چنا جانا بڑا بھاگوان سمجھا جاتا ہے۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ جس کی سیوا کے لیے وہ اپنی اولاد تک کو دے رہا ہے وہ خود بھی کچھ نہیں ہے۔ وہ ایک جھونپڑی کا پروردہ ہے۔ لیکن میں نے اسے کہا، میں یہاں پر چند روز کے لیے ہوں، پھر چلا جاؤں گا۔ معلوم نہیں میرا آنا اس بھون میں پھر کبھی ہو گا بھی یا نہیں۔ تم یہ نہیں چاہو گے کہ بھلوندر اپنے پریوار کو چھوڑ کر میرے ساتھ کہیں چلا جائے۔ دھرمیندر کا جواب میری توقع کے خلاف تھا۔ وہ بولا، کیوں نہیں سرکار؟ آپ اسے جہاں چاہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ ہمارے اس سے بڑے بھاگ اور کیا ہو سکتے ہیں کہ وہ آپ کے چرن دھونے کے لائق ہو جائے۔ میں نے کہا، دیکھو دھرمیندر جی، میں اگر کبھی اس بھون میں آیا تو بھلوندر کو اپنے پاس رکھوں گا۔ میں زیادہ وقت کالج میں رہتا ہوں اور ہاں پڑھائی ختم کرنے کے بعد جب کبھی کسی گھر میں رہا تو بھلوندر کو اپنے پاس رکھوں گا۔ میری بات سنکر وہ چپ ہو گیا۔ جاتے جاتے وہ میرے چرن چھونا نہیں بھولا۔

اس کے جانے کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر بستر پر جا بیٹھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا آج بھی دیوی مجھے اپنے درشن کرانے آئے گی؟ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ آئے۔ لیکن دیوتاؤں پر کوئی زور نہیں ہوتا۔ وہ جسے چاہتے ہیں اور جب چاہتے ہیں اپنے درشن کراتے ہیں۔ لیکن مناسہ تو خود پیکرِ حسن تھی۔ اس کے درشن کی دیوتاؤں کو مجھ سے زیادہ چاہ ہو گی۔ ایسے میں دیوتا ہرگز نہیں چاہیں گے کہ مناسہ ان کے رقیبوں کو اپنے درشن کراتی پھرے۔ میں نے اپنے سامان سے اپنی بین نکالی۔ کل کی طرح کمرے کی بتی بجھائی اور اپنے بستر پر آ کر کل کی طرح ہلکے سُروں میں بین بجانے لگا۔ بین بجاتے بجاتے تھک گیا لیکن وہ نہ آئی۔ میں نے بین اپنے بستر کے پاس پڑے ہوئے ایک سٹینڈ پر رکھی اور کروٹ بدل کر سوچنے لگا کہ اب میرا کام اس بھون سے بھی تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ میں مہاراج پر اپنا بوجھ زیادہ دنوں تک نہیں ڈالنا چاہتا تھا اس لیے ان سے بات کرنے کے بعد کل کا روز جیسے تیسے کاٹ کر پرسوں کلکتہ چلا جاؤں۔ یہ سب کچھ طے کرنے کے بعد میں سو گیا۔

صبح آنکھ جلدی کھل گئی۔ میں نے نہا کر کپڑے بدلے اور مہاراج سے بات کرنے ان کے کمرے میں گیا تو وہ اپنے بستر پر لیٹے تھے۔ میں نے قریب جا کر ان سے پوچھا، اب آپ کیسے ہیں مہاراج؟ بھگوان کی کرپا اور تمہارے کرموں سے اچھا ہوں، انہوں نے مجھے اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے کہا۔ آپ کے سر میں پیڑھ (درد) تو نہیں ہے؟ میں نے پوچھا۔ کہنے لگے، تمہارے کرموں میرے سر کی پیڑھ تو کیا میری آتما کی پیڑھ بھی جاتی رہی ہے۔ میرا کام آپ کے بھون میں ختم ہو گیا ہے مہاراج اسی لیے آپ مجھے جانے کی آ گیا دیجیے۔ میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا تو میری بات کا جواب دینے کی بجائے مہاراج بستر سے اٹھے اور مجھے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولے، میرے ساتھ آؤ۔ میں ہولے ہولے چلتا ہوا ان کے پیچھے گیا۔ وہ اپنے کمرے سے تین کمرے ہٹ کر ایک بڑے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے۔ کمرے کا دروازہ کھول کر میرے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے ایک الماری کے قریب پہنچے۔ الماری کے پٹ کھول کر سامنے کی دراز کھولی۔ دراز سے ایک چابی نکال کر الماری کے پٹ بند کئے اور اس پر تالا لگا کر ایک بار پھر الماری سے نکالی ہوئی چابی سے تالا کھولا۔ اس بار ساری کی ساری الماری ایک جانب ہٹتی چلی گئی۔ جس کے پیچھے ایک دروازہ تھا۔ اندر کا دروازہ کھلا تو میں حیران رہ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا خفیہ کمرہ تھا جس میں زمانہ قدیم کے کئی نوادرات رکھے تھے۔ وہ ہیرے جواہرات بھری سونے کی ایک تشتری کے قریب پہنچے اور مجھے کہا، جانے سے پہلے ان میں سے جو چاہو لے جاؤ۔

ان کی جانب دیکھتے ہوئے میں نے کہا، مہاراج میں آپ کے پاس سونے چاندی یا ہیرے جواہرات کے لالچ میں نہیں آیا۔ مجھے دیوتاؤں نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ یہ سب آپ کو اور آپ کے پریوار کو مبارک ہو۔ یہ کہتا ہوا میں واپسی کے لیے مڑا تو پیچھے سے مہاراج کی آواز آئی۔ یہ سب کچھ دکھا کر میں تمہارا امتحان لینے کے لیے تمہیں یہاں لایا تھا۔ وہ کیوں؟ میں نے پیچھے مڑ کر مہاراج کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میرے ساتھ چلو میں تمہیں اپنے کمرے میں چل کر بتاتا ہوں۔ واپسی پر مہارج نے سب کچھ پہلے جیسا بند کیا اور مجھے اپنے کمرے میں لا کر اپنے پاس بستر پر بٹھا کر کہنے لگے، میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو اور تمہارے ماتا پتا کون ہیں۔ اس کے باوجود میں یہ جانتا ہوں کہ تم اس بھون کے لیے اور اس پریوار کے لیے کسی دیوتا سے کم نہیں ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے میرے قدموں پر بیٹھ کر کہنے لگے، میں پچھلے کئی ورشوں سے قیدِ تنہائی کاٹ رہا ہوں۔ تمہیں دیوتاؤں کا واسطہ اس تنہا بوڑھے کو اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ۔ مجھ میں اب کچھ اور سہنے کی سکت نہیں ہے۔ تمہاری چند روزہ آمد سے سارے بھون کو جو شانتی ملی ہے وہ مجھے پچھلے سترہ ورش سے نہیں ملی تھی۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہارے جانے کے بعد وہ سب کچھ واپس آ جائے گا۔ میں تمہیں اپنی حویلی، اپنی تمام جائیداد اور اپنا سب کچھ سونپنے کو پیار ہوں۔ میں تم سے بنتی کرتا ہوں کہ تم اپنے تمام پریوار کے ساتھ اس بھون میں آ کر رہو۔ میں تمہارے ماتا پتا کو اپنی

اولاد سمان رکھوں گا۔ بس اس عمر میں مجھے اکیلا مت چھوڑ دیجئے۔ میں اب تھک گیا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی بوڑھے نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

انہیں زمین سے اٹھا کر میں نے واپس بستر پر بٹھا کر ان کا ماتھا چومتے ہوئے کہا، میں آپ کی بات اور آپ کے احساسات سمجھتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ بھگوان نے مجھے آپ کے ہاں بھیجا ہے۔ میں بھی آپ کے لیے ویسی ہی اپنائیت محسوس کرتا ہوں جیسی آپ میرے لیے کرتے ہیں۔ آپ نے مجھے بیٹا کہا ہے تو میں آپ کو مہاراج کی بجائے بابا کہا کروں گا۔ میرے لیے اتنا مان کافی ہے کہ آپ نے مجھے کسی قابل سمجھا ہے۔ میں آپ سے اپنے تعلق کی ڈوری ہمیشہ کے لیے کاٹ کر نہیں جا رہا ہوں۔ میں اپنا کچھ سامان آپ کے ہاں چھوڑ جاؤں گا۔ میں آپ کو ہر ہفتے خط لکھا کروں گا اور آپ مجھے خط لکھیں۔ میں آپ کو فون کیا کروں گا اور آپ مجھے فون کریں۔ میں کبھی کبھار چھٹیوں میں آپ کے ہاں آؤں گا اور کبھی کبھار آپ میرے پاس آ جایا کریں۔ ہمارا تعلق آج ختم نہیں ہو رہا بلکہ آج سے شروع ہو رہا ہے۔ میں آپ کی سیوا کے لیے ہر موڑ پر موجود رہوں گا اور آج کے بعد آپ کو اکیلا نہیں رہنے دوں گا۔ میں پچھلے دو روز سے آپ کے مکھ پر جو شانتی دیکھ رہا ہوں یہی شانتی میں آپ کے مکھ پر ہر روز دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے نہ مجھے آپ کی دولت چاہیے اور نہ آپ کی جائیداد۔ میرے لیے اتنا کافی ہے کہ میرے بابا مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ ہم دونوں نے اٹھ کر ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ پھر بابا کہنے لگے اگر ایسا ہے تو کچھ روز اور رُک جاؤ۔ جی ہاں میں چند روز اور رُک جاتا ہوں، میرے جواب پر بابا کے چہرے پر رونق دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوئی۔

ہم ابھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھٹکا۔ میں نے بابا کو کرسی پر واپس بٹھاتے ہوئے وہیں سے ہانک لگائی، دروازہ کھلا ہے اندر آ جاؤ۔ دھرمیندر کمرے میں داخل ہو کر سیدھا میرے پاس آ کر ادب سے بولا، سنت لوگ آپ کے درشن کو آئے ہیں سرکار۔ میں نے کہا، تم جا کر انہیں بٹھاؤ میں ابھی آتا ہوں۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بابا سے کہا، آپ آرام کریں میں انہیں دیکھ آتا ہوں۔ بابا بولے، چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ ہم دونوں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے بڑی بیٹھک میں پہنچے۔ جہاں دس سنتوں کی ٹولی مجھے اندر آتا دیکھ کر ہاتھ جوڑے کھڑی ہو گئی۔ پھر ان میں سے ہر ایک نے مناسہ کی مہر کا بوسہ لیا اور مٹھی بھر چنبیلی کے پھول لے کر میرے آگے جھکتے ہوئے چلے گئے۔ میں نے ٹوکری میں دیکھا تو کل کے آئے ہوئے پھول ابھی تک تر و تازہ تھے۔ اتنے پھول دینے کے باوجود ٹوکرہ اب بھی پھولوں سے بھرا تھا۔ ہمارے اٹھنے کے بعد خادموں نے اس کمرے کا فرش بھی دھو دیا تھا۔ کل کی نسبت آج سنتوں اور رشیوں کی کم ٹولیاں آ رہی تھیں۔ دوپہر تک تقریباً چار پانچ ٹولیاں آئیں۔ بابا اس دوران تھک کر سونے چلے گئے۔ آج میرے پاس غفار سے ملنے کا وقت تھا اس لیے دوپہر کے قریب اٹھ کر حویلی کے صدر دروازے پر آیا، تاش کھیلتے ہوئے خادم مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے کلو سے گاڑی لانے کو کہا، وہ گاڑی لایا تو میں اکیلا غفار کی دکان پر گیا۔

غفار مجھے دیکھ کر پہلی بار ملنے کی نسبت کچھ زیادہ متاثر معلوم پڑتا تھا۔ اس لیے دکان کے پیچھے سے اٹھ کر مجھے بڑی گرم جوشی سے گلے لگایا۔ شاید دھرمیندر نے اسے میرے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے کہا، میں واپس جانے سے پہلے آپ سے ملنے آیا ہوں۔ کہنے لگا، تمہاری پھوپھی بھی تم سے ملنے کو بے تاب ہے۔ میرا گھر یہاں سے قریب ہے، بس چند منٹوں کے لیے اپنی پھوپھی سے ملتے جاؤ۔ میں نے کہا، ٹھیک ہے۔ میں ان سے بھی مل لیتا ہوں۔ وہ ساتھ والے دکاندار کو اپنی دکان کا دھیان رکھنے کا کہہ کر میرے ساتھ پیدل چلتے ہوئے چند گلیوں سے گزر کر مجھے ایک چھوٹے سے مکان میں لے گیا جہاں ایک درمیانی عمر کی خاتون سے مجھے ملوایا۔ میرم میرے چاچا اسماعیل کی بہن تھیں۔ انہوں نے مجھے دعائیں دیں۔ چند لمحے وہاں بیٹھ کر ہم وہاں سے واپسی کے لیے اٹھے تو واپسی پر غفار نے مجھے کہا، بھانجے، کیا تم کیلاش کی کہانی نہیں سنو گے؟ پھر کسی وقت سنوں گا ماموں، میں نے کہا۔ کہنے لگے، ٹھیک ہے جب کہو گے سناؤں گا۔

غفار کو دکان پر چھوڑ کر واپس بھون پہنچا۔ گاڑی کلو کے حوالے کر کے حویلی میں آیا تو بھلوندر مجھے بڑے برآمدے میں ملا۔ کہنے لگا، سرکار کلکتہ سے لانی جی کی آپ کے لیے ایک ٹرنک کال آئی تھی۔ کیا انہوں نے کوئی پیغام چھوڑا ہے؟ میں نے پوچھا۔ نہیں سرکار، لانی جی نے اتنا کہا ہے کہ وہ پھر آپ کو کال کریں گی۔ میں نے اس سے پوچھا، حویلی میں ٹیلی فون کہاں ہے؟ وہ بولا، جی ویسے تو ہر کمرے میں ہے لیکن بھون کا اپنا آپریٹر ہے جو باہر سے آئی ہوئی کال ملاتا ہے۔ میں اس کے ساتھ چلتا ہوا ایک کمرے میں پہنچا جہاں ایک ٹیلی فون رکھا تھا۔ ٹیلی فون اٹھا کر آپریٹر کو کلکتہ کے دو نمبر دے کر لانی کے لیے ایک پی پی (Personal Party) کال بک کروائی اور اسے کہا کہ اس کال کو مہاراج کے کمرے میں ملا دے۔ کال بک کروانے کے بعد میں مہاراج کے کمرے میں پہنچا تو وہ اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔

میں انہیں کلکتہ سے کال کے بارے میں بتانے ہی والا تھا کہ ان کے کمرے کے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے بڑھ کر فون اٹھایا تو آگے سے لانی کے بولنے کی آواز آئی۔ میری آواز پہچان کر بولیں، رامو بیٹے وکرم اور نیتو آج کل جنوبی افریقہ میں ہیں۔ وکرم نے کل فون کر کے کہا ہے کہ وہاں اس کے کسی دوست کو سانپوں کے سلسلے میں تمہاری ضرورت ہے۔ انہوں نے تمہیں جہاز کا ٹکٹ بھی وہاں سے بھجوایا ہے اور تمہیں اپنی پہلی فرصت میں وہاں بلوایا ہے۔ تمہارا پاسپورٹ بھی یہاں پر تیار پڑا تھا میں نے ویزہ لگوانے کے لیے بھجوا دیا ہے۔ تم جلدی واپس آ جاؤ تا کہ آگے جانے کا پروگرام تیار کیا جا سکے۔ بعد میں انہوں نے فون باپو کے حوالے کیا۔ باپو سے بات کرنے کے بعد میں نے فون رکھا اور مہاراج سے کہا، مجھے کلکتہ میں ایک اور کام کے لیے بلاوا آیا ہے۔ اگر آپ کی آ گیا ہو تو میں چلا جاؤں۔ ابھی انہوں نے جواب ہی نہیں دیا تھا کہ فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ میں نے فون اٹھایا تو آپریٹر نے کہا کہ اوورسیز کال ہے۔ دوسری جانب نیتو بول رہی تھی۔ فون پر میری آواز پہچان کر بولی، کیا ممی سے بات تمہاری

ہوئی ہے؟ میں نے جواب دیا، ہاں ابھی چند منٹ پہلے بات ہوئی ہے۔تو تم آ رہے ہو؟ اس نے پوچھا تو میں نے جواب دیا۔ ہاں۔ اچھا تو پھر آجاؤ، بڑا مزا آئے گا۔ یہ لو، پاپا سے بات کرو۔ دوسری جانب وکرم کی آواز آئی، راموبیٹے تم کب تک آسکتے ہو؟ میں نے کہا، جی میں مہاراج سے اجازت لے کر کل شام تک کلکتہ پہنچوں گا۔ وہاں سے باقی پروگرام بنا کر آپ سے بات کروں گا۔ وہ بولے، میرے ڈیڈی کے ایک دوست کو سانپوں کے سلسلے میں یہاں تمہاری اشد ضرورت ہے۔ یوں سمجھو کہ تم یہاں آ کر مجھ پر ایک اور احسان کرو گے۔ میں نے کہا، احسان کی کوئی بات نہیں۔ میں جلدی پہنچوں گا۔ فون رکھ کر میں نے مہاراج سے کہا، کال جنوبی افریقہ سے تھی۔ آپ کی طرح کچھ اور لوگوں کو سانپوں کے سلسلے میں میری ضرورت ہے۔ اس لیے میں حسبِ وعدہ کچھ اور روز آپ کے ہاں نہ رہ پاؤں گا۔ وہاں سے واپسی پر چند روز اور آپ کے ہاں رہوں گا۔ بابا کو میری اتنی جلدی جانے سے اداس تھے اس کے باوجود انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

بابا نے اپنی انگلی سے ایک انگوٹھی نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا، اسے اپنے پاس اپنے بابا کی نشانی سمجھ کر رکھ لو۔ میں نے شکریے کے ساتھ انگوٹھی لے کر اپنے دائیں ہاتھ کی دوسری انگلی میں ڈال لی۔ کافی دیر تک بابا کے پاس بیٹھا ان کا سر دباتا رہا۔ اس وقت شام ہونے والی تھی اس لیے میں نے کلکتہ کے لیے دوسری صبح نکلنے کا فیصلہ کیا۔ بابا کو نیند آئی تو میں چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔ کل کی ناکامی کے بعد آج مناسہ دیوی کی آس میں بین بجانے کی ضرورت نہیں سمجھی اس لیے کمرے کی بتی بجھا کر اپنے بستر پر آیا اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔ سوتے ہی مجھے ایسے لگا جیسے کمرے میں میرے علاوہ کوئی اور ہو۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھتا رہا لیکن بعد میں مجھے یقین ہو گیا کہ کمرے میں واقعی میرے علاوہ کوئی ہے۔ بستر سے اٹھ کر کمرے کی بتی جلا دی۔ چہار سو نظریں گھمائیں۔ کمرے کی تمام الماریاں کھول کر دیکھیں۔ غسل خانے میں جھانکا لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ میں بستر پر آ کر بیٹھا پھر کسی خیال سے بستر کے نیچے جھانکا تو مجھے دل کا دورہ پڑتے پڑتے بچا۔ میرے بستر کے نیچے کوئی لنگوٹی پہنے دبکا پڑا تھا۔ اسے ہاتھ لگایا تو اس نے میری جانب دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ میرے بستر کے نیچے ناگ بھون کا مہارشی، سیتارام چھپا ہوا تھا۔

رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر خوفزدہ ہونے کی بجائے وہ بستر کے نیچے سے نکل کر میرے قدموں پر سر رکھتا ہوا بولا، دیوی کے ایک درشن کی کھاطر یہاں چھپا ہوں پربھو۔ مجھ مورکھ سیتارام نے اپنا سارا جیون اس کی ایک دید کی آس کی تپسیا میں تیاگا ہے۔ بس اس کی ایک جھلک دیکھن کو جندہ ہوں سرکار۔ وہ تمہارے ملن کو آوے ہے۔ میں نے سوچا وہ تمہارے ملن کو آوے گی تو ہمارا روگ بھی پورا ہو جاوت گا۔ میں نے پوچھا، کیا تم کل بھی اسی کمرے میں تھے؟ ہاں سرکار کل بھی میں تھا اور میں اس وقت تک آپ کا پلو نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ میرے کو مناسہ دیوی کے درسن نہ کروا دیویں گے۔ سیتارام جی تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ دیوتاؤں کو ہمارے بھیتر کی خبر ہوتی ہے۔ وہ کل بھی شاید اسی لیے نہیں آئی تھی کہ تم یہاں چھپے بیٹھے تھے۔ اگر اس نے تمہیں درشن کرانے ہوتے تو وہ میرے پاس آنے کی بجائے تمہارے پاس آتی؟ تمہاری بات بجا ہے پربھو، پر اپن دل کے ہاتھوں مجبور ہے۔ یا اپنے ہاتھاں سے آپ میرا کریا کرم کر دو یا آپ میری سفارس کر دو۔ اس نے میرا دامن جھنجھوڑتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ میں نے کہا، اچھا اگر وہ آئی تو میں اس سے تمہاری سفارش ضرور کروں گا۔ تو پھر مجھے اس کمرے کے اندر اپنے قدماں میں پڑا رہنے دو سرکار۔ اگر تم اس کمرے میں رہو گے تو وہ کل کی طرح آج بھی نہیں آئے گی، میں نے کہا۔ تم یہاں سے باہر جاؤ اگر وہ آئے گی تو میں اس سے تمہارے بارے میں پوچھوں گا۔ اگر وہ مان گئی تو تمہیں کمرے میں بلا لوں گا۔ وہ اچھا کہتا ہوا میرے کمرے سے باہر نکل کر دروازے کے سامنے فرش پر لیٹ گیا۔

مجھے یقین تھا سیتارام کو بھون کے کسی خادم نے اس کمرے میں چھپنے کا موقع فراہم کیا ہوگا۔ اگر یہ بات ہے تو اس بھون کے خادموں پر اعتماد کرنا خلافِ عقل تھا۔ اگر آج ایک بے ضرر رشی کسی خادم کو لالچ دے کر میرے بستر کے نیچے گھسا کر چھپا سکتا ہے تو کل کوئی کسی کو قتل کی نیت سے بھی گھسا سکتا ہے۔ میرا سب سے پہلا شک دھرمیندر پر تھا۔ لیکن یہ کمرہ پچھلے دو دن سے کھلا تھا اس لیے کوئی بھی یہ حرکت کر سکتا تھا۔ خیر یہ معاملہ کل صبح کو دیکھنا تھا۔ فی الوقت مسئلہ سیتا رام کا تھا جو کمرے سے باہر مناسہ دیوی کے ایک درشن کی پیاس میں فرش پر دھرنا مارے پڑا تھا۔ مجھے اس پر ترس آیا لیکن میرا ترس کھانا کافی نہیں تھا۔ مجھے تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ مناسہ دیوی کے درشن میرے نصیب میں دوبارہ ہوں گے یا نہیں۔ اور اگر مجھے درشن ہوئے بھی تو کیا وہ میرے کہنے پر کسی اور کو اپنا دیدار کرانے پر راضی ہو گی بھی یا نہیں۔ ان خیالات میں غلطاں میں نے اپنے سامان سے بین نکالی اور کمرے کی بتی بجھا کر اپنے بستر پر آن بیٹھا۔

پہلے خیال آیا کہ بین بجا کے دیکھتا ہوں لیکن جی نہیں مانا، اس لیے کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند آنے میں دیر نہیں لگی نہ جانے رات کے کسی پہر میری آنکھ تیز روشنی کے جھپاکے اور خوشبو کے جھونکے سے کھلی تو مناسہ دیوی میرے بستر کے سامنے کھڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس کے مسکراتے لبوں نے کہا سیتارام کو اندر بلاؤ۔ میں کسی غلام کی طرح اٹھا، کمرے کا دروازہ کھولا اور سیتارام کو دیکھا جو اس کی خوشبو پا کر اٹھ بیٹھا تھا میرے کہنے پر اندر آیا۔ سیتارام مناسہ کے قدموں کے پاس گرتے ہوئے بولا مجھے تیرے درسن کے بنا اور کچھ نہیں چاہیے ہے دیوی۔ تیرے دیکھن کے بعد یہ اکھیاں کچھ اور نہیں دیکھن گی میری دیوی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں نکال کر دیوی کے قدموں میں رکھ دیں اور ساتھ ہی اس کا نحیف جسم کسی ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔

سیتارام کو میرے پاس تڑپتا چھوڑ کر مناسہ ایک جھپاکے سے نظروں

سے اوجھل ہوگئی اور کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ میں نے جا کر بتی روشن کی تو دیکھا کہ سیتا رام ابھی تک وہیں پڑا اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں اس کے کانپتے ہوئے جسم کے پاس پڑیں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ بے چینی کے عالم میں اس کا سر اپنی گود میں لے کر درد بھرے لہجے میں کہا، یہ تم نے اپنے ساتھ کیا کیا ہے سیتا رام جی؟ اس نے میرے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے مسرت سے کہا، یہ میرا انت تھا پربھو۔ میں نے وہ پایا جو سالوں کی تپسیا کے بعد کسی ایک کے نصیباں میں ہوتا ہے۔ میری تمام عمراں کی تپسیا تیرے صدقے میرے کام آئی سرکاراں۔ اس کے ساتھ سیتا رام کی گردن ایک جانب لڑھک گئی۔

سیتا رام نے میری بانہوں میں دم توڑ دیا تھا لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک پرسکون مسکان تھی اور اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ میں نے فرش سے اٹھا کر اس کی آنکھیں حلقوں میں واپس ڈالنے کی کوشش میں کامیاب ہو کر مناسہ کے سچے عاشق کا نحیف جسم اٹھایا اور بڑی عقیدت سے اپنے بستر پر رکھا اور اس کے قدموں پر اپنی محبت اور احترام کا بوسہ دے کر اس کے سر کو چادر سے ڈھانپ دیا۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔ آج میں نے محبوب کے شوقِ دید کی انتہا دیکھی تھی۔

نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی میں قریب پڑے ہوئے صوفے پر کسی زندہ لاش کی طرح بیٹھ گیا۔ میرا جی نہیں چاہا کہ رات کے پچھلے پہر کسی نوکر کو تکلیف دوں یا سیتا رام کے جسم کو اپنے بستر پر سے ہٹاؤں۔ اس لیے سب کچھ کل صبح تک کے لیے رہنے دیا۔ وہ ساری رات میں نے بے چینی کے عالم کبھی ٹہل کر اور کبھی صوفے کے ایک کونے پر بیٹھ کر گزاری۔ نیم غنودگی کے عالم میں مجھے دروازے پر دستک سنائی دی۔ دروازہ کھولا تو سامنے بھلوندر کے ساتھ آئے ہوئے ایک درجن کے قریب رشی ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی بولے سیتا رام کی مکتی کو لینے آئے ہیں سرکار۔ کچھ کہے بنا انہیں اندر لے آیا اور اپنے بستر پر رکھے ہوئے سیتا رام کے جسم کو ان کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے اسے بڑے دھیان سے اٹھایا اور ناچتے اور بھجن گاتے ہوئے چلے گئے۔ تمام رات آنکھوں میں کاٹنے کے باوجود میری آنکھوں اور میرے جسم پر بوجھل پن کے آثار نہیں تھے۔ بلکہ میں کسی کے سچے عشق کی گواہی پر سرشار تھا۔ جس انسان کا عشق مناسہ دیوی کو اپنے درشن کروانے پر مجبور کر سکتا ہے اس کے لیے کسی عام سے انسان سے اپنی بات منوانا نہایت ہی آسان ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے سیتا رام کو اپنے کمرے میں چھپانے والے خادم کو ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ آج پہلی بار، عشق اور جنگ میں سب جائز ہے والا محاورہ میری سمجھ میں آیا تھا اور میرے مغموم چہرے پر ایک مسکراہٹ چھوڑ گیا تھا۔

مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور بابا کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ بابا اس وقت اپنے بستر پر ایک بڑے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ میں نے جا کر ان کے ماتھے کو بوسہ دیا تو وہ خوش ہوتے ہوئے بولے تو نے مجھے چند روز میں اتنا پیار دیا ہے کہ میرے اپنے بیٹے نے مجھے اپنے پورے جیون میں نہیں دیا۔ تو بالکل میری پوتری جیسا ہے۔ وہ بھی آتے جاتے میرا ماتھا چوما کرتی تھی۔ پوتری شاید بابا کی بیٹی تھی لیکن زیادہ کرید کر ان کا دل دکھانے کی بجائے میں نے چپ سادھ لی۔ چلیں بابا، جانے سے پہلے میں آپ کے ساتھ ناشتہ کر لوں۔ اور ہاں مجھے پتر لکھنا نہ بھولنا۔ میں نے انہیں اٹھنے میں مدد دیتے ہوئے کہا۔ ان کے ساتھ ناشتے کے دوران میں نے بابا سے پوچھا، میں کلکتہ کس ڈرائیور کو اپنے ساتھ لے جاؤں؟ وہ کہنے لگے، یہاں تین گاڑیاں کھڑی ہیں اور ان میں ایک بھی استعمال نہیں ہوتی۔ اگر تم خود گاڑی چلا سکتے ہو تو تینوں میں سے جو گاڑی تمہیں بھائے اپنے ساتھ لے جاؤ اور اسے اپنے پاس رکھو۔ اگر تمہارے پاس ایک گاڑی رہے گی تو کم از کم فرصت کے وقت تمہیں اپنے بابا کے پاس آنے جانے کی سہولت رہے گی۔ ان کی دلیل معقول تھی اس لیے میں نے حامی بھر لی۔

ناشتے کے بعد میں نے اپنے کمرے میں جا کر اپنا سامان اٹھایا تو گورے کو اپنے ساتھ لانا نہیں بھولا۔ صدر دروازے کے قریب آ کر تاش کھیلنے والوں کے پاس جا کر کلو سے کہا، مجھے گاڑیاں دکھاؤ۔ وہ مجھے کمرے کے پچھلے دروازے سے گیراج میں لے گیا جہاں تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں سے کالی پر میں بابا کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ دوسری میں نے یہاں چلائی تھی۔ مہاراج کو کونسی گاڑی سب سے زیادہ پسند ہے؟ میں نے کلو سے پوچھا۔ اس نے کالی گاڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، یہ والی سرکار۔ میں نے وہ گاڑی رہنے دی اور اپنے لیے دوسری دو میں سے ایک گاڑی اسے باہر نکالنے کو کہا۔ گاڑی میں اپنا سامان رکھ کر میں نے کلو سے کہا، مہاراج سے کہو، میں سفید گاڑی لے کر جا رہا ہوں۔ وہ سارا دن میرا سفر میں گزرا۔ اکیلا ہونے کی وجہ سے گورے کو میں نے گاڑی میں کھلا چھوڑ دیا تھا۔ کلکتے شام ڈھلنے سے پہلے پہنچا۔ پہنچتے ہی کانپور کے لیے ایک ٹرنک کال بک کروائی۔ کال ملی تو بابا کو اپنی خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دی۔ لانی کہیں گئی ہوئی تھیں اور باپو باہر لان میں ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر باپو کا پُر رونق چہرہ کچھ اور کھل گیا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی مناسہ کی مہر والا ہاتھ پکڑ کر اس کا بوسہ لیتے ہوئے کہا، تو بڑا بھا گیا ہے رامو، جو مناسہ دیوی تجھے اپنے درشن کرا گئی۔ میں نے حیرت سے پوچھا، آپ کو کیسے پتہ چلا باپو؟ وہ بولے تیرے چہرے پر اور تیری آنکھوں میں لکھا ہے رے۔ پھر میں نے باپو کو تفصیل سے پرکاش بھون کے واقعات سنانے کے بعد سیتا رام کی مکتی کے بارے میں بتایا۔ باپو نے سب کچھ بڑی توجہ سے سنا۔ انہیں میں نے گورا بھی دکھایا سفید شیش ناگ ان کے لیے بھی باعثِ حیرت تھا۔ پھر وہ مجھے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے بولے، بیٹیا کے ساتھ تڑ کے کارخانے کے کئی کام نکالتا ہوں۔ جب جی چاہے گھر واپس آ کر آرام کرتا ہوں۔ میں نے کانپور سے کلکتہ تک کے راستے کچھ نہیں کھایا تھا اس لیے کھانے کا پوچھا تو باپو مجھے اپنے ساتھ کھانے کے کمرے میں لائے اور خادم کو کھانا لگانے کو کہا۔ کھانا کھا کر میں اپنے کمرے میں جا کر نہا کر تازہ دم ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے باپو سے پوچھا کہ وہ کس کمرے میں رہ رہے ہیں۔ اسی کمرے میں جہاں ہم پہلی بار آ کر رہے تھے، انہوں نے جواب دیا۔ کمرے میں جا کر میں نے نہا کر کپڑے بدلے اور اپنے بستر پر ایسا لیٹا کہ دوسری صبح کو آنکھ کھلی۔

لانی سے میری ملاقات ناشتے کے دوران ہوئی۔ میں نے انہیں سفر

کے مختصر حالات بتائے۔ کہنے لگی، نیتو اور وکرم ان دنوں جنوبی افریقہ میں وکرم کے والد کے دوست رمیش کے ہاں ہیں۔ رمیش لاج میں پچھلے چار سالوں سے سانپوں کی اجارہ داری ہے۔ ہفتے میں ایک آدھ بار سانپ کہیں نہ کہیں نظر آتا ہے۔ اگر چہ رمیش کا تعلق پٹنہ سے ہے لیکن رہتا جنوبی افریقہ میں ہے۔ جب وکرم نے ان سے تمہارا ذکر کیا تو انہوں نے فوراً تمہیں بلوانے کو کہا ہے۔ لگتا ہے تمہاری شہرت اب ملک سے باہر تک پھیلتی جا رہی ہے۔ میں جواباً خاموش رہا۔ پھر اس نے میرا پاسپورٹ اور ڈرائیورنگ لائسنس میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے مجھے بتایا کہ تمہارا جنوبی افریقہ کا ویزہ لگ کر آ گیا ہے۔ پاسپورٹ میں اس نے میرا ٹکٹ بھی اڑسا ہوا تھا۔ تمہاری روانگی کل صبح ہوگی۔ تمہارا جہاز کلکتہ سے بمبئی اور بمبئی سے ڈربن جائے گا۔ ڈربن کے ائیر پورٹ پر کوئی تمہیں لینے کے لیے آیا ہوگا۔ اپنی پہچان کے لیے تم اپنے نام کا ایک ٹیگ بنا کر اپنے سینے پر لگا لینا اور آنے والا بھی تمہارے نام کا ایک بڑا سا جھنڈا اٹھا کر ہوائی اڈے پر کھڑا تمہارا منتظر ہوگا۔ ڈربن سے تم بذریعہ کار صوبہ شمالی کیپ کے شہر کمبرلی جاؤ گے۔ یہ سفر تقریباً پانچ چھ گھنٹے کے لگ بھگ ہوگا۔

پھر علاقے کا مزید تعارف کراتے ہوئے لانی نے مجھے بتایا، شمالی کیپ صوبے کے شہر ہوٹاؤس کے پاس ۱۸۷۱ء میں ایک گڈریے کو ایک سفید پتھر ملا۔ اس نے یہ پتھر اپنے ہمسائے کو دکھایا۔ جس نے یہ پتھر ٹیسٹ کرانے کے لیے اپنے ایک دوست کو بھیجا۔ وہ پتھر ۲۲ قیراط کا ہیرا ثابت ہوا۔ پھر اس کے بعد ۱۸۶۶ء میں یہاں ۳۸ قیراط کا ایک ہیرا نکلا۔ اس کے بعد اس شہر کو نیارش کا نام دیا گیا۔ تمام دنیا سے لوگ ہیروں کی تلاش میں یہاں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ آج یہ شہر برطانیہ کے ایک وزیر کمبرلی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ شہر تمہاری منزل ہوگی۔ پھر انہوں نے ایک ڈائری مجھے دیتے ہوئے کہا، اس میں میں نے یہاں کے اور جنوبی افریقہ میں اپنے تمام جانکاروں کے نام، پتے اور فون نمبر لکھ دئے ہیں۔ تم خود کو کہیں تنہا نہ سمجھنا۔ کسی بھی ضرورت کے وقت ان میں سے کسی ایک سے رابطہ کرنا وہ تمہاری مدد کو ہر وقت تیار ہوں گے۔ اس ڈائری میں ہندوستان میں اپنے تمام دوستوں اور جانکاروں کے فون نمبر اور پتے بھی لکھنا۔ وہاں پہنچ کر ہمیں اپنی پہنچ کی اطلاع کرنا۔ ہم اس وقت تک پریشان رہیں گے جب تک تمہاری پہنچ کی اطلاع نہیں ملتی۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے ایک بٹوہ دیتے ہوئے کہا۔ اس میں تمہارے لیے امریکہ کے ڈالر اور افریقہ کے راند (ریال) ہیں۔ اپنا پاسپورٹ ہر جگہ اپنے پاس سنبھال کر رکھنا، کسی اجنبی پر بھروسہ نہ کرنا۔ جس محبت سے لانی یہ ساری تفصیل مجھے بتا رہی تھی مجھے دلی مسرت ہو رہی تھی کہ اس خاندان کے لوگوں کو میرا کتنا خیال ہے۔

ناشتے کے بعد باپو اور لانی کے ساتھ فیکٹری گیا۔ دینو چاچا مجھے دیکھ کر خوش ہوا، کہنے لگا جنوبی افریقہ جا رہا ہے تو مجھے بھی اپنے سوٹ کیس میں رکھ کر لیتا جا۔ میں نے ہنس کر جواب دیا، سوٹ کیس کی بجائے کندھوں پر بٹھا کر کیوں نہ لے جاؤں، چاچا۔ دینو چاچا ہنس کر بولے، تمہارا کہنا ہی میرے لیے کافی ہے۔ بس جیتے رہو پیارے۔ کافی دیر باپو کے ساتھ فیکٹری میں گزارا۔ شام کے وقت واپسی پر باپو نے میرے ہاتھ میں انگوٹھی دیکھ کر پوچھا، یہ کہاں سے لی ہے رے، میں نے بتایا کہ بابا نے دی تھی۔ انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر مجھے ایک انگوٹھی دیتے ہوئے کہا، کلکتہ آتے وقت کپڑے نکال کر گٹھڑا خالی کیا تو یہ انگوٹھی نیچے پڑی تھی۔ میں نے سوچا اسے وہیں چھوڑنے سے بہتر ہے کہ ساتھ لیتا جاؤں اس لیے جیب میں رکھ لی۔ اچھا ہوا میں اسے ساتھ لیتا آیا تھا۔ تم اب پردیس جا رہے ہو تو یہ انگوٹھی اپنی دوسری انگلی میں پہن لو۔ سفر میں مشکل کے دوران ایسی چیزیں بڑے کام آتی ہیں۔

انگوٹھی دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ رمپا رانی یہ انگوٹھی آج سے چار برس بیشتر میری جیب میں اڑس گئی تھی جو پچھلے چار برسوں سے گٹھڑے میں پڑی تھی۔ باپو سے لے کر انگوٹھی میں نے اسی وقت پہن لی پھر اپنے کپڑوں کا ایک سوٹ کیس تیار کیا جس میں اپنی ضرورت کے تمام کپڑے ڈالے۔ ہوائی سفر میں کالی یا گورے کو ساتھ نہیں لے کر جا سکتا تھا اس کے باوجود میں رات کی رانی کا جار، منکے اور بین سوٹ کیس میں رکھنا نہیں بھولا۔ لانی کے مشورے کے مطابق اپنے ہاتھ میں رکھنے والے بیگ میں شیو کا سامان، دو جوڑے کپڑوں کے علاوہ باقی ضرورت کا چھوٹا موٹا سامان رکھا۔ لانی نے مشورہ دیا کہ مجھے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن کر لمبا سفر کرنا چاہیے۔ عشائیے سے فارغ ہو کر بابا کو، جینا کو، شام کو، نواب صاب کو، اور مہاراج کو خطوط لکھ کر باپو کو دئے تا کہ وہ انہیں سپرد ڈاک کر دیں۔ میری پرواز چھ بجے صبح روانہ ہونی تھی اس لیے ہم صبح چار بجے ناشتہ کر کے گھر سے نکل گئے۔ ایئر پورٹ گھر سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ لانی اس وقت تک میرے ساتھ رہیں جب تک میں امیگریشن سے نہیں نکلا۔

اس کے باوجود کہ ہیلی کاپٹر کا ایک چھوٹا سا ہوائی سفر پہلے کر چکا تھا۔ اتنا لمبا ہوائی سفر میری زندگی کا پہلا سفر تھا اور دوران سفر میں نے ذہن کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے وہاں کیا کرنا ہوگا۔ بس ایک بات تھی کہ وہاں نیتو ہوگی۔ کچھ دن دیار غیر میں اس سے مل بیٹھنے کو ملیں گے۔ میں نے کلکتہ اور بمبئی اور وہاں سے ڈربن تک اپنے ذہن کو بالکل خالی رکھا۔ جہاز ڈربن کے ایئر پورٹ پر اترا۔ امیگریشن سے فارغ ہونے کے بعد باہر آ کر سامان لیا۔ اپنے نام کا ٹیگ پہنے کسٹم سے نکلا تو اس وقت دن کے دس بجے تھے۔

کئی لوگ اپنے اپنے ہاتھوں میں ناموں کے تختے یا کاغذ اٹھائے ایئر پورٹ سے نکلنے والے مسافروں کو تک رہے تھے۔ میں نے اپنا نام ان تختوں اور کاغذوں پر ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ بار بار گزر کر پڑھا لیکن مجھے اپنا نام کہیں لکھا ہوا نظر نہ آیا۔ اپنا آئندہ لائحہ عمل سوچنے کے لیے میں ٹیکسیوں کے سٹینڈ کے پاس پڑے ہوئے بینچ پر اپنے سامان کے قریب بیٹھ کر لانی کی دی ہوئی ڈائری سے یہاں کے لوگوں کے نام پڑھنے کے لیے ورق گردانی کرنے لگا۔ ڈائری میں ڈربن کے چند لوگوں کے نام بھی درج تھے۔ دس پندرہ منٹ اسی شش و پنج میں نکل گئے۔ اپنے آس پاس ٹیلی فون بوتھ ڈھونڈنے کے لیے نگاہ دوڑائی تو مجھے کچھ دور ایک فون بوتھ نظر آیا۔ ابھی وہاں جا کر کسی کو فون کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ میرے سامنے نیلے رنگ کی ایک لمبی کار آ کر رکی۔ کار میں جھانکا تو ڈرائیور شکل و صورت سے ہندوستانی

لگتا تھا۔اس نے مجھ سے ہندی میں پوچھا، کہ آپ راموشنان صاب ہیں؟ میں نے کہا، ہاں۔ کہنے لگا، سر میرا نام موہن ہے اور میں آپ کو لینے آیا ہوں۔

سامان گاڑی کی ڈکی میں رکھا اور ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا؟ ہم یہاں سے کبرلی کب تک پہنچیں گے۔اس نے جواب دیا، صاب آپ سفر سے تھک گئے ہوں گے۔ابھی میں آپ کو ہوٹل لے جاؤں گا وہاں آپ آج کا باقی دن اور رات آرام کریں۔کل صبح تک آپ کی تھکاوٹ دور ہوجائے گی تو ہم لوگ یہاں سے کبرلی کے لیے چلیں گے۔اس کی بات معقول تھی۔کلکتہ سے ڈربن تک کا لمبا سفر تھکا دینے والا تھا۔موہن مجھے ایئر پورٹ سے کچھ دور ایک کئی منزلہ ہوٹل میں لے گیا۔اب سے پہلے میں ہندوستان میں صرف کشمیر کے ایک دو بڑے ہوٹلوں کے علاوہ کسی اور ہوٹل میں نہیں رہا تھا اس لیے اگر میں اس ہوٹل کا مقابلہ کشمیر کے اس بڑے ہوٹل سے بھی کروں تو یہ ہوٹل کشمیر کے ہوٹل سے دس گنا بہتر تھا۔

ڈرائیور میرا سامان پوٹر کو دیتے ہوئے بولا، صاب یہاں آپ کے نام سے ایک کمرہ بک ہے۔میں کل صبح آپ کو لینے آؤں گا۔اس کے ساتھ ہی وہ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ہوٹل سے باہر کھڑے ہوئے باوردی لوگوں نے میرا سامان سنبھالا اور میں نے اندر کلرک کے پاس جا کر اسے اپنا نام بتایا تو اس نے مسکراتے ہوئے ایک چابی میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا، اٹھارویں منزل پر سوئیٹ نمبر گیارہ آپ کے لیے تیار ہے سر۔لفٹ کے ذریعے میں اٹھارویں منزل پر پہنچا۔ایک کمرے کے دروازے پر گیارہ نمبر کندہ تھا۔دروازہ کھول کر میں جونہی کمرے میں داخل ہوا کوئی مجھ پر اچانک جھپٹا اور مجھے اپنی بانہوں کی مضبوط گرفت میں جکڑ لیا۔ اپنے جکڑنے والے کو پہچان کر میری آنکھیں حیرت سے تقریباً اُبل پڑیں۔

بقیہ: سَنک

اس رات میں اپنا سب کچھ اپنے شوہر پر نچھاور کرنے ہوٹل گئی تھی مگر دوسرے روز صبح ہوٹل چھوڑنے کی تیاری کی تو میں طے نہیں کر پا رہی تھی کہ سب کچھ لٹا کر جا رہی ہوں یا مالا مال ہو کر لوٹ رہی ہوں۔ مجھ پر کچھ ایسا نشہ طاری تھا کہ مجھے لگا میں ہوٹل کے کمرے سے ٹانگے تک چل کر جا بھی پاؤں گی یا نہیں۔ ہر چیز لبریز ہوتی، بھاری بھاری، لچک دار محسوس ہو رہی تھی۔دل، ذہن، جسم یہ سب شاخِ گل کی طرح جھکے جا رہے تھے۔

میرے شوہر مجھے ٹانگے تک چھوڑنے آئے۔ میں ٹانگے پر سوار ہوئی۔انہوں نے ٹانگے والے کو پچھلی رات ہمیں لے آنے کا اور اب مجھے چھوڑنے کا کرایہ ادا کیا تو اس بڑھے ٹانگے والے اور ان کے بیچ کچھ تو تو میں میں ہوگئی۔

کیا صرف پانچ روپے؟

کیوں پانچ روپے کم ہیں کیا؟

دس روپے دیجئے جناب دس۔پانچ آنے کے، پانچ جانے کے۔

یہ لو، ایک روپیہ اور۔۔۔

میں خیرات نہیں مانگ رہا ہوں۔

میرے سمجھانے کے باوجود انہوں نے چھ روپے سے ایک پیسہ زیادہ نہیں دیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے دودھ سے لبریز برتن میں کسی نے نمک کی ڈلی ڈال دی ہو۔ٹانگے والے نے بڑبڑاتے ہوئے روپے جیب میں ڈالے اور اپنے ہمزاد کا غصّہ بیچارے بے زبان گھوڑے پر نکالا۔اچانک چابک کی مار سے گھوڑا بدک کر تیزی سے آگے بڑھا اور پھر اپنی اصلی رفتار پر آ گیا۔

ٹانگہ چرچراتا ہوا گھر کی طرف گامزن تھا۔ میں اپنے وجود میں نمک کی ڈلی کی جگالی کرتے ہوئے راستے کی بھیڑ سے بے خبر، اداس بیٹھی تھی۔ اتنے میں ٹانگے والے نے جیسے اپنے منہ سے نمک کے ذائقے کو تھوک دینے کے لیے گھوڑے پر چابک چلا دیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

یہ بابو لوگ، سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔

میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

سُور سالے، بن ٹھن کر گھومتے، کھانے، پینے اور موج مزے پر من مانا خرچ کر سکتے ہیں مگر کسی محنت کش کو دینا ہو تو حرامزادوں کی نانی مرتی ہے۔

اس کا نفرت انگیز جملہ سُن کر میں نے منہ پھیر لیا۔کچھ پل وہ خاموش ٹانگہ چلاتا رہا پھر بڑے ہمدردانہ لہجہ میں بولا:

بیٹی۔۔۔

لفظ بیٹی اور اس کے پیار بھرے لہجے نے مجھے اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔اس نے میری آنکھوں میں دم توڑتے پرندے کی طرح دیکھتے ہوئے پوچھا۔

بیٹی۔۔۔اس نے تمہیں تو پورے پیسے دیے ہیں ناں؟

پیار کا بے لوث جھرنا

رینو بہل
(چنڈی گڑھ، بھارت)

کبھی کسی زمانے میں امیر اللہ تسلیم کا یہ شعر بڑا مناسب لگتا تھا:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

مگر آج کے دور میں زندگی اس قدر تیز رفتاری سے بھاگ رہی ہے کہ صبح کے بعد صرف رات ہوتی ہے شام بہت کم لوگوں کے نصیب میں آتی ہے۔ مشینی دور نے لوگوں کو بھی مشین بنا دیا ہے۔ وقت کے ساتھ قدم نہ ملا کے چلنے والا پیچھے رہ جاتا ہے اور وقت کے ساتھ چلنے کے لیے خود کو وقت کے سانچے میں ڈھالنا لازمی ہے۔ ماحول کے برعکس خود کو بدلنا ضروری ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں وقت بدل سکا اور نہ ماحول پھر بھی وہ زندگی سے قدم ملا کر چل رہے ہیں۔ یہ دنیا کے کسی کونے میں چلے جائیں اپنی Originality نہیں بدلتے۔

یوگیندر بہل تشنہ صاحب بھی اُن لوگوں میں سے ایک ہیں۔ پتا نہیں اِسے ہم اُن کی خامی کہیں یا خاصیت کہ صدیاں گزر گئیں مگر وہ ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ وقت کے ساتھ جسم نے ضرور عمر کی کئی دہلیزیں پار کیں مگر مزاج اور طبیعت کا رنگ برقرار رہا۔

کہتے ہیں انسان غلطیوں کا پُتلا ہے اور ہر ٹھوکر کے بعد انسان اپنی غلطیوں سے ہی سیکھتا ہے مگر تشنہ صاحب کے کیا کہنے۔ اپنے مزاج اور طبیعت سے مجبور کئی بار چوٹ کھائی کئی بار سنبھلے، پھر گرے پھر سنبھلے۔ اس نکتے کی وضاحت میں ضرور کروں گی۔ مگر اس سے پہلے ایک بات اور سُن لیں۔ تشنہ صاحب کہنا بڑا رسمی سا لگ رہا ہے لہٰذا میں اُنہیں بہل انکل کہہ کر مخاطب کروں گی جیسے ہمیشہ کرتی آئی ہوں۔ ایک بات اور واضح کرتی چلوں کہ میرا اُن سے خون کا رشتہ نہیں ہے صرف پیار، خلوص اور عقیدت کا رشتہ ہے۔ ہمارا اسم ضرور ایک ہے، ایک ہی ملک کے باشندے ہیں مگر ہماری ملاقات بذریعہ چہارسو راولپنڈی ہوئی۔ بہت سی باتیں یکساں ہیں مثلاً اُن کے آباؤ اجداد کا تعلق بھی نوشہرہ سے ہے جس سے ہمارے بزرگوں کا ہے۔ اُن کی شادی کی تاریخ اور سال بھی وہی ہے جو میرے والدین کا ہے۔ میرے لیے قابلِ احترام وہ اس لیے بھی ہیں کہ وہ مجھے اپنی بیٹی مانتے ہیں اور ایک بیٹی ہی جرأت کر سکتی ہے اپنے والد کی خامیوں کی نشاندہی کرنے کی۔

بہل انکل کی خامیوں کا تذکرہ تو بعد میں کرتے ہیں پہلے اُن کی زندگی سے آپ کو روشناس کرادوں۔

۲۷۔ نومبر ۱۹۲۸ء کو نوشہرہ ضلع پشاور میں یوگیندر سنگھ نے جاگیردار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ نوشہرہ میں ہی بچپن اور لڑکپن گزرا۔ میٹرک وہیں سے کی۔ آپ سائنس کے طالب علم تھے اور ادب سے دور دور تک کوئی رشتہ نہ تھا۔ بھلا ہو دل کا جس نے لڑکپن میں ہی اپنا جوہر دکھا دیا۔ پہلے پیار نے کئی رنگوں سے آشنا کرایا تو رنگ برنگے، مہکتے، چہکتے، خوشیوں سے لبریز جذبات شاعری میں ڈھل کر اُبھرنے لگے۔ محبت نے شاعری سکھادی۔

غمِ روزگار نے آبائی وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۴۶ء میں ایئر فورس کی نوکری جوائن کر لی۔ طبیعت تو پہلے سے ہی مست مولا تھی اور ایئر فورس کی نوکری نے ''کھاؤ پیو موج کرو'' کا نظریہ اپنا لیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک کا بٹوارا ہوا تو وہ اپنے والدین اور اُن کے ساتھ تقریباً خاندان کے سبھی لوگوں کو لے کر ایئر فورس کے جہاز سے دلی پہنچ گئے۔

چونکہ بہل انکل تقسیم کے باعث اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے تھے لہٰذا اُنہوں نے اپنے ادارے کی اجازت سے دورانِ ملازمت کیمپ کالج میں داخلہ لے لیا جو پنجاب یونیورسٹی سے الحاق رکھتا تھا۔ نہ صرف بہل انکل بلکہ اُن کے ساتھ قریب دس نوجوانوں نے بہل انکل کی پیروی میں کیمپ کالج میں داخلہ لیا جہاں سے ہر روز صبح یہ ہوائی ٹولہ پالم ہوائی اڈہ دہلی کینٹ سے اپنی اپنی سائیکلوں پر کالج جاتے اور اس طرح ان سب نے کیمپ کالج دہلی سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ بہل انکل اس دور کو اپنی زندگی کے سنہرے دور سے تعبیر کرتے ہیں اور ہنس ہنس کر سناتے ہیں کہ جب جہاز اڑانے والے سائیکلوں پر کالج جاتے تھے تو نہ صرف آس پاس کے لوگ اُن کا مذاق اڑاتے بلکہ وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کی کھِلّی اڑانے سے باز نہ آتے۔

۱۷۔ فروری ۱۹۵۷ء میں دلی کی ہی پڑھی لکھی لڑکی سدیش سے شادی کر کے جنم جنم کے رشتے میں بندھ گئے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹے نے دونوں کی گھر ہستی کو مکمل بنا دیا۔

یوگیندر سنگھ بہل نے پہلی کتاب ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ''A Simple Study of Aeroplane Engine'' لکھی۔ Rolls Royle England نے اسے چھپوانے کی اجازت دے دی۔ اس کے ساتھ اُنہیں سرکاری منظوری کی بھی ضرورت تھی جو انہیں ملی نہیں۔ سرکار کی نظر میں اسے چھپوانے سے ملک کی خفیہ جانکاری لیک ہو سکتی تھی۔

۱۹۶۱ء میں انہوں نے ایئر فورس کی نوکری سے اپنی مرضی سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ لندن سے Business Management کا ڈپلومہ کیا اور امریکہ سے Herbal & Alternative Madicine کا ڈپلومہ کر کے اس موضوع کا مزید مطالعہ ہندوستان میں جاری رکھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مطالعہ ان کی روح کی غذا ہے۔ دلی میں اپنا کاروبار شروع کیا اور وہیں قیام کر لیا۔

اب بات اُن کی ادبی خدمات کی کریں تو آپ کو حیرت ہوگی یہ جان کر کہ تقریباً ۸۰ سال پہلے یعنی ۱۹۳۸ء میں انہوں نے پہلی نظم نئے سال پر قلم بند کی۔ پہلے پیار کا ذائقہ چکھا تو ۱۹۴۳ء میں اپنے جذبات کے اظہار کے لیے شاعری کا ہی سہارا لیا۔ دھیرے دھیرے آپ بیتی کا درد جگ بیتی میں بدل گیا۔ حساس طبیعت شاعر اب دنیا کے رنج و غم دیکھ کر بلبلا اُٹھتا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ درد شاعری کے ساتھ ساتھ افسانوں میں بھی ڈھلنے لگا۔ ''تشنگی'' ان کے افسانوں کا واحد مجموعہ ہے جبکہ اردو میں سات شعری مجموعے، ایک ہندی کویتا کی کتاب اور مینجمنٹ پر انگریزی میں دو کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ حال ہی میں اُن کا شعری مجموعہ ''قطرہ قطرہ زندگی'' پوری آب و تاب کے ساتھ چھپ کر قارئین تک پہنچ چکا ہے۔ غزل اور نظم وہ متواتر لکھ رہے ہیں جبکہ افسانہ لکھنا بہت کم کر دیا ہے۔ دل پر چھائے غبار کو نکالنے کے لیے وہ شاعری کا سہارا لیتے ہیں۔ نہ ستائش کی چاہ نہ تنقید کی پرواہ۔ اتنا خیال رکھتے ہیں کہ اُن کی جانب سے کسی کا دل نہ دُکھے۔ کہنے والے اُنہیں حادثات کا شاعر بھی کہتے ہیں۔ جس بھی حادثے نے متاثر کیا چاہے خوشی کا ہو یا غم کا اُسے نظم کی شکل میں پرو کر اپنے دل کی بات کہہ دیتے ہیں۔

ایئر فورس کی نوکری کا اثر ہے جو وہ آج بھی نظم وضبط (Discipline) کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

وقت کی پابندی کے قائل، سادہ کھانا اور سادہ زندگی بسر کرنا اُنہیں پسند ہے۔ خوش گفتار، خوش مزاج شاید اس لیے ۹۰ سال کی عمر میں ہشاش بشاش ہیں۔ کینیڈا، امریکہ اور بھارت کے سفر اکیلے طے کر لیتے ہیں۔

بہل انکل کی شخصیت مقناطیسی ہے جو ایک بار اُن کے رابطے میں آ جائے تو اُن کے خلوص، محبت، شفقت اور پیار کے جال سے بچ نکلنا ممکن نہیں۔ بھلا آج کے دور میں کوئی ایسا دیوانہ ملے گا جو سراپا خلوص اور پیار ہو۔ نہ کسی سے کوئی شکوہ نہ شکایت، نہ گلہ نہ غصّہ، نہ جھگڑا نہ نفرت۔ اُنہیں جاننے والے جانتے ہیں کہ انہوں نے کبھی اپنی تکلیف، محرومی، اپنا دکھ اپنے درد کا نہ کسی سے کوئی ذکر کیا نہ کوئی تذکرہ۔ ہمیشہ حال پوچھنے پر ایک ہی جواب ''عیش کر رہا ہوں''۔ ہر شخص کی تعریف کی، کبھی کسی کی برائی اُن کے منہ سے نہیں سُنی۔ اگر کسی مرد کا ذکر ہو تو کہیں گے ''بہت شاندار آدمی ہے'' اور اگر کسی عورت کی بات ہو تو ''بڑی سوہنی کُڑی ہے'' خواہ وہ کُڑی ''بوڑھی'' ہی کیوں نہ ہو۔ فیروز عالم کی نسبت لفظ سوہنا منڈا تو چہارسو کے حلقے میں بہت نام پا چکا ہے۔

اُن کا مذہب انسانیت ہے۔ ہر طبقے کے لوگ چاہے وہ کسی بھی مذہب کسی بھی ملک کے ہوں سب اُن کے لیے برابر ہیں۔ سب سے اُن کی دوستی ہے۔ رنگ، نسل، مذہب، زبان، سرحدیں اُن کی محبت میں کبھی حائل نہیں ہوئیں۔ یاروں کے یار۔ ایک بار جس سے رشتہ جوڑ لیا پھر وہ آخری سانس تک نبھانے میں یقین رکھتے ہیں۔ اسی سے جڑا ایک قصّہ سن لیں۔

اُن کے ایک بڑے گہرے دوست کے بیٹے جسے وہ اپنے بیٹے سے کم نہیں سمجھتے تھے اُس نے انہیں نہ صرف کاروبار میں دھوکہ دیا بلکہ بہت بڑا مالی نقصان بھی پہنچایا۔ اس بات پر غصہ کرنا، گلہ کرنا تو درکنار اس حادثے کا کسی سے ذکر بھی نہیں کیا اور جب اُس دوست کو دل کا دورا پڑا تو اُس کا علاج بھی خود کرایا اور اُسے اور اُس کی بیوی کو اپنے گھر لے آئے۔ جب تک وہ صحت یاب نہیں ہو گئے دونوں میاں بیوی کو اپنے پاس ہی رکھا۔ اب آپ ہی بتائیں ایسے شخص کو دیوانہ کہیں گے کہ نہیں؟ کیا یہ اُن کی عادت اُن کی خامیوں میں شمار نہ ہوگی؟ جس سے چوٹ کھائی اُسی کے زخموں پر مرہم کون لگاتا ہے؟

اُن کی طبیعت کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ بچوں کی طرح چھوٹی چھوٹی بات سے خوش ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو خوشی دے کر، کسی کے کام آ کر اپنی خوشی دوبالا کر لیتے ہیں۔ اپنے عزیزوں کے خاص دن یاد رکھتے ہیں اور وِش کرنا کبھی نہیں بھولتے۔ اگر کبھی کسی نے غلطی سے یا باتوں باتوں میں اپنی ضرورت کا ذکر کر دیا تو اُس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُس کی ضرورت پوری کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور واقعہ یاد آیا۔ آپ بھی سنیئے:

بات اُن دنوں کی ہے جب کرول باغ میں اُن کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ اُسی عمارت میں ایک نوجوان بھی کام کرتا تھا جس سے اُن کی صرف راہ رسم تک جان پہچان تھی۔ ایک روز وہ ملنے آیا تو اُس کو پریشان دیکھ کر پوچھا۔ اُس نے صرف اتنا ہی کہا کہ CA میں داخلے کا پیپر تو پاس کر لیا مگر فیس کہاں سے بھرنی ہے یہ فکر پڑی ہے۔ جھٹ سے میز کے دراز سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور اُس کے سامنے رکھ دی۔ وہ حیران و پریشان اُن کا منہ دیکھنے لگا۔ بہ مشکل اتنا ہی کہہ پایا کہ ''میں یہ قرض کیسے چکا پاؤں گا؟'' جھٹ سے بولے ''یہ قرض نہیں میری طرف سے تحفہ ہے۔ جلدی سے فیس بھر دو۔''

وہ نوجوان آج امریکہ میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں CA ہے۔ آج بھی اُن کے رابطے میں ہے۔ اُن سے ملتا ہے اور اعتراف بھی کرتا ہے کہ اُس کی کامیابی کے پیچھے اُن کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

کارِ خیر اور دستِ شفا بہل انکل کے کردار کا ہمیشہ حصّہ رہا ہے۔ اُن کے بارے میں وفا شعاری بشرطِ استواری کا جملہ صد فیصد درست آتا ہے۔ اورنگ آباد (ضامن زیدی مرحوم کا آبائی شہر) دہلی، فرید آباد اور غازی آباد کی علمی ادبی انجمنوں کی خاموشی سے امداد اور تعاون بہل انکل کے معمولات میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ ادب اور ادیب کے مسائل میں بہت دلچسپی لیتے اور اعلیٰ حکام تک اہلِ قلم کے مسائل پہنچانے پر خوشی سے تیار ہو جاتے۔ بہت سے لوگ اس امر سے باخبر ہیں کہ بہل صاحب اعلیٰ ایوانوں میں بہت عزت و توقیر رکھتے ہیں۔ بھارت کے سابق صدر ڈاکٹر شنکر دیال شرما سے اُن کی قربت ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اکثر اپنا انگریزی کلام بہل انکل کو مطالعہ کی غرض سے بھیجتے۔ کبھی کبھی بہل انکل کو جو کلام زیادہ بھاتا اُسے اردو میں منتقل کر کے صدر صاحب کو بھیج جاتے۔ دھیرے دھیرے ایک کتاب ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے

انگریزی کلام کے ترجمے کی وجود میں آ گئی جس کی تقریبِ رونمائی صدر ہاؤس میں منعقد کی گئی۔

سابق وزیرِاعظم ہند جناب آئی کے گجرال سے بھی بہل انکل کے دوستانہ مراسم تھے۔اردو کی ترقی و ترویج کے حوالے سے مشہور گجرال کمیٹی کے ممبر کے طور پر بہل انکل نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور وہ جو کہتے تھے:

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

جب اسی دلّی اور دلّی والوں نے دلّی کے سچّے عاشق استاد شیخ ابراہیم ذوقؔ کی آخری آرام گاہ کو گمنامی کے اندھیروں میں مٹا دیا تو بہل انکل نے ڈاکٹر خلیق انجم اور کمیٹی کے دیگر اراکین کے ساتھ مل کر دن رات جدو جہد کی اور نہ صرف اُستاد ذوقؔ کی قبر دریافت کی بلکہ اربابِ بست و کشاد کے تعاون سے اُس قبر کو دریافت بھی کرایا جہاں بد ذوق اور بدمزاج لوگوں نے بیت الخلاء تعمیر کر لی تھی۔

وفا شعاری اُن کو گھٹی میں ملی ہے۔اگر چہ پہلے پیار، پہلی محبت کو اب تک نہیں بھولے تو اپنی شریکِ حیات جس سے جنم جنم کا رشتہ جوڑا تھا وہ رشتہ آج بھی نبھا رہے ہیں۔ان کے ہونے یا نہ ہونے سے وفاداری میں کوئی کمی نہیں آئی۔ جس عمر میں وہ انہیں تنہا چھوڑ گئی اکثر مرد اُس عمر میں دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ دوست، احباب سب کے زور دینے پر بھی اُنہوں نے اُس کی جگہ کسی اور کو دینا گوارا نہیں کی۔ اپنی تنہائی پر یادوں کا لبادہ اُوڑھ لیا۔ آپ ہی بتائیں یہ اُن کی خاصیت ہے یا خامی؟

بہل انکل کے خاص دوستوں میں ضامن زیدی، خلیق انجم، مدن لال گلاٹھی، انل ٹھکّر، نندکشور وکرم، مہندر پرتاپ چاند، ڈاکٹر فیروز عالم، ڈاکٹر ریاض احمد، گلزار جاوید اور پروین شیر سرِ فہرست ہیں۔ضامن زیدی کی زندگی نے وفا نہیں کی مگر بہل انکل آج بھی وفا کی ڈور کا ایک سرا تھامے ہوئے ضامن زیدی کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

ایک شخص جو اُن کے دل کا مستقل مکیں ہے وہ مدیرِ چہارسو گلزار جاوید ہے۔ دونوں کی محبت، دوستی اور وفا کو کسی بھی لازوال محبت سے تشبیہ دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بقول گلزار جاوید ''ایک روز صبح ہی صبح فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف بہل صاحب تھے۔ بغیر سلام دعا اور کسی تمہید کے بولے: پچھلے جنم میں تم میرے بیٹے تھے یا باپ، کسی غیر کی اتنی یاد نہیں آ سکتی جتنی تمہاری آتی ہے''۔

اب آپ کو اختیار ہے کہ ایک دوسرے سے بے لوث اور بے پناہ محبت کرنے والوں کی اس جوڑی کو آپ کیا نام دیتے ہیں؟ آپ کی معلومات کے لیے ایک بات اور عرض کرنا ضروری ہے جس کی راوی محترمہ پروین شیر ہیں۔گزشتہ سال محترمہ پروین شیر کا اپنے پرانے مسکن کینیڈا جانے کا اتفاق ہوا۔ ان دنوں بہل انکل بھی کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں اپنی بیٹی کے پاس مقیم تھے۔ باتوں باتوں میں جب پروین شیر نے اُن کے مزاج اور کینیڈا کی آب و ہوا کے بارے دریافت کیا تو بولے ''زندگی کے دن جیسے تیسے گزر ہی جائیں گے۔ مجھے اختیار ہوتا تو میں زندگی کے آخری ایام گلزار کی ہمراہی میں گزارتا مگر موجودہ حالات میں اس حوالے سے خواہش ہی کی جا سکتی ہے۔'' بقول پروین شیر بہل صاحب کی یہ بات سُن کر میری آنکھیں بھر آئیں مگر میں خود پر ضبط کرتے ہوئے دل ہی دل میں میر تقی میرؔ کا درج ذیل شعر بہل صاحب کی نذر کرنے لگی:

میرؔ ہم مل کے بہت خوش ہوئے تم سے پیارے
اس خرابے میں میری جان تم آباد رہو

قریب دو برس پہلے محترمہ پروین کے شوہر جناب وارث شیر دل کے عارضہ کے باعث انتقال کر گئے تو بہل انکل اتنے آزردہ ہوئے کہ انہوں نے پروین شیر کی دلجوئی کے لیے منظوم کلام کے صفحات بھر ڈالے۔ بقول پروین شیر: بہل صاحب انسان نہیں فرشتہ ہیں اور جس طرح انہوں نے کڑے وقت میں میری ڈھارس بندھائی مجھے ایسا لگا کہ اگر میرے والد حیات ہوتے تو بھی اس سے زیادہ نہ کر پاتے۔

ایک مرتبہ میرے کہنے پر میرا ایک عزیز منیب عثمانی جو اُس وقت دلی میں طالب علم تھا اور ادبی کتابیں پڑھنے کا شوقین تھا بہل انکل سے ملنے اُن کے گھر چلا گیا۔ سارا دن اُن کے ساتھ گزار کر گھر لوٹا تو آتے ہی مجھے فون پر کہنے لگا:

''بہل صاحب سے مل کر طبیعت خوش ہو گئی۔ اُن کی آنکھوں میں پیار اور شفقت کی جو چمک ہے وہ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔''

میں نے پوچھا ''کسی درویش میں بھی نہیں؟''

تو وہ ہنس کر بولا ''وہ کسی درویش سے کم ہیں کیا؟''

اب آپ ہی بتائیں مادہ پرست دنیا میں کسی درویش کا گزر آسان ہے کیا؟ اس درویش کی شخصیت کے رنگ جو میں نے آپ کو دکھائے ہیں یہ آپ کو شاید کسی قصہ، کہانی یا افسانے کے کردار کے تخلیق کئے ہوئے تو محسوس نہیں ہوئے؟ کیا آج کے دور میں آپ نے بے لوث، مثبت رویہ، سراپا محبت، شفقت سے لبریز شخص دیکھا ہے؟ لوگ تو بِنا مطلب کے رب کے گھر بھی نہیں جاتے، عبادت بھی کرتے ہیں تو اُس میں بھی ثواب کا منافع تلاش کرتے ہیں۔ کیا یہ اُن کی شخصیت کی خوبیاں ہیں؟

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں یہ سب اُن کی محبت میں کہہ رہی ہوں۔ اگر یقین نہ آئے تو اُن کے قریب جا کر دیکھ لو، مل کر دیکھ لو اور اگر مجھے غلط ثابت کر سکو تو جو سزا چور کی وہ میری۔ میرے تو روم روم سے بس یہ ہی دعا نکلتی ہے کہ پرماتما انہیں صحت یاب رکھے، حیاتی دے اور پیار کا بے لوث جھرنا کبھی خشک نہ ہو، بہتا رہے، بہتا رہے اور ہم سب کو شرابور کرتا رہے۔ بقول احمد فراز:

گفتگو اچھی لگی ذوقِ نظر اچھا لگا
مدتوں کے بعد کوئی ہم سفر اچھا لگا

کاروانِ مصطفیٰ ؐ

سفرنامۂ حجاز

آپا جمیلہ شبنم

(اسلام آباد)

آج کاروانِ مصطفیٰ ؐ آقائے دوجہاں کے شہر مدینہ کی طرف رواں دواں ہے۔ میری خوش بختی ملاحظہ کیجیے جگہ کھڑکی کے پاس ہی ملی۔ جہاز کی سیٹ کھڑکی کے پاس ملنے سے مکہ مکرمہ کی زیارتوں کو دیکھنے کا سنہرا موقع مل جاتا ہے اور آج پیارے نبی آخرالزماں ؐ کے پسندیدہ شہر مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھی ہوں۔

بس میں بیٹھی درود وسلام پڑھتی رہی اور روتی رہی اور سوچتی رہی۔ غارِ ثور سے مدینہ منورہ تک میرے پیارے نبی کریم ؐ نے اپنے جگری دوست حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے ساتھ یہ طویل اور کٹھن سفر کس طرح مشکلوں سے طے کیا ہوگا۔ دشمنوں نے حضور پاک ؐ کے قتل کا ناپاک منصوبہ بنا رکھا تھا۔ ہر طرف سازشوں کے مضبوط جال بچھے ہوئے تھے۔ مشیتِ ایزدی کا نور رگ وپے میں سمایا ہوا تھا۔ اسی لیے اپنے گھبرائے ہوئے رفیقِ سفر کو تسلی آمیز لہجے میں فرماتے ہیں:

''غم نہ کر۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

مکہ مکرمہ سے مدینہ تک بیشتر علاقہ بنجر اور بے آب وگیاہ ہے۔ سڑک کے دونوں جانب سبزہ اور شادابی سے محروم پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔

مدینہ منورہ پہنچنے سے قبل بس کا ٹائر پھٹ گیا لیکن بس حادثے سے محفوظ رہی۔

نمازِ ظہر راستے میں ہی ادا کی گئی۔ ایک چھوٹی سی مسجد تھی لیکن صفائی اور پانی کا انتظام تسلی بخش نہ تھا۔ مدینہ منورہ کے لیے رسول اکرم ؐ نے یہ دعا فرمائی:

''یا اللہ ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے، تیرے دوست اور تیرے نبی تھے انہوں نے مکہ مکرمہ کے لیے دعا کی۔ میں بھی تیرا بندہ اور رسول ہوں وہی دُعا مدینہ منورہ کے لیے کرتا ہوں۔''

''اے اللہ مدینہ والوں کو مکہ والوں کی نسبت دوگنی برکت عطا فرما۔ اور اُن کے ناپ وتول کے پیمانے میں بھی برکت عطا فرما'' (بخاری)

مدینہ منورہ ہر شخص کو اس کے گناہوں سے دور کرنے میں ایسے ہی مدد دیتا ہے جیسے بھٹی چاندی کو صاف وشفاف کرتی ہے۔

ہماری بس جب شہر مدینہ میں داخل ہوئی تو نمازِ مغرب کے لیے مسجد نبوی کے نورانی میناروں سے مؤذن کی پکار سنائی دی۔

ہماری بس مسجد نبوی کے سامنے ایک بلند وبالا ہوٹل الجنتہ طیبہ کے سامنے جارکی۔ اپنا مختصر سا سامان لفٹ کے ذریعہ اپنے کمرہ نمبر ۹۔۸ میں پہنچایا۔

جدید آسائشوں سے آراستہ کمرہ کشادہ کھڑکی میں سے مسجد نبوی میری پرنم آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ کتنی بابرکت اور نورانی فضاؤں میں میرا یہ جسمِ کثیف آ پہنچا ہے۔

یہ نورانی راتیں، منور اُجالا\
مبارک ہو مجھ کو مدینے میں آنا

وضو سے فارغ ہوتے ہی آٹھویں منزل سے بذریعہ لفٹ نیچے آئی۔ مسجد نبوی کے صاف شفاف دالان طے کرتی ہوئی بابِ عمر خطاب ؓ سے مسجد نبوی ؐ میں داخل ہوئی۔ حرم شریف جیسا ہی پاکیزہ اور سہانا سماں۔ ہر طرف نور وسرور۔

تیری نوازش! اداس چہروں پہ مسکراہٹ سی آ گئی ہے\
خزاں کے باغوں میں وہ کھلائے حسین منظر گلاب تو نے\
تیری ہی فکرِ رسا سے کیسے بدل گئے ہیں دکھوں کے موسم\
کہ گرم صحرا کے منظروں کو دیئے خنک ماہتاب تو نے\
سِلوں کے نیچے دبے ہوؤں کو خدائے واحد کی آگہی دی\
جھلستے جسموں پہ کیسے برسائے رحمتوں کے سحاب تو نے

امام صاحب کی امامت میں نمازِ مغرب ادا کی۔

اب خانہ کعبہ کی یاد دل میں سمائی ہوئی تھی۔ اب روضۂ رسول ؐ دیکھنے کو نگاہیں بے تاب تھیں۔

سعودی حکومت نے روضۂ رسول ؐ پر حاضری دینے کے لیے خواتین کے خاص اوقات مقرر کئے ہوئے ہیں۔ نمازِ عشاء کے بعد مسجد نبوی کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔

اس لیے نمازِ عشاء ادا کر کے واپس ہوٹل آ گئی۔ کاروانِ مصطفیٰ ؐ کے منتظمین لائق تحسین وآفرین ہیں کہ ہمیں بروقت نہایت عمدہ کھانا مہیا کرتے ہیں۔ مکہ مکرمہ سے ناشتہ کر کے عازمِ مدینہ ہوئی تھی۔ راستے میں کچھ نہ کھایا۔ اس لیے رات کا کھانا رغبت سے کھایا۔ تھکی ہاری جب بستر پر لیٹی تو سفید براق جالی کے پردوں میں سے مسجدِ نبوی کے جگ مگ کرتے نورانی مینار میری آنکھوں کے سامنے تھے۔

میں زیرِ لب ایک نعت کا یہ خوبصورت شعر پڑھتی رہی۔

میں سو جاؤں یا مصطفیٰ ؐ کہتے کہتے\
کھلے آنکھ صلی علیٰ کہتے کہتے

نمازِ تہجد کی اذان سے آنکھ کھل گئی۔ بغیر کسی حیل وحجت کے بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بہتری انتظامات سے مزین باتھ روم میں وضو کیا اور درود وسلام کے ہار پروتی مسجدِ نبوی ؐ جا پہنچی۔ دل ودماغ نور وسرور میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اقبال عظیم کے یہ نعتیہ کلمات یاد آ گئے۔

مدینہ جا کے یہ جانا تقدس کس کو کہتے ہیں\
ہوا پاکیزہ پاکیزہ ، فضا سنجیدہ سنجیدہ

وہی اقبالؔ جس کو ناز تھا کل خوش مزاجی پر
فراقِ طیبہ میں رہتا ہے اب رنجیدہ رنجیدہ

عبادت و ریاضت میں وقت بہت تیزی سے گزرتا جارہا ہے۔

آج روضۂ رسولؐ پر حاضری دی۔ خواتین زیارت مقررہ اوقات میں ہی کر سکتی ہیں۔ رش بے پناہ تھا مگر پیارے نبی کریمؐ کی بے لوث محبت اور جذبہ ایمانی نے میرے بوسیدہ جسم و جان کو مضبوط سہارا دیئے رکھا۔

تلاوتِ کلام پاک، درود و سلام اور توبہ استغفار کا ورد، توبہ تقویٰ کی اصل ہے۔ قلبِ آدم کو جب توبہ کے صابن سے خوب صاف کیا گیا اور آنکھوں کے پانی سے اس کو خوب دھویا گیا تب رحمتِ الٰہی کی بارش ان پر ہوئی اور ان کو اپنا قرب عطا کیا۔ آدمؑ کے قلب میں محبت الٰہی کا تخم بویا گیا اور چشمۂ چشم کے پانی سے سیراب کیا گیا تو اس تخم کی پہلی شاخ یہ نمودار ہوئی:

ربنا ظلمنا انفسنا....

اور اس شاخ پر توجہ کی کلیاں نمودار ہوئیں جس سے ہدایت کا پھول کھلا اور اجتہادِ معرفت کا پھل حاصل ہوا۔ جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے:

ثُمّہ اجباہ ربہ فتاب علیہ وھدی

سیدالاستغفار وردِ زبان رہا۔ ''یا اللہ، تو میرا رب ہے، تیرے سوا کوئی اللہ نہیں تو نے مجھے پیدا کیا اور میں تیری بندی ہوں۔ تیرے عہد اور تجھ سے کئے ہوئے وعدے پر بقدرِ استطاعت میں قائم ہوں۔ میں تیری پناہ چاہتی ہوں۔ ان برے کاموں سے جو مجھ سے سرزد ہوئے، تیری نعمتوں کی معترف ہوں۔ اپنے گناہوں کا اقرار کرتی ہوں تو مجھے بخش دے تیرے سوا کوئی میری بخشش کرنے والا نہیں۔

آج جمعتہ المبارک ہے۔ مؤذن کی مسحور کن آواز سے مسجدِ نبوی کے در و دیوار گونج اُٹھے۔ نمازِ فجر میں امام صاحب نے سورۂ رحمٰن کی قرأت شروع کی جب وہ اس آیت پہ آئے:

فبای آلاءِ ربکما تکذبٰن

تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے رب ذوالجلال براہِ راست مجھ سے مخاطب ہے۔ ''کہ میری کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''

اس خیال کا آنا تھا کہ میرے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجھ گناہ گار پر تیری اتنی نعمتیں ہیں، اتنی رحمتیں ہیں کہ جن کا شمار ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اس سورہ مبارکہ کے الفاظ ایک انتہائی دلکش ترنم کے ساتھ میرے کانوں میں رس گھولتے رہے اور میری آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی برستی رہی۔ نماز کے اختتام پر میں نے صدقِ دل سے رب العزت کا شکر ادا کیا اور محبت سے روضۂ رسولؐ کی طرف دیکھا تو مجھے یوں لگا کہ حضورؐ شفقت بھری نظروں سے مجھے دیکھ کر مسکرا رہے ہیں اور جیسے کہہ رہے ہوں کہ ''ایک تو ذرہ ذرہ سی بات پر روتی بہت ہے۔''

اب میں کیا کہتی کہ سرکارؐ یہی ذرہ سی بات ہی تو میری متاعِ حیات ہے۔ آج مدینہ منورہ کی مقدس مقامات کی زیارت کی۔

جبلِ اُحد کے دامن میں اسلام کی دوسری جنگ لڑی گئی اللہ پاک نے اس غزوہ کا سورہ آلِ عمران میں کئی جگہ ذکر فرمایا ہے کہ امتِ محمدیؐ اس سے ضروری ہدایت پا سکے۔

جس ٹیلے کے عقب میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے حملہ کیا تھا، وہاں لوگوں کا ہجوم ہے۔ رسول پاکؐ کی نافرمانی کا نتیجہ مسلمانوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ ثابت ہوا۔ مگر رحمتِ خداوندی اپنے محبوب دوست کی مدد کے لیے ان کے شاملِ حال رہتی ہے۔

مسجدِ قبا و مسجدِ ضرار

جب رسول کریمؐ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی تو پہلے قبا میں قیام فرمایا جو مدینہ منورہ سے تقریباً تین کلومیٹر جنوب میں ہے۔ آپؐ نے یہاں چند دن قیام فرمایا اور وہاں ایک مسجد تعمیر کی جس کا نام مسجدِ قبا ہے۔ آپؐ نے یہ مسجد خاص اللہ کی خوشنودی اور رضا کے لیے بنائی۔ اللہ تعالیٰ کو آپ کا یہ عمل بہت پسند آیا۔ سورۂ توبہ میں ارشادِ خداوندی ہے:

''بھلا جس شخص نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضامندی پر رکھی وہ اچھا ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد گر جانے والی کھائی کے کنارے پہ رکھی وہ اس کو دوزخ کی آگ میں لے کر گری اور خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

جب رسول اکرمؐ تبوک کی جنگ سے واپس تشریف لا رہے تھے تو راستے میں اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی منافقوں کی چالاکی کا پول کھول دیا۔ پس رسولِ اکرمؐ نے اپنے چند اصحابہ کرام کو کہا کہ مسجدِ ضرار کو مسمار کر دیں اور آگ لگا کر تباہ کر دیں۔ اس واقعہ کی تفصیل سورۂ توبہ میں ہے۔

ترمذی شریف میں ہے کہ مسجدِ قبا میں نماز ادا کرنے کا ثواب عمرہ کے ثواب کے برابر ہے۔ مسجد انتہائی خوب صورت اور پرنور ہے۔ چھ رکعت نمازِ نفل ادا کر کے رحمتوں اور برکتوں کے لازوال خزانوں سے دامنِ دل کو مالا مال کیا۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔

مسجدِ قبلتین

مسجدِ قبلتین کا مطلب ہے ایسی مسجد جس کے دو قبلے ہوں یعنی ایک خانہ کعبہ کی طرف اور دوسرا مسجدِ اقصیٰ کی طرف۔

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے لیے یہی قبلہ تھا بعد ازاں بنی اسرائیل کے کچھ انبیاء کے لیے یروشلم میں مسجدِ اقصیٰ قبلہ مقرر کیا گیا۔ یہ انبیاء مسجدِ اقصیٰ میں نماز ادا کرنے کے لیے اس طرح کھڑے ہوتے کہ مسجدِ اقصیٰ اور بیت اللہ ان کے سامنے ہوتے۔

حضرت محمدؐ نے مدینہ منورہ ہجرت کرنے کے بعد سولہ یا سترہ ماہ مسجدِ اقصیٰ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی۔ کیونکہ سب انبیاء کی طرح آپ بھی اللہ تعالیٰ

کے احکام کے تابع تھے گو کہ آپؐ کی ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ ان کے لیے وہی قبلہ ہو جو آدمؑ اور ابراہیمؑ کے لیے تھا۔ آپؐ کو بہت امید تھی کہ اللہ تعالیٰ اس تبدیلی کا حکم نازل فرما دیں گے۔ اس انتظار میں آپ اکثر اپنا سر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے۔ سورۃ البقرہ میں ارشادِ خداوندی ہے:

''(اے محمدؐ) ہم تمہارا آسمان کی طرف منہ پھیر پھیر کر دیکھنا دیکھ رہے ہیں سو ہم تم کو اسی قبلے کی طرف جس کو تم پسند کرتے ہو منہ کرنے کا حکم دیں گے تو اپنا منہ مسجدِ حرام (یعنی خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو اور تم لوگ جہاں ہوا کرو نماز پڑھتے وقت اسی مسجد کی طرف منہ کر لیا کرو۔''

پس اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبیؐ کی خواہش پوری کر دی۔ رسول اکرمؐ مسجدِ قبلتین میں ظہر کی (بعض روایات میں عصر) نماز ادا کر رہے تھے۔ نماز کے دوران ہی قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا۔ پس رسول اکرمؐ اور آپؐ کے مقتدی صحابہ کرام نے نماز کے دوران ہی اپنی سمت بدل لی۔

اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں اپنی ہی حکمت مخفی ہوتی ہے۔

''قبلہ کی تبدیلی منافقین اور مومنین کو پرکھنے کی کسوٹی تھی۔''

سورۃ البقرہ (۱۴۳)

چند دیگر تاریخی مقامات

مسجدِ اجابہ: یہ مسجد موجودہ انصار ہسپتال کے قریب ہے۔ رسول اکرمؐ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے اس میں دو رکعت نماز ادا کی۔ اس نماز کے بعد رسول اکرمؐ نے بہت لمبی دعا مانگی۔ بالآخر رسول اکرمؐ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا:

''میں نے اللہ تعالیٰ سے تین چیزوں کی درخواست کی کہ میری امت کو قحط سالی سے تباہ نہ فرمایا۔ دوسرے یہ کہ میری امت غرق ہو کر تباہ نہ ہو اور تیسری یہ کہ میری اُمت باہمی لڑائی جھگڑے سے محفوظ رہے (مسلم)''

مسجدِ ابی ذر۔ مسجدِ غمامہ

مسجدِ غمامہ مسجدِ نبویؐ شریف کے مغرب میں ہے۔ اور رسول اکرمؐ یہاں عید کی نماز پڑھاتے تھے۔

مسجدِ جمعہ

یہ مسجد قبا سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ رسول اکرمؐ نے جمعہ کی پہلی نماز یہاں ادا کی تھی۔

البقیع

رسول اکرمؐ اس قبرستان کی زیارت کو جاتے اور مدفون صحابہؓ کے لیے دعا فرماتے، ان میں سے ایک دعا یہ ہے:

''اے مومنین کی بستی، آپ سب کو السلام علیکم۔ انشاء اللہ ہم بھی آپ سے ملنے والے ہیں۔''

آپؐ کے کنبہ کے درج ذیل افراد یہاں مدفون ہیں:

''رسول اکرمؐ کی بیٹیاں فاطمہؓ، رقیہؓ، اُمِ کلثومؓ اور زینبؓ۔ آپؐ کا بیٹا ابراہیمؓ بھی۔ آپ کی سب بیویاں سوائے حضرت خدیجہؓ اور میمونہؓ کے۔ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ اور پھوپھیاں صفیہؓ اور عاتکہؓ۔ ان کے علاوہ حسنؓ، فاطمہ بنت اسدؓ (حضرت علی کی والدہ صاحبہ) عقیلؓ بن ابوطالب اور عبداللہ بن جعفر بن ابوطالب۔۔۔''

اس قبرستان میں ہزاروں صحابہ کرام دفن ہیں۔ مدفون صحابہ کرام میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

''حضرت عثمانؓ بن مظعون، حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت حنیسؓ بن حذیفہ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت اسعدؓ بن زرارہ، حضرت سعدؓ بن معاذ۔۔۔''

علاوہ ازیں امام مالکؒ، امام نافعؒ، امام زین العابدینؒ، امام جعفر صادقؒ اور آپ کی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہؓ بھی یہیں مدفون ہیں۔

مسجدِ نبویؐ کا اندرونی حصہ

یوں تو مسجد کا چپہ چپہ مبارک ہے لیکن بعض ستونوں اور محرابوں کا تاریخی بیان ضروری ہے۔ یاد رہے کہ موجودہ مسجد کے ستون اسی جگہ پر ہیں جہاں رسول اکرمؐ کے زمانے میں تھے۔

۱۔ستونِ وفود

اس جگہ رسول اکرمؐ باہر سے آنے والے وجود سے ملاقات کیا کرتے تھے۔

۲۔ستونِ فرس

یہاں سیکورٹی گارڈ کھڑا ہوا کرتا تھا۔ اس استوانہ کے سامنے حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں ایک دروازہ تھا جہاں سے رسول اکرمؐ مسجد میں تشریف لایا کرتے تھے۔

۳۔ستونِ ابی لبابہ/ستونِ توبہ

ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت محمدؐ نے یہودی قبیلہ بنونظیر کو ان کی خیانت کی سزا دینی چاہی تو بنونظیر کے کہنے پر حضرت ابولبابہؓ کو ثالث مقرر کیا۔ اس قبیلہ سے بات چیت کے دوران حضرت ابولبابہؓ سے غلطی سے اللہ کے رسولؐ کا ایک راز فاش ہو گیا جس کا انہیں فوراً احساس ہوا۔ ابولبابہؓ نے اپنے آپ کو مسجدِ نبویؐ کے اس ستون کے ساتھ باندھ لیا تھا۔ سات دن اور رات ایسے ہی بندھے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپؓ کی توبہ قبول فرمائی۔ اس سلسلہ میں سورہ انفعال کی آیت ۲۸۔۲۷ امتِ مسلمہ کی ہدایت کے لیے نازل ہوئیں اسے ستونِ توبہ بھی کہتے ہیں۔

یہ مقامِ عبرت ہے کہ صحابہ کرامؓ غلطی سرزد ہونے کی صورت میں اس کی تلافی کے لیے ایسے مشکل افعال سے گزرتے تھے۔ ان کے ہاں راز فاش کرنا یا وعدہ خلافی ایک بہت بڑا جرم تھا۔

۴۔ستونِ عائشہؓ

طبرانی نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رحمتِ عالمؐ نے فرمایا کہ ''میری مسجد میں ایک ایسی جگہ ہے کہ اگر لوگوں کو وہاں نماز پڑھنے کی فضیلت کا علم ہو جائے تو وہ قرعہ اندازی کرنے لگیں۔''اس جگہ کی نشان دہی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمائی تھی یہ وہی جگہ ہے۔

۵۔ستونِ مخلقہ

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رحمتِ عالمؐ مسجدِ نبوی میں کھجور کے ایک خشک تنے سے ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ایک دن انصار نے آپؐ سے درخواست کی کہ آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے لیے ایک منبر بنا دیں تا کہ آپ اس پر بیٹھ کر خطبہ دے سکیں اور آپ کی تھکاوٹ میں تخفیف ہو۔آپؐ نے یہ رائے قبول کر لی اور ایک لکڑی کا منبر بنایا گیا جس کی تین سیڑھیاں تھیں۔جب آپؐ اس منبر پر بیٹھ کر خطبہ دینے لگے تو کھجور کا تنا زاروقطار رونے لگا۔صحابہؓ نے اس تنے کا رونا اپنے کانوں سے سنا۔رحمتِ عالمؐ منبر سے اُترے اور اس تنے کو گلے لگا لیا۔یہ تنا سسکیاں بھرتے بھرتے چپ ہو گیا۔یہ تنا اس لیے رو رہا تھا کیونکہ یہ اپنے قریب کئے جانے والے اللہ کے ذکر سے محروم ہو گیا تھا۔بعد میں اس تنے پر ایک خوشبو لگائی جاتی تھی جس کو خلوق کہتے ہیں۔اس لیے یہ استوانہ مخلقہ کے نام سے مشہور ہو گیا (بخاری)

۶۔محرابِ نبویؐ

رسول اکرمؐ اور چاروں خلفاء کے زمانے میں مسجدِ نبوی میں نہ تو کوئی محراب تھا اور نہ ہی مینار۔یہ محراب عمر بن عبدالعزیزؒ نے ۹۱ھ میں تعمیر کیا۔اگر آپ اس محراب میں نماز کے لیے کھڑے ہوں تو آپ کے سجود کی جگہ رسول اکرمؐ کے پاؤں کی جگہ ہو گی جبکہ رسول اکرمؐ کے سجود کی جگہ آپ کے سامنے بنی ہوئی دیوار کے سامنے ہے۔

۷۔محرابِ عثمانی

تیسرے خلیفہ عثمان بن عفانؓ اس جگہ نماز کی امامت فرماتے تھے۔اب بھی مسجدِ نبویؐ کے امام صاحب نماز کے دوران یہاں ہی کھڑے ہوتے ہیں۔یہ محراب عمر بن عبدالعزیزؒ نے بنوایا۔

۸۔محرابِ حنفی

ایک زمانے میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی امام صاحبان مسجدِ نبوی میں قدرے مختلف اوقات میں مختلف جگہوں پر نماز پڑھاتے تھے۔آج کل مسجد نبوی میں ایک ہی امام صاحب نماز پڑھاتے ہیں جو کہ حنبلی ہیں۔یہ تبدیلی سعودی حکومت کے قیام پر معرضِ وجود میں آئی۔

۹۔منبر

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ میرے منبر اور میرے حجرے کا درمیانی حصہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔اور میرا منبر قیامت کے دن حوضِ کوثر پر ہو گا۔اگر آپ مسجدِ نبویؐ شریف میں بابِ جبریل سے داخل ہوں تو یہ چبوترہ آپ کے دائیں ہاتھ ہو گا۔اسے سلطان نور الدین زنگی نے تعمیر کرایا تھا۔اکثر زائرین اسے صفّہ سمجھتے ہیں جو کہ درست نہیں۔

صُفّہ:

صُفّہ کے معنی سایہ دار جگہ، یہ ایک چبوترہ تھا جہاں غریب اور بے گھر صحابہ کرامؓ مقیم تھے۔اور اسلامی تعلیمات و تربیت حاصل کرتے تھے۔

بیرحا:

اگر آپ بابِ فہد سے مسجدِ نبویؐ میں داخل ہوں تو یہ کنواں تقریباً ۱۵ میٹر مسجد کے اندر واقع ہے۔وہاں فرش پر تین دائرے بنا دیے گئے ہیں۔اللہ کے آخری رسولؐ اس کنوئیں پر کئی بار تشریف لائے اور اس کا پانی پیا۔دراصل یہ کنواں اور باغ حضرت طلحہؓ کی ملکیت تھا۔جب انہوں نے سورہ آلِ عمران کی آیت نمبر ۹۲ سنی (تم اس وقت تک اعلیٰ تقویٰ حاصل نہیں کر سکتے جب تک تم اپنی سب سے پسندیدہ شے اللہ کی راہ میں نہ دے دو) تو یہ کنواں اور باغ بطورِ صدقہ دے دیا تا کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔صحابہؓ ایسے ہی فی الفور اور پورے خلوص سے قرآنِ پاک کی ہدایات پر عمل پیرا ہوتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کا گھر:

اگر آپ منبر سے بابِ صدیق کی طرف چلیں تو پانچویں ستون کے بعد آپ کا گھر تھا۔ایک دن رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ سب گھروں کے دروازے جو مسجدِ نبوی کی طرف کھلتے ہیں بند کر دیے جائیں سوائے ابوبکر صدیقؓ کے گھر کا دروازہ۔یہ اس بات کی پیش گوئی تھی کہ ابوبکر صدیقؓ پہلے خلیفہ ہوں گے۔

مدینہ منورہ میں کھجور کے درختوں کے سرسبز و شاداب جھنڈ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے پانی آبشار کی طرح بہتا نظر آتا ہے جو بہت دلکش منظر پیش کرتا ہے۔مدینہ منورہ اور اس کے گردونواح میں جو لوگ مدتوں سے رہتے ہیں، کتنے خوش بخت ہیں۔مدینہ منورہ اور اس کے گلی کوچوں سے بلکہ ذرّے ذرّے سے ان کی گہری شناسائی اور قربت ہے۔ہم دُور افتادہ مسلمانوں کے لیے مقامِ شکر ہے کہ ہمیں بھی یہ مقدس مقامات دیکھنے کا موقع نصیب ہوتا ہے۔

جسے چاہا در پہ بلا لیا جسے چاہا اپنا بنا لیا
یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے
عطا کیا مجھ کو دردِ الفت کہاں تھی یہ پُر خطا کی قسمت
میں اس کرم کے کہاں تھا قابل حضورؐ کی بندہ پروری ہے
خاک چھانیں تو راہِ عشق کی چھانیں
ذرّے ذرّے سے یہاں بوئے وفا آتی ہے
غمِ احمدؐ میں مرے دل سے نکلتا ہے دھواں
جب اُمنڈتی ہوئی قبلہ سے گھٹا آتی ہے

باقی صفحہ ۱۰۲ پر ملاحظہ کیجیے

''آنکھوں کے خواب''

قطعات

منظرایوبی
(کراچی)

(غم خواری)

خلقتِ شہر ہے عزیز تو پھر
دکھ زمانے کے بانٹتے رہیے
اور جب پتھروں کی بارش ہو
بیٹھے زخموں کو چاٹتے رہیے

(سخت جانی)

سر اٹھانے نہ دیا خواہشِ بے جا کو کبھی
عشق کی گرتی ہوئی ساکھ بچالی اس نے
چاہنے والوں پہ کتنا بڑا احسان ہے یہ
دوستی فرض نہ تھی، پھر بھی نبھالی اُس نے

(نیند کی چوری)

لے کے جاؤ گے کہاں ادھ کھلی آنکھوں کے یہ خواب
میری راتوں کی عبث نیند چرالی تم نے
طاقِ جاں پر جو امیدوں کا دِیا تھا روشن
جانے کیا سوچ کے لُو اس کی بجھا دی تم نے

(تضاد)

اُس کے ہر قول میں تعمیر کا پہلو مضمر
میری ہر بات سے تخریب کی بو آتی ہے
دونوں اخلاق کے قائل ہیں مگر عرض یہ ہے
زندگی کس کا عمل دیکھ کے شرماتی ہے؟

○

رعبایات

شاہین
(کینیڈا)

بھوکا بھی نہیں اور مرے سر پر چھت ہے
کپڑا تن پر ہے آنکھ میں غیرت ہے
بھولے سے کبھی بے ہنری میں مجھ سے
کچھ کام اگر ہوا تری رحمت ہے

اپنے کو تو کیا جانتے کچھ ہوش نہ تھا
آسان سی اک چیز تھی لیکن دنیا
اب خود کو سمجھنے کی جو توفیق ہوئی
دنیا نظر آنے لگی گورکھ دھندا

شے اپنے ہی قالب سے نکل جاتی ہے
اک آن میں تصویر میں ڈھل جاتی ہے
کرتا ہوں نگاہ جب حقیقت کی طرف
اِس بیچ میں تصویر بدل جاتی ہے

○

غاردرغار

پروین شیر
(نیویارک)

وقت کے بے کراں غار میں
ہیں ازل سے بھٹکتے بدن
ہے بھرم
بس یہی ہے مکمل کہ اب
کچھ نہیں ہے، کہیں کچھ نہیں
ہے پسِ غار کیا
کچھ خبر ہی نہیں
یہ اندھیروں کی خوگر نگاہیں جہاں
صرف پرچھائیاں ہی حقیقت ہیں بس

جسم کے غار میں
جاں بھٹکتی ہے تاریکیوں میں لیے
تیسری اک نظر کا دیا
جس کی پلکیں ابھی تک کھلیں بھی نہیں...!!

○

اب کیا لکھوں

یونس صابر
(پشاور)

مصرعہ مصرعہ سوچ رہا ہوں کیا لکھوں
سچّے بولوں سے سجتا چہرہ لکھوں

جگ تو جنگل ہے ڈھیروں آلائش کا
تجھ سے مانگ لیا تو پھر سُتھرا لکھوں

منزل منزل کھوج رہی جاری اپنی
اب تو تیرا دکھلایا رستہ لکھوں

جانے کیوں رہتے ہیں آپ خفا اکثر
نظم اگر کوئی سی نعت نما لکھوں

ستیہ پال، بیدی، گلزار سبھی لکھ گئے
فرانسیسی آزادؔ کی نعت کا کیا لکھوں

مولانا ایدھیؔ اور مدر تریصہؔ سا
ہر دم ڈیوٹی کروں شفا نسخہ لکھوں

حرف و سخن کی ہے معراج یہی صابرؔ!
اقراء اقراء اور اُمّہ اُمّہ لکھوں!!

○

رشتۂ لاثانی

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

میری پیاری جیون ساتھی ہو
مخلص ہو بہت جذباتی ہو
جس کام میں تم لگ جاتی ہو
پورا کر کے دِکھلاتی ہو

ایثار و وفا تیری فطرت ہے
خدمت میں مگن تیری عادت ہے
اس فطرت اور اس عادت نے
میرا سارا قبیلہ جیتا ہے

جب پاس میرے تم آئی تھیں
ماضی کو وہیں چھوڑ آئی تھیں
ماضی کاذکر جب آتا تھا
کچھ دیر کو گم ہو جاتی تھیں

تقدیر کا لکھا یونہی تھا
وہ ہو کے رہا جو ہونا تھا
یہ بندھن اپنی قسمت کا
پہلے سے لکھا اِک کاغذ تھا

میں تم سے محبت کرتا ہوں
اور دم الفت کا بھرتا ہوں
یہ جان تو آنی جانی ہے
پر رشتہ یہ لاثانی ہے

○

موسم کی پہلی برف باری

فرح کامران (نیویارک)

سنو!!
موسم کی پہلی برف باری ہے
میں کھڑکی میں کھڑی
روئی کے گالوں کی طرح کے
نرم لیکن سرد سے بے آب قطروں کو
جونہی محسوس کرتی ہوں
تو ٹھنڈک میری رگ رگ میں اتر کر
دوڑتے پھرتے، چہکتے خون کے
ہر ایک قطرے کو
بہت بے جان، بے حس، منجمد سا کرتی جاتی ہے
مرے تاریک سے کمرے کے آتش دان میں
سوکھی بہت سی لکڑیاں جل تو رہی ہیں
مگران کی تپش
میری ٹھٹھرتی روح کو کچھ زندگی دے ہی نہیں پاتیں
تو ماضی کے جھروکوں سے
وہ لمحے سامنے آ کر
بہت بے چین کرتے ہیں
وہی گزرے ہوئے لمحے
وہ تیری بے پناہ چاہت بھری
بے تاب نظروں کا فقط اک لمس
جو میرے جسم کو چھوتا
تو میرے تن بدن میں
حرارت اک نئے انداز میں ایسے سماتی تھی
کہ جیسے صبح دم سورج کی روشن اک کرن
آسماں کو نور سے آباد کرتی ہے
زمیں پر بے کراں پھیلی ہوئی تاریکیوں کو
پھر گل و گلزار کرتی ہے
سنو!!
آجاؤنا۔۔
پھر سے حرارت چاہیے مجھ کو
یہاں موسم کی پہلی برف باری ہے۔

''ترالہجہ''

(فاکہہ سجل کے نام)

شگفتہ نازلی

(لاہور)

سمندر پار سے۔۔۔
جب فون پہ تم بات کرتی ہو۔۔۔
تو صوت و نغمہ کا احساس کیا رقصاں سا رہتا ہے۔۔۔
کھنک لہجے کی ہے جوں بہتا جھرنا۔۔۔
چہک لفظوں کی جوں گلشن میں رُکنا۔۔۔
ترا لہجہ بِنا لفظوں کے لگتا، بولتا ہے۔۔۔
بیاں سے پہلے، کیوں کہ سوچتا ہے۔۔۔
غنائیت تیرے لہجے کی عجب رس گھولتی ہے۔۔۔
کسی اخلاص کی کھڑکی کو جیسے کھولتی ہے۔۔۔
لہجہ تیرا گلاب بھیگا سا۔۔۔
لہجہ تیرا رُباب بجتا سا۔۔۔
مل کے آتے کئی دنوں تک پھر۔۔۔
مجھ کو مخمور کیئے رہتا ہے۔۔۔
مجھ کو مسرور کیے رہتا ہے۔۔۔!

O

بُت

رُوپا صَبا

(چنڈی گڑھ، بھارت)

یُوں بھی ہوتا ہے
کسی دوشیزہ کی بانہوں میں
کوئی کانچ کی چُوڑیاں پہنادے
پیروں میں پائل
اور آنچل پہ ستارے سَجادے
اور پھر اُس سے
یہ کہہ دیا جائے کہ
یہ کانچ کی چُوڑیاں
یہ پائل، یہ ستارے
کھنکیں نہیں، چمکیں نہیں
یہ دوشیزہ
کتنا خوبصورت بُت ہے نا؟
بے جان ہے تو کیا ہوا؟!

O

انتظار

کلیم فیض پوری
(ممبئی، بھارت)

وہ اک شخص
کہ آئے گا غار سے اک دن
زمین کھودے گا
نہریں نکال لائے گا
ہمارے اونٹ جو قرنوں کی پیاس رکھتے ہیں
پڑے ہیں ریت کی چادر میں سر چھپائے ہوئے
ہمارے بکریاں بھیڑیں اداس چرواہے
چلے ہیں ننگے بدن سورجوں کے سائے میں
سبھی ہیں صحرانوردی وقت کے مارے
وہ اک شخص جو آئے گا کوہ صحرا سے
یہی گمان ہے برسوں سے اپنا سرمایہ
نہ جانے کتنے ماہ وسال، موسموں کا عذاب
سہتے سہتے تو قیامت ہی گزر جائے گی
اب انتظار بھی کیسے کریں گے کہ آئے گا
اٹھو
چلو
کہ یہ تیشہ جو اپنے ہاتھ میں ہے

○

کاذب فرار

سلیم انصاری
(جبل پور، بھارت)

آج میں خود سے بہت دور نکل آیا ہوں
اپنے جزبوں سے پرے
اپنے خیالوں سے پرے
اپنی یادوں کی وراثت سے پرے
آج میں خود سے بہت دور نکل آیا ہوں
دور اتنا کہ جہاں
کوئی نہین دور تلک
کوئی ہمدرد نہیں
کوئی بھی دمساز نہیں
صرف ٹوٹے ہوئے رشتوں کی سلگتی ہوئی ریت
میری آنکھوں کے سمندر کی طرف اڑتی ہے
دور تک گمشدہ لمحات کی قبروں پہ
اداسی کے دیئے جلتے ہیں
کوئی رستہ، کوئی منزل نہ کسی سمتِ سفر کا امکان
واپسی کی سبھی راہیں مسدود
صرف اک جھوٹی انا ہے
جو نئے خواب دکھاتی ہے مجھے
خواب ایسے جنہیں تعبیر سے ڈر لگتا ہے
خواب ایسے
جنہیں بیتے ہوئے لمحات کی سچّائی سے خوف آتا ہے
آج میں خود سے
بہت دور نکل آیا ہوں
پھر بھی لگتا ہے
کوئی مجھ کو پکارے
تو پلٹ جاؤں میں
اپنے جزبوں کی طرف
اپنے بیتے ہوئے لمحوں کی طرف
اپنی طرف
اپنے بدن میں واپس

کولیسٹرول

ڈاکٹر فیروز عالم
(کیلیفورنیا)

گزشتہ صدی کے نصف آخر میں عوامی صحت عامہ کے حوالے سے ہر ملک کی حکومت نے جس قدر ''کولیسٹرول'' کو اہمیت دی ہے اور اسکا تذکرہ کیا ہے، ہر قاری اس سے بخوبی واقف ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ امراض قلب اور شریانوں کے تنگ ہونے کی وجہ سے جو اموات ہوتی ہیں ان میں کولیسٹرول کی زیادتی کو اولیت حاصل ہے۔اس وقت ترقی یافتہ دنیا میں سب سے زیادہ اموات اسی بیماری سے ہوتی ہیں۔امریکہ میں ہر سال تقریباً آٹھ لاکھ افراد امراض قلب سے جاں بحق ہو جاتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ہر تیس سیکنڈ میں ایک ہارٹ اٹیک ہوتا ہے اور ہر ایک منٹ میں ایک موت واقع ہوتی ہے۔اگر ہارٹ اٹیک ہسپتال سے دور شہر کے کسی حصے میں ہو تو طبی امدا ملنے سے پہلے ہی اس سے نوے فیصد افراد ہلاک ہو جاتے ہیں۔اس وقت امریکا میں حملہ قلب سے مرنے والوں میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ دل کی بیماری سے مرنے والوں کی تعداد تمام اقسام کے کینسروں سے مرنے والوں سے بھی زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ شریانوں کی تنگی کے نتیجے میں ہونے والے اسٹروک سے معذوری بھی ایک بڑا سماجی اور اقتصادی مسئلہ بن جاتا ہے۔ان اعداد شمار کی وجہ سے صحت عامہ کے ادارے اس بات کی لگن میں ہیں کہ ان امراض کا تدارک کیا جائے۔اس حوالے سے یہ دریافت انقلابی تھی جب ایک روسی سائینسدان نے ۱۹۱۳ میں یہ ثابت کیا کہ خون کی نالیوں (شریانوں) میں جمنے والے کیلشیم اور چربی کے کھرنڈ جو خون کے بہاؤ میں رکاوٹ کرتے ہیں دراصل کولیسٹرول کی وجہ سے ہیں اور ان کھرنڈوں میں کولیسٹرول کی مقدار خون میں بہتی ہوئی کولیسٹرول کی مقدار سے تیس فیصد زیادہ ہے۔کئی مغربی مما لک میں مزید ریسرچ کے بعد ۱۹۶۱ میں امریکا کی غذائی ایجنسی اور مراض قلب کی انجمن نے کولیسٹرول کو مجرم قرار دے کر ہدایات جاری کیں کہ غذا میں چربیات کا استعمال کم کیا جائے اور ایسے دوسرے اقدامات کئے جائیں جن سے کولیسٹرول میں کمی کی جاسکے۔یہ بات پایہ تکمیل کو پہنچ گئی ہے کہ کولیسٹرول کی زیادتی شریانوں کی تنگی اور امراض قلب کا سبب ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھنا ضروری ہے کہ بہت سے ایسے لوگوں کو بھی ہارٹ اٹیک ہوتا ہے جن کا کولیسٹرول لیول بالکل نارمل ہو۔

کولیسٹرول کیا ہے

کولیسٹرول ایک قسم کی چربی یا روغنی قسم کا مادہ ہے جو ہمارے جسم میں قدرتی طور پر موجود ہوتا ہے۔سب سے پہلے ایک فرانسیسی طبیب نے اٹھارہویں صدی میں اس کو پتے سے نکلنے ولاے زرد رنگ کی رطوبت جسے ''پت'' کہتے ہیں سے اخذ کیا تھا۔اس کے بعد ایک جرمن سائینسدان نے اس کی ماہیت معلوم کی اور پھر روسی سائینس دان نے اس کو شریانوں کی بیماری سے منسوب کیا۔دراصل کولیسٹرول ایک انتہائی کارآمد عنصر ہے بلکہ یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ زندگی کا اہم جزو ہے۔اس کی وجہ سے ہمارے جسم کے خلیات کی گرد موجود جھلی صحیح حالت میں اور مضبوط رہتی ہے، یہ مختلف قسم کے ہارمون، جن کے بغیر زندگی ممکن نہیں، بنانے میں مدد کرتی ہے اور جلد میں سورج کی روشنی کے اثر کے تحت وٹامن ڈی بناتی ہے جو ہڈیوں کے لئے ضروری ہے۔

خون میں موجود کولیسٹرول کا اسی فیصد خود ہمارا جسم تیار کرتا ہے صرف بیس فیصد کولیسٹرول ہماری غذا سے حاصل ہوتی ہے۔کولیسٹرول جگر (کلیجہ) بناتا ہے اور یہ ''پت'' کے ذریعہ معدے اور آنت میں خارج کی جاتی ہے جہاں اس کے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوسکتا۔غذا کے ہضم ہونے کے بعد یہ واپس آنتوں کے ذریعے خون میں جذب ہو جاتی ہے۔

کولیسٹرول، بیماری کا سبب

مسئلہ یہ ہے کہ کولیسٹرول پانی میں حل نہیں ہوتی اس لئے خون کے بہاؤ کے ساتھ اسکی ترسیل مشکل کام ہے مگر یہ بھی ضروری ہے کہ یہ خون کے بہاؤ کے ساتھ مختلف اعضا تک پہنچائی جائے۔اس لئے قدرت نے یہ انتظام کیا ہے کہ اسکی ترسیل اور اسکو جسم کے مختلف حصوں میں پہنچانے کے لئے جگر اسے ایک پروٹین کے ساتھ منسلک کر دیتا ہے اور یہ پروٹین خون میں بہتے ہوئے اسے متعلقہ مقامات تک پہنچاتی ہے۔جب خون میں اسکی مقدار بہت زیادہ ہو تو یہ خون میں بہتے ہوئے خون کی نالیوں میں جمنے لگتی ہے۔اسکی مثال ایسی ہی ہے کہ اگر شیشے کے گلاس میں چکنائی ملا پانی ڈالا جائے اور پھر اس پانی کو پھینک دیا جائے تو بھی گلاس کی اندرونی دیواروں پر چکنائی جمی رہ جاتی ہے۔اسی طرح کولیسٹرول خون کی نالیوں پر جم جاتی ہے۔خون کی نالیوں پر اس جمی ہوئی چکنائی پر کیلشیم اور دوسرے نمکیاتی شورے جمنا شروع ہو جاتے ہیں اور اس طرح ایک سخت کھرنڈ بن جاتا ہے جو خون کی نالی کو تنگ کر دیتا ہے اور خون کے بہاؤ میں رکاوٹ ڈال دیتا ہے۔اگر یہ رکاوٹ زیادہ ہو تو متاثرہ عضو کو خون نہیں ملتا اور وہ زخمی ہو جاتا ہے۔اگر ایسا دل کی شریان میں ہو تو ہارٹ اٹیک ہوتا ہے اور اگر یہ دماغ کی شریان میں ہو تو اسٹروک کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

کولیسٹرول کی زیادتی کی وجوہات

اگرچہ اس موضوع پر بہت تحقیق ہو چکی ہے اور بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ موروثی مرض ہے اور اسکا انحصار ''جین'' پر ہے۔یعنی اگر آپ کی ساخت قدرت کی طرف سے ایسی ہے کہ آپ کے بزرگوں کو بھی کولیسٹرول کی زیادتی تھی تو بہت ممکن ہے کہ آپ کو بھی کولیسٹرول کی زیادتی ہوگی۔ مگر اسی کے ساتھ طرز زندگی کا بھی اس میں بہت ہاتھ ہے وہ لوگ جو موٹاپے کا شکار ہیں، مرغن اور اپنی ضروریات سے بڑھ کر کھانا کھاتے ہیں، صوفے پر نیم دراز ہوکر زیادہ وقت ٹی وی دیکھ کر گذرارتے ہیں اور کسی قسم کی جسمانی ورزش نہیں

کرتے ان کے خون میں کولیسٹرول بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ کولیسٹرول کو تحلیل کر نے کے لئے ورزش بہت اہم ہے۔اور غذائی عادات بھی اس میں کردار ادا کرتی ہیں مگر اب کہا جاتا ہے کہ غذا کا کردار کم ہے۔پھر بھی ایک صحت مند غذا کا استعمال کولیسٹرول کنٹرول کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔

خون میں کولیسٹرول کی سطح

پچھلے پچاس سالوں میں اس موضوع میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں۔بلکہ یہیں یہ کہنا مناسب ہے کہ دسمبر ۲۰۱۴ء میں امریکا کی اعلیٰ ترین غذائی کمیٹی نے یہ سفارش کر کے سب کو حیران کر دیا کہ اب ان لوگوں کے لئے جو مکمل صحت مند ہوں غذا میں کولیسٹرول کے حوالے سے کوئی احتیاط کی ضرورت نہیں ہے۔اسی طرح کئی سال پہلے صرف ایک کولیسٹرول کی سطح جانچی جاتی تھی اور دو سو پچاس ملی گرام کو نارمل سمجھا جاتا تھا مگر اب کئی قسم کی کولیسٹرول دریافت ہو گئی ہیں اور انکی قابل قبول سطح کم سے کم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

جیسے لکھا جا چکا ہے کہ کولیسٹرول خون میں حل نہیں ہوتی اسلئے اس کی نقل وحرکت ایک پروٹین کے ذرّے پر سوار ہو کر ہوتی ہے۔کولیسٹرول اور پروٹین کا یہ مرکب لائپو پروٹین LIPO_PROTEIN کہلاتا ہے۔اپنے وزن کی وجہ سے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔بہت ہلکا VLDL، ہلکا LDL اور بھاری HDL۔ہلکا ذرّہ صحت کے لئے خطرناک ہے اور یہ BAD CHOLESTROL کہلاتا ہے اسلئے کہ یہی شریانوں میں جم کر کولیسٹرول کا کھرنڈ بناتا ہے۔بھاری ذرّہ اس ہلکے ذرے کو واپس جگر میں لانے کا کام کرتا ہے جس سے LDL کی خون میں سطح کم ہو جاتی ہے اور یہ کھرنڈ بنانے میں ناکام ہو جاتا ہے اس لئے اس ذرّے، HDL کو اچھا کولیسٹرول GOOD CHOLESTROL کہا جاتا ہے۔کولیسٹرول کی زیادتی موروثی ہے اور اگرچہ غذا میں اسکا زیادہ استعمال اس پر مزید اثر انداز ہو سکتا ہے مگر اسکا تناسب بہت کم ہے۔

کولیسٹرول کی زیادتی عام طور پر کسی قسم کی علامات ظاہر نہیں کرتی اس لئے یہ ایک خاموش خطرہ ہے جو جسم کے اندر پلتا رہتا ہے اس لئے طبی معائنہ اور تواتر کے ساتھ خون کے ٹیسٹ ہی اسکی تشخیص کا واحد ذریعہ ہے۔

تدارک وعلاج

صحت مند افراد کو کولیسٹرول کی سطح پر نظر رکھنے کے لئے سال میں دو مرتبہ خون ٹیسٹ کرنے کی ضرورت ہے۔مگر خون دینے سے پہلے کم از کم بارہ گھنٹے کا فاقہ ضروری ہے۔وہ لوگ جنہیں مختلف عارضے ہوں ہر تین ماہ خون کی جانچ کروائیں۔اس دوران طرز زندگی میں تبدیلی ضروری ہے۔ورزش، کھانے میں سبزیاں پھل، بھورے آٹے کی روٹیاں اور خشک میوہ کا استعمال مفید ہے۔خاص طور سے اخروٹ کولیسٹرول کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔مچھلی کا استعمال، اوٹ میل سیریل کا ناشتے میں استعمال بھی کولیسٹرول کو کم کر سکتا ہے۔

امراض قلب کی کمیٹیاں سفارش کرتی ہیں کہ کولیسٹرول دو سو سے کم، LDL سو سے کم اور HDL چالیس سے زیادہ بلکہ بہتر یہ کہ پچاس سے زیادہ ہو۔مگر HDL کو بڑھانے کا کوئی طریقہ سوائے ورزش کے نہیں ہے۔وہ لوگ جو دل کے عارضے، ذیابطیس، بلڈ پریشر اور موٹاپے کا شکار ہوں انکے لئے ضروری ہے کہ وہ ان چیزوں سے پرہیز کریں جن میں کولیسٹرول زیادہ ہو۔گھی، مکھن چربی والا گوشت، جھینگے یا لابسٹر میں بہت کولیسٹرول ہے۔زیتون کا تیل اور سورج مکھی کے تیل کا استعمال کولیسٹرول کم کرنے میں مفید ہے۔مکئی کا تیل زیتون کے تیل سے کم فائدہ مند ہے۔اسی طرح مچھلی کے تیل کی گولیاں بھی اچھا اثر رکھتی ہیں۔لہسن کی افادیت سائینسی بنیاد پر مفید ثابت نہیں ہو سکی ہے۔نباتات سے حاصل کئے ہوئے کچھ عناصر بھی کولیسٹرول کو کم کر سکتے ہیں مگر انکا ذکر یہاں ضروری نہیں۔

اگر ان تمام اقدامات سے بھی کولیسٹرول میں کمی نہ ہو تو دواؤں کی ایک قسم STATIN تجویز کی جاتی ہے مگر اس کے کچھ مضر اثرات بھی ہیں۔یہ ادویات خاص طور سے عضلات کی تباہی، پٹھوں میں درد اور اس کے نتیجے میں گردے اور جگر کی خرابی کا سبب ہو سکتی ہیں۔اس لئے ڈاکٹر کی نگرانی ہی میں یہ دوائیں شروع کی جائیں۔

- بقیہ -

کاروانِ مصطفیٰ

نمازِ عصر ادا کر کے مسجد میں ہی عبادت وریاضت رہی۔نمازی عورتیں بہت کم تعداد میں رہ گئی ہیں۔ہر طرف سکون ہی سکون ہے، نور ہی نور ہے۔میں جہاں بیٹھی ہوں دائیں طرف سامنے باب عبد المجید ہے۔سورج کی الوداعی کرنیں مسجدِ نبویؐ کے در و دیوار چوم رہی ہیں۔مدینہ منورہ کا جگمگاتا سورج کتنا روح پرور اور دلکش منظر پیش کر رہا ہے۔

نمازِ مغرب باہر کھلے دالان میں ادا کی۔نیلگوں آسماں تلے صاف ستھرا وسیع وعریض فرش۔

''صفائی ایمان کا حصہ ہے'' مسجدِ نبوی کا ہر گوشہ اس حدیثِ پاک کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ستمبر کی سرسراتی ہوا میں خنکی اور تازگی ہے۔جسم وجان میں آسودگی ہی آسودگی ہے۔ہر طرف محبت بھرا نور ہی نور۔نہ کوئی ڈر نہ خوف۔نہ غمِ فردا نہ غمِ امروز۔بس ایک ہی لگن ہے۔گناہوں کا بارِ عظیم کم ہو جائے۔کٹھن راستہ آسان ہو جائے۔کثافتوں بھرا دل حبِ اللہ اور حبِ رسولؐ سے مالا مال ہو جائے۔

اے اللہ تو معاف کرنے والا ہے۔معافی پسند کرتا ہے پس تو مجھے معاف کر دے۔تکرارِ دعا جاری ہے۔

دھوپ عہد کے افسانے

جمیل احمد عدیل
(لاہور)

عصرِ موجود نے جہاں زیست کو کرشماتی سہولتیں عطا کر کے تیز رفتار، آسان اور پُر آسائش کر دیا ہے وہاں فرد کو اس ماضی سے تہی بھی کر دیا ہے جس نے ایک خوابناک طمانیت کی وساطت سے اُسے اشیا و مظاہر کی بابت پختہ عقائد کی نعمت سے سرشار کر رکھا تھا___ واضح رہے 'موجود' کا زمانی تعین کرتے ہوئے بھی چند صدیاں ضرور درکار ہوتی ہیں___ اس مقام پر 'رجعت پسند' ذہن سے ہمدردی کا اظہار لازم ہو جاتا ہے کہ قرنوں کے مسلمات جب بکھرتے دکھائی دیں تو آنکھیں نمناک کیوں نہیں ہوں گی! اداسی کا سائبان روح کا مقدر کیوں نہیں بنے گا!! کوپرنیکس، ڈارون، فرائیڈ۔۔۔کس کس 'زخم گر' کو، کوسا جائے؟!؟ ہر نئی ایجاد تازہ چرکہ (Trauma) انسان کا نصیب بنانے کے لیے مستعد ہے!!!___!!!اس تناظر میں 'حال' کو 'دھوپ عہد' سے تعبیر کرنا بے جواز نہ ہوگا کہ ان گنت جبت جادو ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے، بے حجابی کے اس دور میں محجوب خامشیاں پیہم آشکار ہو رہی ہیں۔

افسانہ جو اپنے مرکزی جو ہر فسوں کی اساس پر استوار تھا، کیسے بقا کو برقرار رکھ پائے گا؟ یہ سوال سرخ نشان کی صورت سامنے آ کھڑا ہوا___ لیکن حیران کن بات ہے کہ بظاہر یہ نرم و نازک سی صنف نہایت سخت جاں ثابت ہوئی ہے کہ بدلتے تقاضوں کے باوصف قائم ہے، غالباً اس کی فطری داخلی توانائی نے بھرپور ساتھ دے کر اسے حیاتِ نو سے ہمکنار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جدید تکنیک کو اس نے قبول کیا، اسلوب کی تازگی کو جذب کیا، موضوع کی طرفگی کو جزوِ متن بنایا۔علی حیدر ملک کے الفاظ میں: ''اردو افسانہ، آغاز سے اب تک ہمیشہ اپنے زمانے سے آنکھیں ملا کر اور پاؤں مضبوطی سے دھرتی پر جما کر آگے بڑھتا رہا ہے اور اس نے بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔'' اگر کہیں 'وقفہ' آیا بھی تو تفنّس کی مَتھ اپنی علامتی معنویت کا گویا اثبات کراتی رہی ہے۔

طرزِ کہن سے گریز اختیار کرتے ہوئے آئینِ نو سے ہم آہنگی کی روش اپنانے والوں نے آج جس نئے افسانے کو تخلیقی ادب کا ترجمان بنایا ہوا ہے ان میں محترمہ سیمیں کرن کا نام نمایاں ہے۔ یہاں یہ صراحت بے محل نہ ہوگی کہ کبھی ایسا ہو جاتا ہے، بطور مصنف کوئی شخص آپ کے لیے اجنبی نہیں ہوتا؛ مگر اس کی تحریر آپ کے آئینۂ ابصار تک رسائی حاصل نہیں کر پاتی___ سیمیں کرن صاحبہ کے متعلق بس اتنی خبر تھی کہ معاصر افسانہ نگار ہیں لیکن انھیں پڑھنے کا اتفاق نہ ہو سکا___ اب جوان کے افسانوی مجموعے: ''شجرِ ممنوعہ کے تین پتے''، ''بات کہی نہیں گئی'' اور ''لوح'' میں چھپا ایک غیر معمولی افسانہ میسر آئے تو معلوم ہوا، یہاں افسانے/کہانی کا واقعہ معمول سے کافی جدا جادہ تراش چکا ہے۔ان کے افسانوں کی پہلی قرات سے یہ تاثر ابھرا ہے کہ تفکیر کے عمیق تر منطقات کا رقص افسانہ نگار کی مرکزی ترجیح ہے___ عام طور پر فکری نوعیت کے مسائل کی جانب خواتین فکشن رائٹرز زیادہ رغبت محسوس نہیں کرتیں؛ البتہ سیمیں کرن کے لیے واضح استثنا ہے کہ وہ وجودِ انسانی کے ان امکانات کی جستجو میں محو ہیں جو بلاواسطہ یا بالواسطہ مابعد الطبیعات کے علاقوں سے اپنا تعلق جوڑتے ہیں۔

شہزاد منظر نے کہیں لکھا ہے: ''جس عنصر پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے وہ مصنف کا نقطۂ نظر یعنی پوائنٹ آف ویو ہے، جسے مصنف کا نظریہ حیات بھی کہا جا سکتا ہے۔'' یہ وژن یا بصیرت 'خاصاں دی گل' ہے جو خداداد ذہانت اور متواتر تفکر کا انعام ہے___ لیکن___ یہ تعذیب کی صلیب بھی ہے۔محترمہ افسانہ نگار کرب ساعتوں کو گلے کا ہار بنائے مسرور ہیں کہ بہر رنگ یہ صراط ان کا اپنا انتخاب ٹھہرا۔۔۔ آزمائش یہ تھی کہ وہ ان بل کھائے ہوئے مباحث کو کہانی کی بنت کا حصہ بنا پائی ہیں یا نہیں؟ اور اس نوعیت کے مزید سوالات: یعنی فرد کی زندگی کے ناتے کائناتی اسرار کے ساتھ کن گرہوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں؟ پھر مخلوق کا خالق سے رشتہ شخصی اساس پر کچھ حقیقت رکھتا ہے؟۔؟ جی ہاں! ان تناظرات میں افسانہ فنی تقاضوں اور تکنیکی ندرتوں کے ساتھ افسانوی مزاج سے مطابقت رکھنے والا متن کیا تشکیل دے سکا ہے؟۔؟ یہ جانچ اس لیے اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ اس نوع کی بحثیں فلسفے کے مضمون سے مربوط ہونے کے سبب اور طرح کے اسالیب کی صورت گری کرتی ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں: ''یوں بھی فلسفہ، شعور کے حربے سے حقیقت تک پہنچنے کی ایک سعی ہے اور فن، خواب کے وسیلے سے: اس لیے جو فن پارہ اپنے طریق کار کو تج کر، فلسفے کے آلات بروئے کار لانے کی کوشش کرتا ہے، وہ اسی نسبت سے اپنے مشن میں ناکام بھی ہو جاتا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب کا موقف اصولی ہے لیکن فلسفہ مآل کار زندگی ہی کے مدار میں اسیر رہتا ہے؛ نیز فرد کو منہا کر کے کوئی احساس بشری سطح پر ہنوز 'ایجاد' نہیں ہو سکا؛ اس لیے فنِ افسانہ میں فلسفہ شجرِ ممنوعہ نہیں، بس شرط وہی ہے کہ کردار، واقعہ، منظر، ماحول سے اُس کی جڑت کا معاملہ پھول اور شاخ کی organic پیوستگی ایسا ہے یا نہیں؟ تو مطالعۂ متون کے بعد ممکنہ معروضیت نے یہی توضیح کی کہ سیمیں کرن نے علوم و فنون کی منتقلی کے لیے اساطیر کے خزانۂ عامرہ یا جدید علم کلام کی مجلدات کو مرکز مان کر اقتباسات سے عبارت کی تزئین پر یقین نہیں رکھا بلکہ انسانی احساس کے ساتھ ایسا ارتباط قائم کیا ہے کہ ثنویت کی، کوئی شکل ابھرنے نہیں دی۔اب یہ عمل اس درجہ آہن گداز مشقت مانگتا ہے کہ ایک دم دانتوں تلے پسینہ آ جاتا ہے۔جی صاحبو! سائنسی شعور کا آفتاب وجود کے نصف النہار پر چمک رہا ہو، حقائق کُلیوں کے متعین نقوش میں ڈھلے سامنے پڑے ہوں اور افسانہ نگار واقعے کی سمتوں کو اپنے تخلیقی بہاؤ میں آزاد چھوڑ دے، کردار کی مسافت پر کوئی پہرہ نہ بٹھائے___ یہی وہ ہُنر ہے کہ عنان ہاتھ میں ہونے کے علی الرغم دکھائی نہیں دیتی! اپنی موجودگی کو مخفی کرنے/رکھنے کا ایسا طلسم طویل مجاہدے کا مطالبہ کرتا ہے۔

اس تناظر میں جب سیمیں کرن کے افسانے: ''بات کہی نہیں گئی'' (ٹائٹل سٹوری) کا جائزہ لیا جائے تو قصہ ممتاز مفتی کی: 'ان کہی' اور 'کہی نہ جائے' کے متوازی ایسے ٹریک کو متعارف کراتا ہے جو اپنے خیال اور پیش کش کے اعتبار سے کافی مختلف ہے: 'وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں' کی نسبت سے افسانہ نگار 'محرمِ گوش' اور 'طرب آشنائے خروش' کے بیچ خاموش اور فراموش رشتے کو ___ دریافت کرنے میں کامیاب ہوگئی ہیں!!۔۔۔!! ''لذت کی پلیٹ کا آخری ذائقہ'' ایک عجیب افسانہ ہے! انسانی حسیّات کی مہین ترین سطحوں کو Capture کر لینا گواہی دیتا ہے کہ افسانہ نگار کے ہاں احساس کی شدت اور مشاہدے کی درا کی خطرناک حد تک ہمہ وقت ترازو رہتی ہے! اس کا انجام اگرچہ موت کی Absurdity پر ہوتا ہے لیکن ذائقے کی حِس کا سہارا لے کر بشر کو ایک بار تو اصل روپ میں دکھا دیا ہے۔ ''بھیڑیا جاتی'' بظاہر بے ضرر سا تحول (Metamorphosis) ہے لیکن وجود کے اس جزو کو سامنے لاتا ہے، جس کے خلا کو چھپانے کے لیے اخلاقیات کے لامتناہی سلاسل خلق کرنے پڑے لیکن یہ ڈریپری یا چلمن کچھ بھی چھپا نہ سکی۔ افسانہ نگار نے منظر نامے اور احساسات کو مرد کی آنکھ سے دیکھ/دکھا کر قاری کو پریشان کر دیا ہے! ''عادت سیڑھی'' پڑھ کر بیدی کی بابت سید وقار عظیم کی بات یاد آ گئی: ''۔۔۔ایک دوسری چیز جس کا بیدی کے کرداروں پر گہرا اثر ہے، وہ عادات کی پختگی ہے۔ عادت راسخ ہو جاتی ہے تو نفسیاتی اصلاحوں کو بھی ان کے سامنے سپر ڈالنی پڑتی ہے۔'' سیمیں کرن کا مذکورہ افسانہ اعادے کی ایسی خو کو بیانیے میں ڈھالتا ہے جس سے کوئی 'مردِ حر' بھی مستثنا نہیں ہوگا! سائیکالوجی والے Compulsive Disorder کہہ کر ایک طرف ہو جائیں گے لیکن بعنوانِ مداومت ہم جو خوگرِ کارِ خیر ہیں، وہ کدھر جائیں؟ ''استغفراللہ'' جس 'نظریۂ ضرورت' کے تحت کایا کلپ کو شعار بنائے ہوئے ہے، اس کے نیوکلیس 'ارمغان حسین' کے توسط سے رائج الوقت 'مابعدالطبیعات' کو بڑی جرأت سے بیان کر کے افسانہ نگار نے ان گنت علامتی کرداروں کو دھوپ میں لا کھڑا کیا ہے۔ ''شجرِ ممنوعہ کے تین پتے'' (ٹائٹل سٹوری) مصنفہ کا شاہکار ہے جو انسانی جبلت سے جڑے ایک بڑے سوال کو تخلیقی Narrative میں منقلب کر دیتا ہے اور بغور دیکھا جائے تو خیر و شر کے گمبھیر قضیے سے پھوٹتے ہوئے کئی شاخسانے اس کے ہمرکاب ہیں۔۔۔ جن کے جواب ایسا بھید ہیں؛ 'اینہا ہمہ راز است کہ معلومِ عوام است'! لیکن عوام کو یہ اذن حاصل نہیں کہ ان کے Direct Solution کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لیں ___ معلمین و متکلمین جن گرہوں کی مدد سے گتھی الجھا گئے ہیں، اسے اسی طرح نہ صرف وصول کریں بلکہ قبول بھی کریں! اس افسانے کا راوی آخر میں کہتا ہے:

''یہ اثرِ خمار روح کو چڑھا تھا یا پھر بدن کو؟ کیا روح بھی غلیظ ہوتی ہے؟ کیا روحیں شیطان و رحمان کی نمائندہ نہیں ہوتی ہیں؟ یہ حقیقت کبھی نہیں سمجھ پاؤں گی اور میں نے اپنی اس تحریر کو یونہی نامکمل/ادھورا چھوڑ دیا!''

تکنیکی لحاظ سے افسانے کا حُسن بلاشبہ اس استفہامیہ انجام سے کہیں جاذب ہو گیا ہے کہ بہرحال یہ فکشن ہے، 'جواب مضمون' نہیں ___ لیکن Content کو جس Subject سے ہم رشتگی میں پرویا گیا ہے، اس پس منظر میں گفتگو کے در ضرور وا ہو سکتے ہیں کہ Evil کیا خلقی طور پر Evil ہوتا ہے؟ 'تاری ہلاکو' کا کردار 'حجاج بن یوسف' کا پرتو ہے (اگرچہ موخرالذکر کو اپنی 'صلاحیتوں' کے اظہار کے وسیع پیمانے پر 'عظیم الشان' مواقع 'نصیب' ہوئے) لیکن وہ قاہر جیسا ہے ویسا اپنے ظاہر سے نظر بھی آتا ہے وگرنہ اس سے بڑھ کر بھی سفاک موجود ہیں جو اپنے وجود کے فولاد پر مخمل لپیٹے ہوئے ہیں! مصنفہ نے فی الاصل بین السطور یہ سوال چھوڑا ہے کہ کبھی ہمیں سوالوں کو Exclusive صورت میں دیکھنا چاہیے کہ ہماری نظر صدیوں سے ان سوالوں کو دیے گئے جوابوں کے پیراڈائم میں دیکھنے کی عادی بنا دی گئی ہے ___ لیکن یہ افسانہ اپنی بنت، تکنیک، موضوع۔۔۔غرض ہر اعتبار سے بہترین فن پارہ ہے!! اسی طرح سیمیں کرن کے ایک اور نمائندہ افسانے: ''مربعوں کی دائرہ کہانی'' کا الگ سے تذکرہ ضروری ہے ___ ممتاز شیریں نے کرشن چندر پر بات کرتے ہوئے کہا تھا: ___ ''وہ کسی چیز کا اثر فوری لیکن وقتی طور پر قبول کرتے ہیں۔ فوری اظہار بھی ان کے لیے آسان ہے چناں چہ کرشن چندر سے یہ شاذ ہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی چیز کو تخلیق کرتے ہوئے اس کرب سے گزرے ہوں جسے Creative agony کہتے ہیں ___!''

___!! 'تخلیقی تجربے کی باز آفرینی' بڑے الفاظ ہیں؛ سو اس باب میں ادعا کی گنجائش نہیں؛ لیکن گمان کہتا ہے کہ سیمیں کرن مذکورہ افسانے کا حصول خاصے گہرے تخلیقی کرب کے بعد اپنے لیے ممکن بنا پائی ہوں گی! ممکن ہے یہ ایک نشست کے دورانیے کا رشحہ و ماحاصل نہ ہو!! واقعہ یہ ہے۔ ''مربعوں کی دائرہ کہانی'' کی خواندگی کے بعد مجھے یہ احساس اپنے حصار میں لے رہا ہے کہ افسانہ نگار کے قلم سے جس خاص افسانے نے قرطاس پر منتقل ہونا ہوتا ہے ___ وہ ان سے ہو گیا ہے ___ اس افسانے کے حوالے سے کہنا یہ بھی ہے کہ قرات سے پہلے ہی 'بوجوہ' ذہن بن گیا تھا کہ اس کا عمومی ابلاغ نہیں ہوا ___ سو دھیان سے ___ مرتکز ہو کر مطالعہ کرنا ہے ___ لیکن شاید چوکنا ہونے کی ایسی احتیاج نہ تھی ___ عین ممکن ہے کہ اس ہائی تھیم تک میری اب بھی رسائی نہ ہو پائی ہو ___ لیکن گمان ہے کہ اپنی سطح تک مجھ سے یہ کہانی وصول ہوگئی ہے ___

سیمیں کرن کا یہ افسانہ پڑھ کر ایک تو اس کی یکسر مختلف تکنیک کی تحسین پر دل ترنت آمادہ ہے کہ روایتی پلاٹ کو منہدم کر کے ارتباط کو جادوئی لیول پر قائم کرنے کا چمتکار دکھایا گیا ہے اور مزے کی بات! یہ سراغ نہیں ملتا کہ یہ فریم کرافٹسمین شپ کے ذریعے وجود میں لایا گیا ہے ___ ایسا لگتا ہے افسانہ اپنے ساتھ اس کی ہیئت لے کر آیا ہے ___ باقی رہا مواد کی مناسبت سے اسے تانیثیت کے ساتھ ہی بریکٹ کرنے کا ایشو، تو فی الوقت اس پر راقم کا خیال تائید پر تیار نہیں ___ اس کا موضوع مرتفع ہے ___ باوجود یہ کہ راوی کا بیان آغاز میں 'بھٹکاتا' بھی ہے اور وہ قوس انجام کی قوس سے متصل ہو کر جو دائرہ بناتی ہے وہ اسی طرف ذہن کو لے جاتی ہے ___ لیکن اس کے باوصف اسے محدود نہیں کیا جا

کتا کہ یہ ان چند افسانوں میں سے ایک ہے جو متعدد جہتوں پر محیط ہے___ یہاں پیراڈوکسی کا ہنر فنکاری سے آزمایا گیا ہے___ جیومیٹری کی متضاد شکلوں کو ایک وحدت کی پیشکار کر کے اس کی مضبوط اساس اٹھائی گئی ہے___ اور وہی آگے چل کر مابعدالطبیعات کے مرغوب مضمون 'کثرت و وحدت' سے انسلاک قائم کرتی ہے___ اگر یہ ڈسکورس فعال نہ ہوتا تو اس کی مرکزی سطر کا مفہوم بے مغز ہو کر رہ جاتا: ''خدا کی دانش و مشیت سب سے زیادہ مخفی ہے___!!'' اب اگر افسانہ نگار تعین کے ریاضیاتی جادے کا مسافر ہوتا تو اس کا کارنامہ قابل ذکر نہ رہتا کہ___ حقیقت کو ایک خانے سے دوسرے خانے میں منتقل کر دینا واقعی کوئی کارنامہ نہیں___ حقیقت کا یہ رخ بھی اگرچہ حتمی نہیں لیکن سر فراز ضرور ہے کہ مظروف ظرف کے مطابق عارضی صورت اختیار کر لیتا ہے___ اور غالباً یہی وہ مقام ہے جب مبینہ اصول کے مطابق حقیقت واقعیت کے قالب کی جانب گامزن دکھائی دیتی ہے___ اب رہا جینڈر کا قضیہ تو اس کی حیثیت ہی کچھ نہیں رہ گئی___ حیاتیاتی سائنس کے کاشف اس تحدید کے مدار کو مسمار کر کے بہت آگے نکل گئے ہیں___ اور سماجی تناظر تو مقامیت کا بڑا ہی بھلا مانس ترجمان ٹھہرا___ افسانہ نگار اس آنکھ کو قاری کی آنکھ بنانے کی متمنی ہے جو پس تصویر صداقت تک پہنچ کے لیے بصیرت کا اہتمام کر سکے___ کہ چشم انسانی سر تصویر پر صدیوں سے رکی ہوئی ہے___ اسی لیے تو معبر کو عین حیرت جادوگر کہہ کر اپنی مرعوبیت کا بار بار اظہار کرتی ہے___ جب شیخ فریدالدین عطارؒ کو تاتاری قتل کرنے لگا تو وہ نہایت اطمینان سے بولے___ 'اچھا تو اب اس روپ میں آ گئے ہو___!؟! سو، ہر بہروپ میں روپ موجود ہوتا ہے اور افسانہ نگار کی اصل دلچسپی کا محور روپ نہیں بہروپ ہوتا ہے کہ کلا روپ میں نہیں بہروپ میں ہے!!

آخر میں جو کردار ''اُدھر'' کا فلائنگ وزٹ کر کے جس نوعیت کا بیان دیتا ہے___ واضح رہے اس کے جملہ علائق بار دگر اسی جہان کی نمائندگی کرتے ہیں___

ہاں! اس افسانے کی یہ خوبی اپنی جگہ مسلم ہے کہ میٹا فزکس سے منسلک موضوع کے باوجود ہماری زمینی حقیقت کی کئی اکناف سے مربوط بھی ہے___ یوں اس کی ماورائیت 'کسی اور ہی عالم' کی قرار دے کر جان نہیں چھڑائی جا سکتی___ وجودی کرب کے ارضی شاخسانے بھی اس میں تام جھام سے موثر ہیں۔

ایک اعلا کہانی آج وہی ہے جس میں ماجرا سیدھی لکیر میں سفر نہ کرے___ اور اگر 'سیدھی لکیر' کو وقت کے 'صراطِ مستقیم' کی لحاتی تاویل میں پناہ دے دی جائے تو ہمیں ماضی، حال اور مستقبل کے اجزا زیادہ سے زیادہ زماں کی رائج الوقت تقسیم سے بلند کر دیتے ہیں جب کہ زماں کی تفہیم کے لیے ایک اور تناظر بھی مہیا کیا گیا ہے: ''کیا وقت صرف وہی ہے جو حال کے راستے سے، ماضی سے مستقبل میں لحہ لحہ بہتا رہتا ہے؟ یقیناً، معروف معنوں میں یہی وقت ہے۔ اسی کو ماپا جاتا ہے۔۔۔ اسی وقت کے ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک کے دورانیے میں کچھ ہونے کو واقعے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔۔۔ (لیکن) فکشن کے باب میں Event اور وقت کے اس خاص رشتے میں رخنے پڑ جاتے ہیں یا پڑ سکتے ہیں۔۔۔ کہانی وقت کی دیوار سے ادھر جست لگا دیتی ہے جہاں طبعی زندگی کے سارے جواز ہکا بکا رہ جاتے ہیں اور ایک نیا معنیاتی اور حسیاتی نظام قائم ہو جاتا ہے۔۔۔ جہاں جہاں واقعہ وقت کو پچھاڑ دیتا ہے وہاں وہاں یہ متعین سمتوں کو چیر پھاڑ کر ان کے اندر سے فکشن کے نئے ابعاد اور وسعتیں نکال لیتا ہے۔'' (محمد حمید شاہد/ اردو افسانہ: صورت و معنیٰ) ایک پہلو تو: 'مربعوں کی دائرہ کہانی' سے ضرور ابھرتا ہے کہ افسانہ نگار نے وقت کے مروج پیمانے کو توڑا ہے___ ایک بار نہیں بار بار___ اور صرف بالائی سطح پر نہیں بلکہ زیریں سطحوں پر بھی؛ پھر ساکت تصویر جو وقت کے سیال تصور کی عارضی طور پر نفی کرتی ہے اور ایک منجمد آن کو حسی پیکر کی صورت سامنے بھی لا کر دکھا دیتی ہے___ لیکن افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر تصویر کے سکوت کو تحرک میں تبدیل کر دیتی ہیں___ اب یہ تحرک پھر خیال کے مقطعے سے جڑت رکھتا ہے، کسی مستند تقویم سے نہیں ___ اس پس منظر میں کسی تعبیر کو جامد (Static) نہیں کہا جا سکتا___ ایک عجیب توانائیت (Dynamism) کا ظہور ہے جو روح کو فشار سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ سیمیں کرن کے اس افسانے کو شروع میں غیر معمولی اس لیے کہا تھا کہ یہاں زماں اپنے حسبِ حال مکاں کا اہتمام کرتا ہے، شاید اسے اپنی بقا کے چیلنج کا سامنا ہے___ اگر اس مکاں میں زماں کی ابعاد کا ایک منظر ان تین اکناف (Three Dimensions) پر مشتمل فرض کر لیا جائے جس کی تصریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''تینوں بعد کے معنی ہیں لمبائی، چوڑائی اور گہرائی یعنی وہ بات جو بڑے سے بڑے کینوس پر تصویر میں بھی پیدا نہیں ہو سکتی، ایک ایسی تراشیدہ شبیہ کے ذریعے ظاہر ہو سکتی ہے جسے کئی زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔''

تو ایک بار پھر تائید ہوتی نظر آتی ہے کہ تصویر سے تعبیر تک کا سفر فی الاصل یہی 'مربعوں کی دائرہ کہانی' ہے کیونکہ جو مصور ہوا ہے، وہ تصویر سے پہلے بھی اپنا ایک وجود رکھتا تھا___ تخیلی وجود___ پھر اسے ایک محسوس پڑاؤ کا وقفہ میسر آیا___ جب اسے تفسیر (Interpretation) بننا نصیب ہوا تو وہ ایک نئی صورت تھی___ تصویر ہونے والی سے جدا___ یہ سارے چوکور ٹکڑے کیا ہیں؟ یہی مربعے ہیں؛ ہمیں ان میں سے جو مل جاتا ہے، اسے حتمی یقین کرنے کا التباس مادیت کی محدودیت میں دھکیل دیتا ہے___ یوں 'عالم دوبارہ نیست' کا سرور مدہوش کر دیتا ہے، افسانہ نگار نے بس اسی نشے کو ترشی سے اتارا ہے اور بند دائرے (Closed Circle) کی بجائے حرکت پذیر (Spiral Circle) کا وسیع مدار (Orbit) کھینچ کر تسلسل کی معنویت شعور میں منتقل کی ہے___ چونکہ وہ رمز نگاری (Encryption) سے دستبردار نہیں ہوئیں اس لیے انھوں نے ایک گمشدہ شیڈ کو اپنی تخلیقی توانائی سے دریافت کرنے کے بعد پیرایے میں ایسے شامل کیا ہے کہ عمیق فلاسفی کو 'سچ مچ کا افسانہ' بنا دیا ہے___ ایسا افسانہ جو کبھی سمجھائی ''سچائی'' سے اونچے رتبے کی تخلیق ہے۔

باقی صفحہ ۱۰۹ پر ملاحظہ کیجیے

قدرت کی صناعی کا امین

فاری شا
(راولپنڈی)

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ترقی یافتہ دنیا میں جب کوئی پڑھا لکھا آدمی نئی بات کرتا ہے تو علمی اور ادبی حلقے اُس بات کو فوری اُچک لیتے ہیں۔ تیسری دنیا میں اگر کوئی شخص نئی بات کرتا ہے تو اُس شخص کو ہی اُچک لیا جاتا ہے۔

اسٹیفن ہاکنگ تمام عمر نئی بات، نئے نظریات اور نئی تھیوریز پیش کرتا رہا۔ ابتدا میں لوگ اُس کی بات کو ہوا میں اُڑا کر اپنے اپنے رنگ میں اسٹیفن ہاکنگ کو تنقید کا نشانہ بناتے۔ کوئی اُس کی جسمانی کیفیت کا مضحکہ اڑاتا، کوئی اُسے ناسا کا ایجنٹ بتلاتا، کوئی یہودی امریکہ یا روس سے اُس کے ڈانڈے ملاتا وقت گزرنے کے ساتھ اسٹیفن ہاکنگ کی باتیں نہ صرف توجہ سے سُنی گئی بلکہ اُس پر ایک وسیع حلقے نے تحقیق و جستجو کرتے ہوئے مہر تصدیق ثبت کر دی۔

اسٹیفن ہاکنگ کا شجرہ تو دستیاب نہیں البتہ خاندانی پس منظر کچھ اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔

اسٹیفن ہاکنگ کے والد نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے طب اور والدہ نے اقتصادیات، سیاسیات اور فلسفے میں ڈگریاں حاصل کیں۔ ابتداء میں ہاکنگ کو لندن کے بائرن سکول میں داخل کیا گیا۔ اُس وقت ہاکنگ آٹھ برس کے تھے۔ ہاکنگ کے والد کو ''نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار میڈیکل ریسرچ'' میں پیراسایئکالوجی کے شعبے کی سربراہی ملی تو اُن کا خاندان وہاں سے سینٹ البانز، ہرٹوفرشائر منتقل ہوگیا۔ ہاکنگ کو بھی سینٹ البانز ہائی سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اگلے برس انہیں ہرٹوفرشائر کے ایک گاؤں واقع ریڈلٹ سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں گیارہ سال کی عمر میں ہاکنگ نے سینٹ البانز سے الیون پلس کا امتحان پاس کیا۔

ہاکنگ کو بچپن سے کھیل کود کا شوق تھا وہ سائیکل چلانا، فٹ بال کھیلنا نہ بھولتے۔ ہاکنگ کو دوڑ لگانے کا بھی شوق تھا۔ والد کا اسرار تھا کہ ہاکنگ برطانیہ کے مشہور ویسٹ منسٹر سکول سے اسکالرشپ حاصل کریں مگر امتحان کے دن اسٹیفن ہاکنگ کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اسٹیفن ہاکنگ مالی دشواری کے سبب بدستور سینٹ البانز میں ہی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس عرصے میں اسٹیفن ہاکنگ کو کئی دوستوں کی رفاقت میسر آئی جو نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں کافی متحرک تھے۔

دوستوں کا یہ گروپ مختلف سائنسی ایجادات سے لے کر مذہبی مباحث پر جستجو میں لگا رہتا۔ اس دوران ہاکنگ سائنس، مذہب اور فطرت سے متعلق اٹھائے گئے بنیادی سوالات سے نبرد آزما رہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ جستجو، امکانات اور آفاقی وسعتوں کی کی تلاش پر طبیعت مائل ہو رہی تھی۔ ۱۹۵۸ء سے اسٹیفن ہاکنگ نے نئی دریافت کی پیش قدمی کی۔ انہوں نے اپنے زرخیز اور خلاق ذہن کی بدولت ریاضی کے استاد کی معاونت سے Recycling Process یا اشیاء کو دوبارہ کارآمد بنانے کے طریقے کو بروئے کار لا کر پرانی گھڑیوں کے مختلف ٹکڑے، پرانے ٹیلی فون سوئچ بورڈز اور چند ناکارہ اشیاء کی مدد سے ایک کمپیوٹر تیار کیا۔

۱۹۵۹ء میں ہاکنگ کو اسکالرشپ مل گئی۔ انہوں نے ایک بار پھر مختلف کھیلوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ یونیورسٹی، کالج، بورڈ، کلب کے رکن کے طور پر ہاکنگ کافی سرگرم رہے۔ ازاں بعد ''یونیورسٹی آف کیمبرج'' میں نظریاتی طبیعیات اور علم کونیات (Cosmology) کے مضامین کے ساتھ داخلے کا فیصلہ کیا جس کی شرط فرسٹ کلاس آنرز ڈگری تھی۔

ان دنوں ہاکنگ پر کبھی کبھی بددلی یا کسل مندی کا دورہ بھی پڑتا تھا۔ ایسی صورت میں اُن کا کسی کام میں دل نہ لگتا۔ یونیورسٹی آف کیمبرج کے امتحان کی تیاری بھی اسی بددلی کے دوران کی۔ امتحان سے ایک رات پہلے وہ بہت اطمینان سے سوتے رہے۔ نتیجہ مطلوبہ معیار کا نہ آیا۔ زبانی امتحان میں ہاکنگ کو اندازہ تھا کہ اُن کی سستی اور کاہلی ضرور آڑے آئے گی۔ ممتحن نے ہاکنگ سے اُن کے مستقبل کے عزائم دریافت کیے تو ہاکنگ نے کہا ''اگر آپ مجھے فرسٹ کلاس سے نوازیں گے تو میں کیمبرج کا رُخ کروں گا، سیکنڈ کلاس دیں گے تو میں آکسفورڈ کو ہی ترجیح دوں گا۔'' ہاکنگ کا جواب سن کر ممتحن کو اندازہ ہوگیا کہ وہ جس طالب علم سے مخاطب ہیں اُس کی ذہنی سطحیں کافی بلند ہیں۔ بالآخر ہاکنگ ۱۹۶۲ء میں فرسٹ کلاس آنرز کی ڈگری لے کر کیمبرج یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے داخل ہوگئے۔

۱۹۶۳ء میں ایک روز ہاکنگ اچانک سیڑھیوں سے گر گئے۔ انہیں ہسپتال لے جایا گیا جہاں معائنہ کے بعد پتہ چلا کہ ہاکنگ کو (Amyotrophic Lateral Sclerosis) یا ''Motor Neurone'' جیسا خطرناک مرض لاحق ہے جس کے باعث وہ دو برس سے زیادہ زندہ نہ رہ سکیں گے۔

معالجین نے ہاکنگ کو حوصلہ دیتے ہوئے تعلیم جاری رکھنے کی ہدایت کی مگر اب ہاکنگ کے لیے زندگی کڑا امتحان بن گئی تھی، ہاکنگ نے سوچا گھٹ گھٹ کر مرنے سے بہتر ہے کہ بہادری سے اس دنیا کو خدا حافظ کہا جائے۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ہاکنگ کی بیماری پہلے کی نسبت کسی قدر سست روی کا شکار ہوگئی جس پر ڈاکٹر بھی حیران تھے۔ ہاکنگ اپنے سپروائزر ڈینس ولیم کی تحریک پر پی ایچ ڈی کے مقالے کی طرف متوجہ ہوگئے اور اپنے لیکچرز کے ذریعے سائنس کے چند مروّجہ اصولوں کی نفی بھی کی۔ اُن دنوں ماہرین طبیعیات شدّ و مد سے ''بگ بینگ'' اور ''تخلیقِ کائنات'' جیسے موضوعات پر مباحث میں مصروف تھے۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہاکنگ پر بیماری نے پھر حملہ کر دیا۔ سب سے پہلے اُن کے ہاتھوں کی انگلیاں مفلوج ہوئیں، پھر بازو پھر جسم کا اوپری حصہ، پھر نچلا حصہ مفلوج ہوا اور وہ بولنے سے بھی محروم ہوگئے۔ ۶۰ کی دہائی کے آخر تک

اُن کی زندگی وہیل چیئر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ابھی ہاکنگ ان تمام بیماریوں سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ ایک دن اُن کی گردن دائیں جانب ڈھلک گئی۔ ڈاکٹروں کی لاکھ کوشش اور علاج کے بعد یہ گردن کبھی سیدھی نہ ہو سکی۔ اب ہاکنگ سہارے کے ساتھ چلتے اور اُن کی گفتگو بھی مہمل ہو گئی تھی مگر ہاکنگ نے اس جسمانی معذروی کے آگے ہتھیار ڈالنے کے بجائے آفاق کی وسعتوں اور افلاک کی گردشوں کو اپنے مشاہدے کا موضوع بنا لیا۔

۱۹۷۰ء میں ہاکنگ کی تحقیق کا نچوڑ سامنے آیا اور سائنس کی دنیا نے ہاکنگ کو سر آنکھوں پر بٹھا لیا۔ اس کے بعد دنیا کی اعلیٰ سائنسی درسگاہوں میں اسٹیفن ہاکنگ کو بطور پروفیسر مدعو کیا جاتا اور وہیل چیئر کو چلنے پھرنے اور ایک مشین کے ذریعے بول چال کو ذریعہ بنانے والے اسٹیفن ہاکنگ کو اُن کی زندگی میں ہی دیومالائی شخصیت قرار دے دیا گیا۔

خواہش تو یہ ہے کہ ہم اپنے قارئین کو دو صدیوں کے نابغہ روزگار فلسفی، سائنسدان اور ماہر طبیعیات کی زندگی کے مزید حالات و واقعات اور جدوجہد سے تفصیلی طور پر باخبر کریں مگر یہ کام اس قدر آسان نہیں جس قدر ہم نے اسے بیان کر دیا ہے۔ سو اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے کسی اور وقت کا انتخاب کرتے ہوئے ہم آپ کو اختصار کے ساتھ اسٹیفن ہاکنگ کی شخصیت، فن اور کارناموں سے اس قدر باخبر ضرور کریں گے کہ آپ کے ذہن میں ہاکنگ کی نسبت واضح تصور قائم ہو جائے۔

۱۔ اسٹیفن ہاکنگ سائنسدان ہونے کے ساتھ مختلف سیاسی تحریکوں میں دلچسپی کے ساتھ معاونت کرتے رہے۔

۲۔ ہاکنگ نے ہمیشہ اپنے خیالات کا اظہار کسی ڈر خوف کے بغیر بلند آہنگی سے کیا۔

۳۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے آخیر میں ویت نام کے خلاف امریکی جارحیت کی ڈٹ کر مخالفت بھی کی اور کئی عوامی احتجاج میں شریک ہو کر اپنے تحفظات کا برملا اظہار کیا۔

۴۔ اسرائیلی حکومت کے مذموم عزائم کے خلاف بھی ہاکنگ نے ہمیشہ آواز بلند کی اور فلسطین کے مقبوضہ علاقوں کی مصنوعات کے بائیکاٹ پر عالمی پیمانے پر مخالفانہ تحریک چلائی۔

۵۔ یروشلم میں اسرائیل کے مستقبل پر ہونے والی کانفرنس میں یہ کہہ کر شرکت سے انکار کر دیا کہ جب تک اسرائیل اپنے توسیع عزائم سے باز نہیں آتا میں ایسی کسی کانفرنس میں شرکت نہیں کر سکتا۔

۶۔ ہاکنگ نے اپنے بائیکاٹ کی وجہ فلسطینی دانشوروں کی رائے کا احترام بتلایا جس کے باعث صہیونی حکومت کو شرمندگی اٹھانا پڑی۔

۷۔ اسرائیلی حکام نے اعتراف کیا کہ اسٹیفن ہاکنگ عالمی پائے کے وہ پہلے دانشور سائنس دان ہیں جنھوں نے اس طرح کی کانفرنس کا بائیکاٹ کیا۔

۸۔ اسٹیفن کے اس اقدام کی اسرائیل میں سخت الفاظ میں نہ صرف مذمت کی گئی بلکہ لمبے عرصہ تک اسرائیل کے مؤقر روزناموں اور سوشل میڈیا نے ہاکنگ کے خلاف زوردار مہم چلائی اور ریکیک حملے کرتے ہوئے یہودیوں کا دشمن گردانا۔

۹۔ ۲۰۰۸ء میں عراق کے خلاف امریکی جارحیت پر بڑی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے ہاکنگ نے امریکہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تم یہ جنگ جھوٹ کے مفروضے پر لڑ رہے ہو جو عراق کو تباہ کرنے کی سازش ہے اور میں ہر ہر قدم پر تمہارے اس اقدام کی مذمت کرتا رہوں گا۔''

۱۰۔ ۲۰۰۹ء میں اسرائیل نے غزہ پر ہولناک بمباری کی تو اسٹیفن ہاکنگ نے اسرائیلی جارحیت کی سخت الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے کہا ''حماس کو فلسطین کی منتخب قیادت تسلیم کیا جائے۔''

۱۱۔ ۲۰۱۴ء میں اسٹیفن ہاکنگ نے شام کی خانہ جنگی اور اس سے ہونے والی خوفناک تباہی پر شامی بچوں کے لیے فنڈز اکٹھا کرنے کی مہم سے خطاب کرتے ہوئے اپنے دکھ کا اظہار ان الفاظ میں کیا ''شام میں ہونے والی بے پناہ قتل و غارت گری کو دنیا جس بے رُخی سے دیکھ رہی ہے کیا اُس کے بعد بھی کوئی ایک فرد خود کو مہذب کہلا سکتا ہے۔''

۱۲۔ ۲۰۱۷ء میں فلسطینی سائنسدانوں کی امداد کے لیے لاکھوں لوگوں کو آمادہ کرنے کے لیے ایک پیغام جاری کیا کہ فلسطین کے سائنسدانوں کی دل کھول کر مدد کی جائے جس سے فلسطین کے نوجوانوں کے لیے دوسرا ایڈوانس فزک سکول قائم کیا جا سکے۔

یہ تھے اسٹیفن ہاکنگ کی شخصیت کے وہ چند پہلو جو اُس بے جان جسم کے بیدار دل میں اُمڈ رہے تھے۔ وہ انسان اور انسانیت کا درد بلا امتیاز محسوس کرتا تھا اور تحقیق و جستجو کے ساتھ انسان کی بھلائی کے لیے عملی طور پر بہت کچھ کرنے کا خواہاں تھا۔

اسٹیفن ہاکنگ کے دماغ اور ایک آنکھ کے پٹھے کے سوا جسم کا کوئی عضو فعال نہ ہونے کے باوجود جو کارنامے اُس نے انجام دیے وہ موجودہ دور کے انسانوں کے علاوہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی عظیم تحفے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

ملاحظہ کیجیے جسمانی طور پر اس کمزور اور ناتواں شخص نے سائنس کی دنیا میں کس قدر حیرت آمیز اور مفید کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں:

۱۔ اسٹیفن ہاکنگ نے آئن سٹائن کے نظریہ اضافت اور علم طبیعیات میں کیے گئے انقلابی اضافوں کی مدد سے بلیک ہولز کا پتہ لگایا۔

۲۔ کائنات کی ذہنی جستجو سے جسمانی حدود کو شکست دیتے ہوئے کائنات کے بارے مافوق الفطرت واہموں کو ہمیشہ کے لیے پاٹ دیا۔

۳۔ اسٹیفن ہاکنگ نے وہی سوالات اٹھائے جن کے جوابات کی تلاش میں سائنس دان اور فلسفی صدیوں سرگرداں رہے۔ مثلاً

i یہ کائنات کیسے وجود میں آئی؟

ii کیا ہم اس کائنات میں تنہا ہیں؟

iii کیا زندگی میں سب کچھ طے شدہ ہے؟

iv انسان کتنا مجبور، کتنا خودمختار ہے؟

v وقت کی شروعات کب ہوئی؟

vi ازل کیا ہے ابد کیا ہے؟

vii زندگی کب وجود میں آئی؟

viii کیا کسی اور سیارے پر ہم سے زیادہ ذہین مخلوق بستی ہے؟

ix کیا ہماری زندگی میں ہر چیز سائنس کے قوانین کے تابع ہے؟

x کوئی خارجی قوت ہماری زندگی میں دخل اندازی کرتی ہے؟

xi اگر یہ کائنات پھیل رہی ہے تو کیا کھربوں سال سے اس کا وجود قائم ہے؟

xii کیا یہ کائنات بالآخر تباہ ہوجائے گی؟

xiii ہماری سرزمین پر اشیا کا باہمی عمل نہ صرف پیچیدہ بلکہ بے شمار اثرات کا تابع کیوں ہے؟

xiv ہم سے مختلف قومیں اور تہذیبیں اس ناقابلِ بیان گھمبیرتا کی نشاندہی کرنے میں ناکام کیوں رہیں؟

xv ''ایم تھیوری'' جلد یا بدیر کائنات کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھا پائے گی؟

اس کے بعد اسٹیفن ہاکنگ جیسے دُور اندیش فلسفی اور سائنسدان بنی نوع انسان کی زندگی کی بابت کس طرح کے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے اُن سے بچنے کی تدبیر بھی بتلا رہے ہیں۔

☆ بڑھتی ہوئی آبادی، بے پناہ کثافت کے سبب دنیا کی تباہی یقینی لگتی ہے؟

☆ مصنوعی ذہانت بھی انسانوں اور دنیا کی تباہی میں اہم کردار ادا کرتی دکھائی دیتی ہے۔؟

☆ انہی خدشات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسٹیفن ہاکنگ نسلِ انسانی کی بقا کے لیے کسی نزدیکی سیارے پر منتقلی کا مشورہ دیتے ہیں۔

اب کچھ نظر اسٹیفن ہاکنگ کی ذاتی زندگی پر ڈالنا بھی ضروری ہے:

نام: اسٹیفن ولیم ہاکنگ

پیدائش: ۸۔جنوری ۱۹۴۲ء (آکسفورڈ، انگلینڈ)

والدین: فرنک ہاکنگ (۱۹۰۵۔۱۹۸۵)
آئسوبیل ایلین ہاکنگ (۱۹۱۵۔۲۰۱۳)

تعلیم: سینٹ البان ہائی سکول ہرٹ فورڈ شائر
بی۔اے (آکسفورڈ یونیورسٹی)
ایم۔اے، پی ایچ ڈی (کیمبرج یونیورسٹی)

مقالہ: پراپرٹیز آف ایکسپینڈنگ یونیورس
(Properties of Expanding Universes)

شادی: جینی وائلڈ (۱۹۶۵۔۱۹۹۵)
ایلائن میسن (۱۹۹۵۔۲۰۰۶)

اولاد: تین بچے
لوسی ہاکنگ، رابرٹ ہاکنگ، ٹم ہاکنگ

اعزازات:

۱۔ ایڈمز پرائز (۱۹۶۶ء)
۲۔ ایڈنگٹن میڈل (۱۹۷۵ء)
۳۔ میکسویل میڈل اینڈ پرائز (۱۹۷۶ء)
۴۔ ہنی مین پرائز (۱۹۷۶ء)
۵۔ ہگز میڈل (۱۹۷۶ء)
۶۔ البرٹ آئین سٹائن ایوارڈ (۱۹۷۸ء)
۷۔ راس گولڈ میڈل (۱۹۸۵ء)
۸۔ ڈیرک میڈل (۱۹۸۷ء)
۹۔ وولف پرائز (۱۹۸۸ء)
۱۰۔ پرنس آف آسٹریس ایوارڈ (۱۹۸۹ء)
۱۱۔ اینڈریو جرمن ایوراڈ (۱۹۹۸ء)
۱۲۔ ٹیلر پرائز اینڈ لیکچر شپ (۱۹۹۹ء)
۱۳۔ لیلن فیلڈ پرائز (۱۹۹۹ء)
۱۴۔ البرٹ میڈل (۱۹۹۹ء)
۱۵۔ کوپلے میڈل (۲۰۰۶ء)
۱۶۔ پریذیڈینشل میڈل (۲۰۰۹ء)
۱۷۔ بریک تھرو پرائز برائے فنڈامینٹل فزکس (۲۰۱۲ء)
۱۸۔ بی بی وی اے فاؤنڈیشن فرنٹیئر آف نالج ایوارڈ (۲۰۱۵ء)

اسٹیفن ہاکنگ نے رچرڈ برٹین کے تعاون سے مورخہ ۲۶۔اپریل ۲۰۰۷ء کو ایک اسپیشل فلائٹ بوئنگ 200-727 جٹ کے ذریعہ فضا کا معائنہ کیا۔ اس خاص فلائیٹ کو زیرو جی کارپوریشن آف فلوریڈا آپریٹ کر رہی تھی۔ اس سفر میں ہاکنگ نے فضا میں وزن سے متعلق تجربات کو ان الفاظ میں بیان کیا۔

It was described as a successful test to see if he could withstand the g-forces involved in space flight. At the time, the date of Hawking's trip to space was projected to be as early as 2009, but commercial flights to space did not commence before his death.

قریب سو برس پہلے شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ فرما گئے ہیں:

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

قریب پچپن برس موذی اور جان لیوا بیماری سے زور آزما رہنے کے بعد ہمارے عصر کا نابغہ روزگار فلاسفر، سائنس دان اور ماہر طبیعیات اسٹیفن ولیم ہاکنگ مورخہ ۱۴۔مارچ ۲۰۱۸ء کو چھتر برس کی عمر میں آئن سٹائن کے یوم پیدائش پر اس دارِ فانی کو خدا حافظ کہہ گیا۔

اسٹیفن ہاکنگ کی تصانیف کی تعداد پندرہ ہے۔ان کی ایک کتاب ''A Brief History of Time'' کئی سالوں تک بیسٹ سیلر بک میں شمار ہوتی رہی۔۲۰۱۴ء میں ''The Theory of Everything'' کے نام سے اسٹیفن ہاکنگ کی زندگی اور کارناموں پر ایک فلم بھی بنائی گئی۔کائنات کے اسرار و رموز، خلائی وسعت، مادّہ، توانائی، تابکاری، روشنی اور اضافت جیسے مشکل موضوعات کو ہاکنگ نے اپنے مطالعہ اور مشاہدے کی روشنی میں جس احسن طریق پر بیان کیا اُس کے اعتراف میں ایک درجن سے زائد اعلیٰ ترین درسگاہوں نے اسٹیفن ہاکنگ کو اعزازی ڈگری عطا کی جس سے ہاکنگ کا نہیں بلکہ اُن درسگاہوں کی عزت و ناموس میں اضافہ ہوا۔

تصانیف:

1۔ My Brief History
2۔ The Grand Design
3۔ A Brief History of Time
4۔ A Briefer History of Time
5۔ Black Holes: The Reith lectures
6۔ George and the Blue Moon
7۔ George and the Unbreakable Code
8۔ George and the Big Bang
9۔ George's Cosmic Treasure Hunt
10۔ George's Secret Key to the Universe
11۔ The Universe in a Nutshell
12۔ Black Holes and Baby Universes
13۔ On the Shoulders of Giants
14۔ The Large Scale Structure of Space-time
15۔ God created the Integers

اسٹیفن ہاکنگ زندگی سے مایوس اور وسائل سے محروم افراد کو مخاطب کر کے اکثر کہتا ''اگر تم کسی حل ہونے والی مشکل (بلیک ہول) میں بھی گرفتار ہو گئے ہو تو امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو کیونکہ باہر نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہوتا ہے۔''

ان کی موت کے حوالے سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے جسدِ خاکی کو دفنانے کے بجائے نذرِ آتش کیا گیا اور ان کی راکھ برطانیہ کے مقدس گرجا گھر واقع ویسٹ منسٹر کے احاطے میں آئزک نیوٹن کی قبر کے ساتھ دفنائی گئی جہاں نظریۂ ارتقاء کے معروف سائنس دان چارلس ڈاون بھی مدفون ہیں۔

تدفین کا عمل ''Thanks Giving'' کے تہوار کے دن اختتام پذیر ہوا۔

بقیہ: دھوپ عہد کے افسانے

باقی رہا ان دونوں مجموعوں میں نثر کا آہنگ تو پڑھتے ہوئے یہ خیال مسلسل غالب رہا کہ شعریت کے فلیور سے قاری کو کہیں لبھانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے ــــــ اس کے برعکس شعوری سعی کے ساتھ لفظیات کی مدد سے فکشن کی اس ڈائمنشن کو سامنے لایا گیا ہے جو سماجی معاملات کو اپنے عمق کے ساتھ ابھار سکے۔جذباتیت کی آمیزش سے منزہ ایک متین متن اسی طرح سطحِ ورق پر نقش ہوتا ہے۔ہاں! جہاں میٹا ریشنل ڈیٹا کی ترجمانی کا تقاضا تھا وہاں علمیت، اور تفلسف کی کارگزاری سے جملے کو بچایا گیا ہے، میمنہ میسرہ کے گھاؤ نہیں لگنے دیے گئے۔اگر اسلوب کو فی الوقت طرزِ اظہار میں محدود کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ سیمیں کرن کی نثر میں وہ ندرت ہے جو قاری کی آنکھوں کو بے دھیان نہیں ہونے دیتی!! ــــــ !!ایسے منفرد افسانے تخلیق کرنے کے لیے جس آگہی کا ہونا ضروری ہے ــــــ اس سِرّ تک افسانہ نگار کسی سچے لمحے میں پہنچ گئی تھیں کہ تخلیقی ساعت میں ''عقیدے'' سے عارضی جدائی کا دُکھ طوعاً و کرہاً سہہ لیا جائے؛ تاکہ ہر افسانے میں 'جہانِ نَو' کی بنا رکھی جا سکے؛ جو ایک طرف متناقضہ کا اثبات کرے تو دوسری جانب' کی ہول' میں سے سہی قاری کو یہ دکھا سکے کہ تخلیق کار اپنی ذات کو ان گنت پاروں میں منقسم کر کے بھی Indivisible رہتا ہے اور یاد رہے! نثر میں بجز فکشن کے یہ 'معجزہ' کسی اور صنف کو نصیب نہیں ہوا، یوں فکشن رائٹر مذکورہ سہولت سے مستفید ہونے کا Edge تو رکھتا ہے لیکن اپنے وجود کے اجزا کو فضا میں اچھال کر سالم اکائی کی صورت دفعتاً Catch کر لینے کی شعبدہ گری ہما شما سے ہو نہیں پاتی ــــــ سیمیں کرن کے لیے دل صرف اس کارن تالی بجانے پر مجبور ہوا ہے کہ انھوں نے اس کلاکاری کا حیران کن مظاہرہ 'دھوپ عہد' میں کیا ہے!!

۱۷۔اپریل ۲۰۱۸ء

ڈیڈی برائے واکر کنٹری

فرح ناز (راولپنڈی)

ہمارے ابو ۷۔مئی ۱۹۳۸ء کوعزیز الرحمٰن کے ہاں پیدا ہوئے۔ انہوں نے جس خاندان میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی، انکساری اس کا خصوصی وصف اور سادگی اس کا طرز زندگی تھا۔ان کے والد یعنی ہمارے دادا ایک غریب آدمی تھے جن کا گزارا مشکل سے ہوتا تھا۔ہمارے والد اس پر کبھی شرمندہ نہ ہوتے بلکہ فخر سے اس غربت زدہ ماحول کا تذکرہ کرتے جس میں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ابو نے ان تھک محنت سے تعلیم حاصل کی تا کہ نہ صرف اپنے والدین کے لیے نیک نامی کا باعث بنیں بلکہ انہیں سہولیات بھی فراہم کرسکیں۔انہوں نے پہلے اسلامیہ کالج پشاور اور پھر خیبر میڈیکل کالج میں داخلہ لیا جہاں سے آپ نے نہ صرف اچھے نمبر لیے بلکہ پہلی پوزیشن بھی حاصل کی۔اس کے بعد وہ ''ایف آر سی پی'' کے لیے لندن تشریف لے گئے جہاں ڈاکٹر شفیع ان کے بہترین دوست بنے۔ اس کے بعد وہ کینیڈا کے شہر البرٹا (Alberta) منتقل ہو گئے جہاں سے ''ایف آر سی ایس'' کیا۔یہیں ان کی سب سے بڑی صاحبزادی مہناز پیدا ہوئیں۔

کچھ عرصہ کینیڈا میں پریکٹس کرنے کے بعد وہ امریکہ چلے گئے جہاں سے ۱۹۶۳ء میں ''ایف اے سی ایس'' کی ڈگری حاصل کی۔وہ جیسپر (ایلاباما، امریکہ) کے چند اولین سرجنز میں سے ایک تھے۔ان کے مریض ان کی رحمدلی، شرافت اور پیشہ ورانہ اخلاق کی بہت تعریف کرتے تھے۔جیسپر میں آدھے سے زیادہ پولیس والے ان کے مریض تھے اور انہیں ''اعزازی ڈپٹی برائے واکر کنٹری'' کا خطاب بھی دیا گیا۔جیسپر کے میئر نے عزت افزائی کے طور پر انہیں شہر کی چابی بھی پیش کی۔

ابو ہنس مکھ طبیعت کے مالک تھے اور وہ جس کمرے میں بیٹھے ہوتے وہ قہقہوں اور لطیفوں سے گونج اٹھتا۔جونہی وہ مسکراہٹ بکھیرتے اور دل کھول کر ہنستے یوں لگتا جیسے پورا کمرہ جگمگ جگمگ کرنے لگا ہو۔ان کی یہ خاصیت ہم بہن بھائیوں میں سے فرح کے حصے میں آئی ہے۔ابو فرح ناز اور شہناز سے والہانہ محبت کرتے تھے۔مجھے یاد ہے کہ جب وہ ہسپتال سے تھکے ہارے گھر آتے تو ہم ان سے اپنے ساتھ کھیلنے کی فرمائش کرتے اور وہ ذہنی دباؤ اور شدید تھکاوٹ کے باوجود کبھی انکار نہ کرتے۔

انہوں نے ہم بہن بھائیوں کو جو کچھ دیا اس میں سے قیمتی ترین تحفہ علم ہے۔انہوں نے ہمیں قرآن، اخلاقیات اور دوسروں کا درد محسوس کرنا سکھایا۔ انہوں نے ہمیں یہ سکھایا کہ زندگی میں جو بھی اچھے اور برے تجربات ہوں ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔اس لیے کہ وہ ہمیں بہت کچھ سکھا کر جاتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں یہ بھی سکھایا کہ خوراک کا ایک ذرہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔اس سلسلے میں وہ ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مثال دیا کرتے تھے جنہوں نے ہمیشہ رزق کی قدر اور عزت کی، اس کی تعلیم دی اور خود سادہ زندگی بسر کی۔

ابو کو ادب کا اعلیٰ ذوق بھی تھا وہ سائنسی طبی کتابوں کے ساتھ ادب اور شاعری بھی شوق سے پڑھتے تھے اور گاہے بہ گاہے ہلکے پھلکے تنقیدی اور تجزیاتی مضامین بھی تحریر کرتے۔بہت سے دیگر جرائد کے علاوہ چہارسو میں اشاعت کے لیے ارسال کرتے کیونکہ چہارسو اُن کا پسندیدہ جریدہ تھا اور وہ اُس کے مستقل قاری اور مداح تھے۔

۱۹۸۱ء میں ہمارا بھائی عامر پیدا ہوا اور ہمیں وہ لمحہ اچھی طرح یاد ہے جب وہ اسے فخریہ انداز میں اٹھائے ہمارے پاس لائے۔وہ عامر کے بارے میں فکر مند تھے اور کہتے تھے کہ کوئی اسے ڈسٹرب نہ کرے اور نہ اس کے قریب جائے اس لیے کہ وہ دل میں ایک ہلکے نقص کے ساتھ پیدا ہوا تھا۔مہناز کو یہ بھی یاد ہے کہ وہ کس طرح رو رو کر اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے اس کی صحت یابی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مہناز، فرح ناز اور شہناز کی شادیاں ہو گئیں جس پر وہ کہا کرتے کہ ''میں نے اپنے دل کے ٹکڑے دے دیئے ہیں'' جب ان کے نواسے نواسیاں ہوئیں تو بہت خوش ہوئے اور ہمیشہ ان پر اپنی محبتیں نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے۔مہناز کے دو بیٹے جبکہ فرح ناز اور شہناز کی دو دو بیٹیاں ہیں۔ہم میں سے کوئی جب ان سے ملنے کے لیے آنے کی بات کرتا تو وہ ہنستے ہوئے کہتے کہ ''اگر بچوں کو ساتھ نہ لائیں تو میں آپ سے نہیں ملوں گا۔''

پھر ایک وقت آیا جب انہوں نے ریٹائرمنٹ لینے اور پاکستان واپسی کا فیصلہ کیا۔وہ ایک سچے محبِ وطن تھے اور کہا کرتے تھے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ دفن ہونا پسند کریں گے۔یوں وہ ۲۰۰۶ء میں پشاور آ گئے۔ان کا بھانجا شکیب ان سے اکثر ملنے آتا اور گھنٹوں ان کے ساتھ رہتا۔ہماری بہن فرح ناز اور ان کی بیٹیاں کشمالہ اور پلوشہ ان سے ملنے کو بے تاب رہتیں۔فرح ناز ان کا مضبوط سہارا اور طاقت تھی اور انہیں جب بھی اس کی ضرورت ہوتی وہ اسے اپنے پاس پاتے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی طبیعت بگڑتی چلی گئی اور فرح انہیں ہسپتال لے جانے ،ان کے ایکسرے اور بلڈ ٹیسٹ کروانے اور انہیں ڈاکٹروں کے پاس لے جانے میں پیش پیش رہتی۔اس نے یہ ساری ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی ہوئی تھی اور کبھی ہم سے یہ نہیں کہا کہ تم بھی اس میں اپنا حصہ ڈالو۔۱۸ جنوری ۲۰۱۸ء کو فرح ناز نے مجھے (شہناز) فون کیا اور بتایا کہ ابو کو ہلکا سا ہارٹ اٹیک ہوا ہے لہٰذا تمہیں اب آ جانا چاہیے۔مجھے ایسے لگا جیسے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔میں نے فوراً سیٹ بک کروائی اور واپس پاکستان آ گئی۔وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے لیکن اس بات پر فکر مند بھی تھے کہ میں نے اپنے بچوں کو پیچھے کیوں چھوڑا ہے۔انہوں نے مہناز کو یاد کیا تو اس کے شوہر نے ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر اسے ابو کے پاس بھجوا دیا۔

ابو ہسپتال میں صرف ۱۳ دن رہے۔وہ ناقابل یقین حد تک صابر آدمی تھے۔جس دن انہیں ہارٹ اٹیک ہوا اس دن وہ بالکل پرسکون تھے۔انہوں نے اللہ کا نام لیا اور فرح اور اس کی بیٹیوں کو اپنے دائیں ہاتھ پر اللہ کا نام لکھا ہوا دکھایا۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں پھول اور نہریں نظر آئی ہیں۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہیں

ایسے لگا جیسے کوئی ان کے سرہانے آ کر بیٹھ گیا ہو۔ وہ اسے نہیں جانتے تھے اور ان کے بقول ان کا خیال ہے کہ وہ کوئی فرشتہ تھا۔ گزشتہ رات وہ میرے پاس سے گزرے تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا انہیں درد ہے؟ تو جواب میں انہوں نے کہا کہ ''نہیں''۔ میں جانتی تھی کہ وہ صبر سے کام لے رہے ہیں۔ انہوں نے عامر کا پوچھا تو میں نے کہا کہ اس کا پاسپورٹ ایکسپائر ہو گیا ہے اور اس کی تجدید میں تاخیر ہو رہی ہے۔ اس پر انہیں قدرے مایوسی ہوئی۔ تب مجھے علم ہوا کہ وہ اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے لیکن ضبط کا دامن بھی نہ چھوڑ رہے تھے۔

وہ رات کو اچانک گہری نیند سے اٹھ جاتے اور دعائیں پڑھنے لگتے۔ وہ مستقلاً استغفار کرتے رہتے اور زیرِ لب قرآنی آیات اور درود شریف پڑھتے رہتے۔ ۳۰ جنوری ۲۰۱۸ء بروز منگل صبح کے وقت اللہ تعالیٰ نے اس سعید روح کو اپنے پاس بلا لیا۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)۔ ان کے ڈاکٹر حضرات انہیں ایک رحمدل، باعلم اور مہذب انسان کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں کے مطابق ان کے آخری الفاظ ان لوگوں کے لیے اظہار تشکر کے تھے جنہوں نے ان کا خیال رکھا۔ بچپن سے اب تک جب بھی ہم اپنے والد سے بچھڑتے تو روتے اور وہ ہمیں اور اپنے نواسوں، نواسیوں سے کہتے کہ ''تم چاند کی طرف دیکھو اور یاد رکھو کہ وہ تمہارے ساتھ ہی ہوتا ہے۔'' ۳۱۔ جنوری کو ان کی رحلت کے اگلے دن ہم نے ''سپر مون'' دیکھا جو ڈیڑھ صدی میں صرف ایک دفعہ ظاہر ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے ابو یاد آ گئے۔

ہر شخص کے لیے اس کا والد سب سے اہم اور خاص شخص ہوتا ہے۔
ہماری نظر میں ہمارے والد دنیا کے منکسر المزاج ترین آدمی تھے۔ ہم خوش قسمت تھے کہ ہمیں ان جیسا شخص بحیثیت والد ملا۔ وہ اپنے بچوں سے اظہار محبت میں کبھی نہ شرماتے بلکہ اس پر فخر کرتے۔ وہ ہم بہن بھائیوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک خاص اور منفرد تعلق رکھتے تھے لیکن محبت سب کے ساتھ ایک جیسی کرتے تھے۔ انہوں نے ایک کامیاب زندگی گزاری اور اپنی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں اور مشکلات کا پوری استقامت اور دلجمعی سے مقابلہ کیا۔ انہوں نے ہمارے اندر اخلاقیات، ساکھ کی حفاظت کا احساس، جرأت اور سب سے بڑھ کر محبت پیدا کی۔ یہ بہت ہی اہم تحفہ ہے جو بہت تھوڑے لوگ کسی کو دے پاتے ہیں۔

ان کے چلے جانے کے سے ہماری زندگیوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے بیان کرنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں اور یہ خلا کبھی پُر نہیں ہو سکے گا لیکن ہمیں یہ تسلی ضرور ہے کہ وہ اپنے کے پاس ہیں اور ان شاء اللہ وہاں اپنے اچھے اعمال کا بہترین بدلہ ضرور پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں اور ہمیں اس صدمے کو صبر کے ساتھ سہنے کا حوصلہ دیں۔ عامر اپنے والد کے اکلوتے بیٹے ہیں اور ان سے سیکھی ہوئی اقدار کا تذکرہ اپنے دوستوں کے ساتھ کر کے انہیں زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے دوستوں نے ہمارے والد کو کبھی نہیں دیکھا لیکن غائبانہ طور پر ان سے بہت متاثر ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ ابو عامر کی کل کائنات تھے۔ وہ ان کے لیے بیک وقت باپ، ماں اور بہترین دوست تھے۔

نعمتِ برہنگی

تو کیا زندگی اِک لاعلاج مرض ہے؟
کہ جب ایک شیر خوار بچہ
روتا ہوا جنم لیتا ہے
تو ہم مسکراتے ہیں
اور جب کسی مردہ شخص کے چہرے پر
مسکراہٹ دیکھتے ہیں
تو ہم روتے ہیں
ہم ہچکچاتے ہیں، اُن رستوں سے
ہم ہمیشہ ہچکچاتے ہیں اُن رستوں سے
جو زندگی کو ابدیت عطا کرتے ہیں

بلیک نے اپنے بسترِ مرگ پر
خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا کی تھی

میری اپنی دادی ماں بھی
جو ایک شاعرہ تو نہ تھیں
لیکن وہ بھی مسکرائی تھیں
ایک ایسی مسکراہٹ
جو ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی

تاہم یہ گوشت پوست کا وجود
جو ایک مانوس لبادے سے زیادہ کچھ بھی نہیں
اور جو خوراک کے باوجود
موت کی جانب بڑھتے ہوئے،
ڈھیلا ہوتا چلا جاتا ہے
یہاں تک کہ مکمل جدا کر دیا جاتا ہے
یا ان غرباء کو دان کر دیا جاتا ہے
جو نہیں جانتے
کہ اس گوشت پوست کے لبادے سے ماورا
نعمتِ برہنگی کیا ہوا کرتی ہے؟

ایریکا ڑونگ کی نظم'' کیا زندگی لاعلاج مرض ہے؟''

مترجم: حنا جمشید

ایک صدی کا قصّہ

راجکمار

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

ممبئی کی فلم انڈسٹری میں وہ واحد ہیرو ہے جسکے قصے ہر فلمی محفل میں شوق سے سنائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہندی فلموں کے مشہور و معروف فلمساز اور ہدایت کار پرکاش مہرہ فلم ''زنجیر'' کے لئے ہیرو کی تلاش میں تھے۔ وہ اس فلم کے لئے اُس ہیرو کو سائن کرنا چاہتے تھے جو کافی مقبول تھا۔ ہیرو کے سیکرٹری سے وقت لے کر وہ اُس سے ملنے اُسکے گھر پر پہونچے۔ جب پرکاش مہرہ اُن کے کمرے میں داخل ہوئے تو اُنکا پالتو کتا اُنہیں دیکھ کر بھونکنے لگا۔ اپنے کتے کو پچکار کے جب پرکاش مہرہ اُنکے سامنے بیٹھ گئے تو ہیرو صاحب نے اُن سے پوچھا کہ اُنہوں نے سر میں کون سا تیل لگایا ہے تو مہرہ صاحب فخریہ انداز میں بولے۔ سرسوں کا تیل۔ وہ بولے مجھے سرسوں کے تیل کی بو پسند نہیں۔ مہرہ صاحب خفت سے اُنکی طرف دیکھنے لگے۔ اپنے آپ کو سنبھال کر اُنہوں نے اُس ہیرو سے پوچھا کہ کیا وہ اُنکی فلم میں کام کریں گے۔ جواب میں وہ ہیرو بولے۔ جب میرے کتے نے آپ کو پسند نہیں کیا تو میں آپ کی فلم میں کیسے کام کر سکتا ہوں۔ پرکاش مہرہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے جب وہ وہاں سے اُٹھ کے چلے گئے تو ہیرو صاحب اُنہیں باہر تک چھوڑنے بھی نہیں آئے۔ پرکاش مہرہ اس ذلت کو بھلا نہ سکے۔ اُنہوں نے قسم کھائی کہ ایک دن وہ اس سر پھرے ہیرو کو اپنی تال پر ضرور نچائیں گے۔ اب اُنکے لئے سب سے کٹھن مسلہ یہ تھا کہ وہ اس فلم میں کسے ہیرو لیں۔ تبھی پران صاحب نے اُن سے ایک لڑکے کی سفارش کی۔ یہ لڑکا کوئی اور نہیں بلکہ نا کام ہیرو امیتابھ بچن تھا جس کی کوئی فلم چل نہیں رہی تھی اُنہوں نے پران صاحب کے کہنے پر امیتابھ بچن کو اس فلم کے لئے سائن کیا۔ اگر بڑے ہیرو صاحب وہ فلم نہیں ٹھکراتے تو امیتابھ بچن کو شاید وہ مقام اور مرتبہ نہیں ملتا جہاں وہ آج کھڑے ہیں۔

یہ سر پھرے ہیرو اور کوئی نہیں بلکہ ہم سب کے جانی یعنی راجکمار ہیں۔

راجکمار کا اصلی نام کل بھوشن ناتھ پنڈت تھا۔ وہ کشمیری پنڈت خانوادے سے تھا۔ راجکمار نے 8 اُکتوبر 1926 کو بلوچستان کے لورلائی میں جنم لیا۔ اپنی ابتدائی پڑھائی پوری کرنے کے بعد وہ 1940 میں اپنے خاندان کے ساتھ بمبئی چلا آیا جہاں اُسے بمبئی پولیس میں نوکری مل گئی۔ وہ بطور سب انسپکٹر پولیس میں بھرتی ہوا۔

ایک دن کیا ہوا کہ وہ بمبئی کے میٹرو سینما میں فلم دیکھنے چلا گیا۔ اُس دن مشہور ہدایت کار اور فلمساز سہراب مودی بھی فلم دیکھنے چلے آئے تھے۔ سہراب مودی ہر دم نئے چہروں کی تلاش میں رہتے تھے۔ اچانک اُن کی نظر ایک لمبے تڑنگے، گورے چٹے نوجوان پر پڑی تو اُنہوں نے اپنے آپ کو متعارف کر کے اُس سے پوچھا کہ کیا وہ فلموں میں کام کرنا پسند کریں گے تو جواب میں راجکمار نے کہا کہ اُسے فلموں میں کام کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

کچھ عرصہ بعد اردو کی نامور افسانہ نگار عصمت چغتائی کے گھر چوری کا واقعہ رونما ہوا۔ جس کی تفتیش پر راجکمار کو مقرر کیا گیا۔ دوران تفتیش عصمت چغتائی نے راجکمار کے لب و لہجے کی صفائی اور آواز کی کھرج کو محسوس کرتے ہوئے راجکمار کو مشورہ دیا کہ وہ خود کو اس طرح ضائع نہ کرے قدرت نے اُسے جو آواز، چال ڈھال، عادات و اطوار اور اندازِ نشست و برخاست سے نوازا ہے وہ اُسے فلم اداکاری میں آزمانا چاہیے اور پھر عصمت چغتائی کی سفارش پر راجکمار کو فلم میں رول کے لیے چُنا گیا۔

اُسے اس بات کی آگہی نہیں تھی کہ قسمت اُسے کھینچ کھانچ کے فلموں میں لے ہی آئے گی۔ آخر وہ دن آ گیا جب وہ فلموں میں آ گیا اور 1952 میں اُسکی پہلی فلم ''رنگیلی'' ریلیز ہوئی۔ فلم ٹکٹ کھڑکی پر اوندھے منہ گری۔ اُسکے بعد 1953 میں فلم ''آبشار'' اور 1955 میں ''گھمنڈ'' ریلیز ہوئیں مگر یہ فلمیں بھی ناکام رہیں اور راجکمار کو کوئی خاص پہچان نہیں ملی۔ آخر ایک دن قسمت کی دیوی نے اُسکے در پر دستک دی۔ محبوب خان نے اُسے فلم ''مدر انڈیا'' کے لئے سائن کیا۔ اس فلم میں اُسے نرگس کے شوہر کے رول میں پیش کیا گیا۔ یہ فلم 1957 میں ریلیز ہوئی۔ جو تین فلمیں نہ کر سکیں وہ اس فلم نے کر دکھایا۔ ایک چھوٹا سا رول ہونے کے باوجود راجکمار نے کامیابی کی طرف پہلی جست لگائی۔ اُسکے کام کو ہر خاص و عام نے سراہا۔ اسی سال اُسکی ایک اور فلم ''نوشیروان عادل'' نے کامیابی کے ڈنکے بجائے۔ اس فلم کے ہدایتکار وہی سہراب مودی تھے جنہوں نے سب سے پہلے اُسے فلموں میں کام کرنے کی پیشکش کی تھی۔ اس فلم میں اُسکے ساتھ سہراب مودی، نسیم بانو اور مالا سنہا تھے جب کہ اس فلم کی مدہوش کرنے والی موسیقی سی رامچند رنے ترتیب دی تھی۔ اسی سال اُسکی اور دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''کرشن سداما'' اور ''نیل منی''۔ 1958 میں دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''دلہن'' اور ''پنچایت''۔

فلمساز اُسے دھارمک فلموں کے لئے زیادہ موزوں سمجھتے تھے اس لئے شروع شروع میں اُسکی زیادہ تر فلمیں دھارمک موضوعات پر مبنی ہوتی تھیں۔ 1959 سے اُسکے فلمی کیریر نے ایکدم کروٹ لی۔ وہ پہلی بار دلیپ کمار کے ساتھ پردہ سیمیں پر جلوہ گر ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب دلیپ صاحب اپنے عروج پر تھے۔ اُنکا نام ہی فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ مدراس کے جانے مانے فلم ساز اور ہدایت کار ایس ایس واسن نے اُسے اپنی فلم ''پیغام'' میں دلیپ کمار کے بڑے بھائی کے رول میں پیش کیا تھا۔ اس فلم نے اُسے نہ صرف مقبولیت بخشی بلکہ اُس کی امیج کو بھی بدل دیا۔ جو فلمساز کل تک اُسے دھارمک کرداروں کے زمرے میں رکھتے تھے، اُنہیں بھی اس بات کا احساس ہونے لگا کہ وہ سنجیدہ اور جذباتی رول بھی بخوبی ادا کر سکتا ہے۔ اس سال ''درگا ماتا'' کو چھوڑ کے جتنی بھی فلمیں ریلیز ہوئیں

اُن میں وہ مختلف کرداروں میں جلوہ گرتھا۔''شرارت''،''اردھانگنی''،''سورگ سے سندر دیش ہمارا''اور''اُجالا''اُسکی کامیاب ترین فلمیں تھیں۔سب سے زیادہ کامیاب فلم''اُجالا''تھی جسمیں اُسکے ساتھ شمّی کپوراور مالاسنہا بھی تھے۔اس فلم کو اپنی مدھر دھنوں سے شنکر جے کشن نے آراستہ کیا تھا۔

1960 میں راجکمار کی صرف ایک ہی فلم ریلیز ہوئی۔یہ فلم تھی فلمساز کمال امروہی اور ہدایت کار کشور ساہو کی فلم''دل اپنا پریت پرائی''۔یہ فلم اُسکے کیریر میں ایک سنگ میل کی حثیت رکھتی ہے۔یہ بظاہر ایک رومانٹک فلم تھی مگر اس فلم میں محبت کے ساتھ ساتھ جذبات کا ایسا ریلہ بھی بہتا تھا جو ناظرین کو اشک بار کردیتا تھا۔اس فلم میں اُس کے مدمقابل''ٹریجڈی کوئن''یعنی ملکہ الم مینا کماری تھیں۔دونوں اس فلم میں اداکاری کی معراج پر نظر آرہے تھے۔کشور ساہو نے اس فلم کو بڑی لگن اور محنت سے بنایا تھا۔فلم کی ریلیز سے پہلے فلم کے پرڈیوسر کمال امروہی کشور ساہو سے اسقدر خفا تھے کہ اُنہوں نے بطور فلمساز اس فلم سے اپنا نام ہٹوا کر اپنے سیکرٹری باقر حسین کا نام مشتہر کردیا۔وہ اس بات سے شاکی تھے کہ کشور ساہو نے مینا کماری کو فلم میں صحیح ڈھنگ سے پیش نہیں کیا۔جب فلم ریلیز ہوئی اور فلم نے باکس آفس پر دھوم مچا دی تو کمال امروہی نے فوراً باقر حسین کا نام ہٹوا کر اپنا نام ڈال دیا۔فلم دل کو چھونے والے رومان کا ایک مرقع تھا۔سونے پہ سہاگہ یہ کہ اس فلم کو من موہنی موسیقی سے کامیاب سنگیت کار جوڑی شنکر جے کشن نے آراستہ کیا تھا۔

''دل اپنا پریت پرائی''کے بعد راجکمار کی گنتی کامیاب اداکاروں میں ہونے لگی۔اگلے سال راجکمار کی کامیاب فلموں کی لائن لگ گئی۔''گھرانہ''جسمیں اُسکے ساتھی کلا کار راجندر کمار اور آشا پاریکھ تھے۔ 1961 میں ریلیز ہونے والی راجکمار کی یہ واحد فلم تھی جس نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا۔پھر آئی''دل ایک مندر''۔یہ بے حد جذباتی فلم تھی جسمیں اُسکی من پسند ہیروئن مینا کماری اُسکے ساتھ تھی۔یہ تکونی پریم کہانی تھی جسمیں راجندر کمار بھی تھا۔اس فلم کے لئے راجکمار کو بے مثال اداکاری کے لئے فلم فیر ایوارڈ سے نواز اگیا۔اسی سال پریم چند کے ناول پر مبنی''گئو دان''،''پھول بنے انگارے''اور ''پیار کا بندھن''ریلیز ہوئیں۔یہ سبھی فلمیں 1963 میں ریلیز ہوئیں۔ 1964 میں راجکمار کی صرف ایک فلم ریلیز ہوئی۔وہ فلم تھی''زندگی''۔''زندگی''ساؤتھ کی جیمنی پکچرس کی فلم تھی جس کے ہدایت کار اور کہانی کار راما نند ساگر تھے،جس میں راجکمار کے ساتھ راجندر کمار،وجینتی مالا اور پرتھوی راج کپور کلیدی رول میں تھے۔اس فلم نے بھی کامیابی کے جھنڈے لہرائے۔

پھر آیا 1965 کا سال۔یہ سال راجکمار کے لئے ایک یادگار اور خوشگوار سال تھا۔اس سال اُسکی چار فلمیں ریلیز ہوئیں۔''وقت''،''کاجل''،''اونچے لوگ''اور''رشتے ناتے''۔''وقت''ایک ایسی فلم تھی جس نے راجکمار کو نئے انداز میں پیش کیا۔راجکمار کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اُسے اُردو زبان پر دسترس حاصل تھی۔اُسکا تلفظ بیحد صحیح ہوتا تھا۔دوسری خوبی یہ تھی کہ اُس کے آہنگ میں جو کھرج تھی وہ مستی بھری کھرج اُسکے مکالموں کو زندگی بخش دیتی تھی۔''وقت''میں اُسنے مکالمے ادا کرنے کا جو انداز اپنایا وہ انداز اتنا مقبول ہوا کہ اُسکے ایک ایک ڈائیلاگ کو لوگ بار بار دہراتے رہے۔''چنائی سیٹھ جن کے گھر شیشے کے بنے ہوتے ہیں۔وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکا کرتے''۔اور''چنائی سیٹھ چھری بچوں کے کھیلنے کی چیز نہیں ہوتی۔ہاتھ کٹ جائے تو خون نکل آتا ہے''۔مکالموں کی ادائیگی کے اس نئے انداز میں ہدایت کار کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔یہ دلکش انداز،یہ شاہانہ تکلم،اُس کی خود کی اختراع تھی۔کوئی نہیں جانتا تھا کہ راجکمار کی یہ پروقار طرز ادا اور اُسکی پرافسوں آواز فلم بینوں کو اتنی بھا جائے گی کہ وہ اُس کے ڈائیلاگ سننے کے لئے بار بار سینما گھروں کا رخ کریں گے۔''وقت''ایک ملٹی اسٹار فلم تھی جسمیں بلراج ساہنی،سنیل دت،سادھنا،شرمیلا ٹیگور اور ششی کپور شامل تھے مگر ستاروں کی اس کہکشاں میں جو ستارہ سب سے زیادہ تابدار تھا وہ راجکمار تھا۔اس فلم نے بزنس کے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ دئے۔ایک طرف''وقت''کامیابی سے ہمکنار تھی تو دوسری طرف راجکمار کی فلم''کاجل''بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہی تھی۔اس فلم میں راجکمار کی پسندیدہ ہیروئن مینا کماری اُسکے ساتھ جلوہ گر تھی اور ساتھ میں دھرمیندر۔اس فلم کی کہانی اُردو کے مشہور ناول نگار گلشن نندہ کے ناول''مادھوی''پر مبنی تھی۔

1967 کا سال بھی راجکمار کے لئے کامیابیوں اور کامرانیوں کا سال ثابت ہوا۔گو کہ اس سال اُسکی صرف دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔''ہمراز''اور ''نئی روشنی''،مگر دونوں فلموں نے خوب کمائی کی۔''ہمراز''بی آر فلمز کے بینر تلے بنی تھی جس کے ہدایت کار بی آر چوپڑہ تھے۔اس فلم میں سنیل دت،ومی اور ممتاز بھی شامل تھے مگر راجکمار کا کردار سب سے زیادہ دم دار تھا۔اسی طرح''نئی روشنی''میں اُسکے ساتھ اشوک کمار،بسواجیت،مالاسنہا اور تنوجہ اہم کرداروں میں تھے مگر راجکمار ان سب میں الگ تھا۔

1968 کا سال راجکمار کے لئے کچھ زیادہ ہی مبارک ثابت ہوا۔اس سال اُسکی تین فلمیں ریلیز ہوئیں اور تینوں کی تینوں باکس آفس پر دھوم مچا گئیں۔''میرے حضور''،''نیل کمل''اور''واسنا''۔''میرے حضور''میں اُسکے ساتھی کلاکاروں میں جیتندر اور مالاسنہا۔''نیل کمل''میں منوج کمار اور وحیدہ رحمان۔ ''واسنا''میں ساؤتھ کی ہیروئن پدمنی تھی۔''واسنا''میں وہ ہیرو کے رول میں تھا جب کہ باقی کی دو فلموں میں وہ ہیرو نہ ہوتے ہوئے بھی اہم کرداروں میں تھا اور منفی کردار میں ہونے کے باوجود سب سے زیادہ اُسی کی پزیرائی ہوئی تھی۔

رومان پرور آدمی ہونے کے باوجود راجکمار کے کسی ہیروئن کے ساتھ عشق کے چرچے سنائی نہیں دئے۔اُس نے سبھی کامیاب ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا مگر وہ کسی بھی ہیروئن کے پیار میں مبتلا نہیں ہوا۔اُس کا دل لوٹا تو ایک انگلوانڈین ائیر ہوسٹس نے جو اُسے ایک فلائٹ میں سفر کے دوران ملی۔پہلی ہی نظر میں وہ اُس ائیر ہوسٹس پر فدا ہو گیا اور اُسنے جنیفر نام کی اس ائیر ہوسٹس سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔اُس نے اپنا نام بدل کر گائیتری رکھ لیا۔اُن دنوں

راجکمار کی ماں حیات تھیں۔ اُنہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ گائیتری کو کشمیری کلچر میں پوری طرح سے ڈھال دیں۔ راجکمار کشمیر سے باہر رہنے کے باوجود اپنی جڑوں سے ہمیشہ جڑا رہا۔ گھر میں اُنکا رہن سہن، کھان پان ویسا ہی تھا جیسے ایک عام کشمیری ہندوؤں کا ہوتا ہے۔ اُسکی صبح کی شروعات کشمیری قہوے سے ہوتی تھی جسمیں بادام کی گری کے ساتھ شہد بھی ڈالا جاتا تھا۔ کھانے میں اُسے روغن جوش، کشمیری پنیر اور کھٹے بینگن بہت پسند تھے۔ اُسے اپنے کلچر پر ناز تھا اسلئے وہ ہر سال اپنے بال بچوں کو لے کے کشمیر جاتا تھا اور یہ لوگ وہاں ایک دو مہینے قیام کرتے تھے۔ اُس کی من پسند جگہ گلمرگ ہوا کرتی تھی۔ گائیتری کو وہ شادی سے پہلے یہیں لایا تھا اور یہیں پر دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ شادی 1960 میں ہوئی۔ گائیتری سے اُنکے تین بچے ہوئے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ بڑے بیٹے کا نام پرو راجکمار ہے جب کہ مجھلے کا نام پنین راجکمار اور بیٹی کا نام واستیو کتا ہے۔ پرو نے کئی فلموں میں کام کیا مگر کامیابی نہیں ملی۔

راجکمار اُردو زبان کا شیدائی تھا۔ اُسے ہندی نہیں آتی تھی۔ اُسنے اُردو کے نامور ادبا کو پڑھا تھا۔ جب چیتن آنند نے ''ہیر رانجھا'' بنانے کا فیصلہ کیا تو اُسے رانجھے کے لئے راجکمار کے سوا کوئی ایکٹر دکھائی نہیں دیا جو اس کردار کے ساتھ انصاف کر سکے۔ اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے تمام تر مکالمے منظوم تھے۔ یہ مکالمے کیفی اعظمی نے لکھے تھے۔ اُردو الفاظ کی صحیح ادائیگی راجکمار سے بہتر کون کر سکتا تھا۔ فلم 1970 میں ریلیز ہوئی اور خوب پسند کی گئی۔ اُس کے بعد آئی ''لال پتھر'' اور ''مریادا''۔ ''لال پتھر'' نا کام رہی جب کہ ''مریادا'' نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔

پھر آئی کمال امروہی کی ''پاکیزہ''۔ ''پاؤں زمین پہ مت رکھئے گا میلے ہوجائیں گے''۔ یہ اسی فلم کا وہ مکالمہ تھا جو زبان زد عام ہوگیا تھا۔ ''پاکیزہ'' میں اُس کی ہیروئن مینا کماری تھی۔ راجکمار نے سب سے زیادہ فلمیں مینا کماری کے ساتھ کیں۔ وہ مینا کماری کا زبردست مداح و پرستار تھا۔ ''پاکیزہ'' مینا کماری کی آخری فلم تھی۔ فلم ریلیز ہونے سے پہلے ہی مینا کماری اس دنیا کو الوداع کہہ گئی۔ یہ فلم کمال امروہی کے لئے سونے کی کان ثابت ہوئی۔ فلم نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا۔

راجکمار موڈی آدمی تھا۔ وہ پیسوں کے لئے فلمیں نہیں کرتا تھا۔ اُسنے کتنی فلمیں ٹھکرا دیں۔ کبھی کہانی اُسے پسند نہیں آئی، کبھی ہیروئن جچی نہیں تو کبھی ہدایت کار میں کھوٹ نظر آئی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ سنکی تھا۔ پر سچ تو یہ تھا کہ وہ منہ پھٹ آدمی تھا۔ اُسے جو کہنا ہوتا تھا وہ پیٹھ پیچھے نہیں کہتا تھا بلکہ منہ پر کہہ دیتا تھا۔ اُسے جھوٹ موٹ کا دکھاوا پسند نہیں تھا۔ ایک بار جب وہ متھن چکرورتی کے ساتھ ایک فلم میں کام کر رہا تھا تو ایک دن وہ ایک مہنگا سا سوٹ پہن کر جب سیٹ پر آیا تو راجکمار نے پوچھا کہ یہ کپڑا کہاں سے لائے ہو تو متھن راجکمار پر اپنی امیری کا رعب جھاڑنے کے لئے بولا کہ یہ بہت مہنگا کپڑا ہے باہر سے منگوایا ہے۔ راجکمار نے جواب میں بڑے طنزیہ انداز سے کہا کہ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ کل ہی اُس کی بیوی کھڑکیوں کے پردے کے لئے ایسا ہی کپڑا بازار سے خرید کر لے آئی ہے۔ متھن چکرورتی اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

راجکمار کی کئی فلمیں ''پاکیزہ'' کے بعد ریلیز ہوئیں، جیسے ''دل کا راجہ''، ''ہندوستان کی قسم''، ''چھتیس گھنٹے''، ''ایک سے بڑھکر ایک'' اور ''کرم یوگی''۔ یہ فلمیں 1972 سے لے کے 1978 کے بیچ ریلیز ہوئیں۔ پھر آئی ''بلندی''۔ یہ فلم 1980 میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں جب وہ پردے پر نمودار ہوتا تھا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اُٹھتا تھا۔ ''خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے، خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے'' یا ''میری نظر میں پیدا ہونا ایک اتفاق ہے، لیکن جینا اتفاق نہیں۔ ارادے پیدا کرو، ارادے، ارادے سے آسمان کا چاند بھی انسان کے قدموں میں سجدہ کرتا ہے''۔ یہ وہ مکالمے تھے جنہیں سن کر پورا ہال تالیوں سے گونج اُٹھتا تھا۔ راجکمار اُردو کے شستہ اور شائستہ مکالمے جس ہنر مندی سے پیش کرتے تھے، یہ اُسی کا خاصا تھا۔ وہ جس حقیقی اور معنوی تاثر کے ساتھ مکالمے ادا کرتا تھا یہ مکالمے سیدھے فلم بینوں کے دل میں اُتر جاتے تھے۔

راجکمار نے ہر طرح کے رول کئے۔ پولیس افسر، ڈاکٹر، شاعر، نواب اور ڈاکو۔ ایسے متضاد رول ادا کرنے میں راجکمار کا کوئی ثانی نہ تھا۔ فلم ''چمبل کی قسم'' اور ''دھرم کانٹا'' میں اُسنے ڈاکو کا رول بڑی خوبی سے ادا کیا۔ اُسنے ہر چھوٹے بڑے ادا کار کے ساتھ کام کیا۔ اُسے نئے لوگوں کے ساتھ کام کرنے میں کوئی احتراز نہیں تھا۔ ''مرتے دم تک'' مہول کمار کی فلم تھی جس میں اُسکے ساتھ رومانٹک ہیرو کے رول میں گوندا تھا۔ اسی طرح ''مہاوریا'' میں اُسکے ساتھ دھرمیندر اور راج ببر تھے۔ ''سوریہ'' میں اُسکے ساتھ ونود کھنہ تھا، جب کہ ''پولیس پبلک'' میں اُسکا معاون کلاکار راج کرن تھا۔ پھر 1991 میں آئی ''سبھاش گھئی کی ملٹی سٹار فلم ''سوداگر''۔ فلم ''پیغام'' کے بعد یہ دوسری فلم تھی جو وہ دلیپ صاحب کے ساتھ کر رہا تھا۔ جب سبھاش گھئی نے ان دونوں کو سائن کیا تو سبھاش گھئی کے خیر خواہ اُسکے لئے دعائیں مانگنے لگے۔ اُس نے ایک شیر کو نہیں دو دو شیروں کو ایک ساتھ لڑانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دلیپ صاحب کے ساتھ وہ ''ودھاتا'' اور ''کرما'' پہلے ہی کر چکے تھے اس لئے صاحب کے مزاج سے وہ کماحقہ واقف تھا مگر راجکمار کے ساتھ وہ پہلی مرتبہ کام کر رہا تھا۔ راجکمار کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ سنکی قسم کا آدمی ہے۔ کون جانے کب کیا کر بیٹھے، اسکی پیشن گوئی کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ شروع شروع میں راجکمار نے سبھاش گھئی کو پریشان تو کیا مگر دھیرے دھیرے وہ بھی سبھاش گھئی کی لے پر ناچنے لگا اور اس طرح ''سوداگر'' پردہ سیمیں کی زینت بنی۔ اس فلم کے اس مکالمے کو کون بھول سکتا ہے۔ ''جانی ہم تمہیں ماریں گے۔ ضرور ماریں گے لیکن وہ بندوق بھی ہماری ہوگی، گولی بھی ہماری ہوگی اور وقت بھی ہمارا ہوگا''۔ جانی اُسکا تکیہ کلام تھا جو وہ ہر ڈائیلاگ میں استعمال کرتا تھا۔

راجکمار کو بیشتر فلمسازوں نے ایکشن ہیرو کے طور پہ پیش کیا۔ مہول کمار کی ''ترنگا'' جسمیں اُسی جیسا ایک اور سنکی نانا پاٹیکر اس فلم میں اُسکا شراکت

دار بنا تھا۔ مہول کمار کی جی داری کو سلام کرنا چاہیے کہ اُسنے دو دو شیروں کے منہ میں اپنا سر ڈال دیا۔ بڑا خوش نصیب رہا وہ کہ فلم نہ صرف مقررہ وقت میں پوری ہوئی اور ریلیز ہوئی بلکہ خوب کمائی بھی کی۔

جس پرکاش مہرہ کی اُسنے ایک دن تذلیل کی تھی، اُسی پرکاش مہرہ نے اپنی قسم پوری کی۔ اُسنے راجکمار کو اپنی فلم ''مقدر کا بادشاہ'' کے لئے سائن کیا۔ تب راجکمار نے اُس سے یہ نہیں پوچھا کہ سر میں کون سا تیل ڈالتے ہو۔ پرکاش مہرہ نے یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ وہ اپنی ایک فلم سے امیتابھ بچن کو اسٹار بنا سکتے ہیں۔ فلم ''مقدر کا فیصلہ'' میں راجکمار کے علاوہ راکھی، راج ببر، میناکشی ششادھری اور ٹینا منیم بھی جلوہ گر تھے۔ اس میں راجکمار کلیدی رول میں تھا۔ یہ کرن جوہر کے والد یش جوہر کی فلم تھی جسے پرکاش مہرہ ڈائرکٹ کر رہے تھے۔ فلم ٹھیک ٹھاک چلی۔

راجکمار اپنے پریوار سے بے انتہا پیار کرتا تھا۔ وہ اپنی بیوی پر جان چھڑکتا تھا۔ اُسنے اپنی بیوی کو ہمیشہ فلمی چکا چوند سے دور رکھا۔ وہ کبھی کسی فلمی تقریب میں نظر نہیں آئی۔ کئی معاملوں میں وہ قدامت پسند تھا۔ اُسنے اپنی بیٹی کو بھی فلموں میں کام کرنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ فطرت کا شیدائی تھا۔ اُسے پہاڑوں میں گھومنا پھرنا اچھا لگتا تھا۔ چونکہ وہ کشمیری نژاد تھا اسلئے وہ کسی نہ کسی بہانے اپنے بچوں کو کشمیر لے کے جاتا تھا اور یہ لوگ یہاں سری نگر پہلگام یا گلمرگ میں کئی مہینے گزارتے تھے۔ ایک بار اُسنے اپنی بیوی کا جنم دن گلمرگ میں منایا۔ دو سو کے قریب مہمان اس تقریب میں شریک ہوئے۔ ان میں سے بیشتر مہمان کلکتہ دلی اور بمبئی سے تشریف لائے تھے۔ رات بھر غزلوں اور کلاسیکل موسیقی کا دور چلتا رہا۔ راجکمار اُردو غزلوں کا دیوانہ تھا۔ اُسے اُردو کے مشہور شاعروں کا کلام ازبر تھا۔

راجکمار سگریٹ اور پائپ پینے کا عادی تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ایک دن یہی سگریٹ اُس کے لئے جان لیوا ثابت ہوگا۔ 1994 میں وہ اچانک بیمار پڑ گیا۔ مرض کی تشخیص ہوئی تو پتا چلا کہ اُسے گلے کا کینسر ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اس موذی مرض کا شکار ہو چکا ہے، اُس نے ہمت نہیں ہاری اور آواز بیٹھ جانے کے باوجود اُسنے فلم ''پولیس پبلک'' میں کام کیا۔ وہ دو سال تک اس مرض سے لڑتا رہا۔ اس بیچ اُسکی آواز پوری طرح چلی گئی۔ دو سال کی جدوجہد کے بعد اُس نے ہار مان لی۔ وہ فلموں میں برابر کام کرتا رہا۔ 1995 میں اُسکی دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''جواب'' اور ''گاڈ اور گن''۔ یہ اُسکی آخری فلمیں تھیں۔ 3 جولائی 1996 کو اُس نے اس دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الوداع کہا۔ اُسکی وصیت کے مطابق اُس کی آخری رسومات بڑی راز داری کے ساتھ ادا کی گئیں۔ وہ وگ کا استعمال اس خوبی اور راز داری سے کرتا تھا کہ اُس کے قریبی لوگ بھی اُسے بنا وگ کے کبھی دیکھ نہیں پائے تھے۔ وہ سچ مچ کا راجہ تھا۔ وہ اپنی زندگی شان سے جیا۔ اُس نے کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ صاف گوئی اُس کی فطرت میں تھی۔ اس صاف گوئی کی وجہ سے اُسے کئی بار نقصان بھی اُٹھانا پڑا مگر سود زیاں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُسنے اپنی خو بو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ اُردو زبان کی آبیاری کرنے والا ایک دیوانہ چلا گیا مگر جب تک اُردو ہے یہ فلم نگری ہے، راجکمار کو کوئی بھلا نہیں پائے گا۔ جب بھی کوئی سرپھرا راہ سے بھٹک جائے گا تو اُس کا یہ مکالمہ اُسکے لئے کیمیا کا کام کر جائے گا۔

''نہ تلوار کی دھار سے، نہ گولیوں کی بوچھار سے، بندہ ڈرتا ہے تو صرف پروردگار سے''

لمحۂ بے لوث

فکشن کے اُفق پر ابھرتے ہوئے نئے ستارے کا نام طیبہ خان ہے۔ جس کی شعاعیں معاشرے میں گہری اترتی معلوم ہوتی ہیں۔

طیبہ نے اپنے افسانوں میں انسانی صورت حال کے مختلف پہلوؤں کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ ان کا مشاہدہ گہرا ہے۔ متوسط اور نچلے طبقے سے آئے ہوئے ان کے کردار اردگرد کے جانے پہچانے کردار ہیں۔ موضوع کا تنوع ان کے افسانے کی خصوصیت ہے۔ ان کا اسلوب رواں دواں اور زبان تشبیہات اور استعارے سے آراستہ ہوتی ہے۔ زندگی سے جوجھتے ہوئے کبھی عام آدمی کا لہولہان چہرہ ''بابا'' کے روپ میں نظر آتا ہے کبھی نوکرانی ''نوری'' کی شکل میں جو زندگی کی بے اعتنائیوں سے گھبرا کر خودکشی میں فرار حاصل کرتی ہے۔ افسانہ ''کیا کھویا'' میں طیبہ زندگی کے تضاد اور داخلی کشمکش کا المیہ بیان کرتی ہیں کہ ایک غلط فیصلہ کس طرح زندگی کی تمام رعنائیاں کھونے کا سبب ہوتا ہے۔

طیبہ اپنے افسانوں میں چونکا دینے کی کوشش نہیں کرتیں بلکہ معاشرے کے دوہرے چہرے سے آہستہ سے نقاب اٹھا کر قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

شموئل احمد

(پٹنہ، بھارت)

اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: کریٹو پبلشرز، امین پور بازار، فیصل آباد۔

رس رابطے

جستجو،ترتیب،تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

جانِ عزیز گلزار!

میں تمہیں دعائیں دوں یا اپنے ماتم میں شریک کروں۔۳۲ سال سے نیویارک میں ہوں۔''چہارسُو'' نے خبر دی کہ میں زندہ ہوں۔اہلِ قلم چونک اٹھے۔کل رات اہلِ قلم بڑی تعداد میں جمع ہوئے اور حلقۂ ارباب ذوق کے تحت ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا۔یہ جلسہ میری ذات کا جشن بن گیا۔

میری جان گلزار! تمہارے مخاطبہ کے سوالات نے زندگی کے نشیب و فراز اور مراحل کو سمیٹا ہے یہ ہنر اور فن مشکل سے آتا ہے۔میں صحافی بھی رہا ہوں اور مختلف رسائل کی ادارت بھی کی ہے۔کسی شخصیت کے کام اور قد وقامت کے تعین کے لیے ذہانت، علم اور آگہی کے عناصر پر عبور اور عہد کی صورت حال سے باخبر ہونا ضروری ہے۔میں تمہیں مخاطبہ اور گفتگو کے اس فن پر دسترس کی داد دینا چاہتا ہوں۔پچھلی صدی اور موجودہ صدی کے سفر کے دوران جو مجھ پر گزرری ہے حوالوں کے ساتھ جو سوال اٹھائے ہیں وہ زندگی کی معنویت کی تلاش میں سالہا سال کی آگ اور شعلے ہیں جو مجھے جھلساتے رہے ہیں اور مجھے لکھنے پر مستقل مجبور کرتے رہے ہیں۔

سرِ ورق بہت فکر انگیز ہے۔زرد، سرخ رنگوں سے عہد کو جس طرح ابھارا ہے قابلِ تعریف ہے۔امید وبیم کی جدوجہد کی عبارت رنگوں میں سمٹ گئی ہے۔فرد اور معاشرے کا جو تعلق محترم شعیب حیدر زیدی نے جس طرح اُبھارا ہے سرورق میں وہ تمام تموج جولانیاں موجود ہیں جس سے میں گزر کر آیا ہوں۔زرد اور سرخ رنگوں کا امتزاج ہی تو ہے فکر وسوچ کا تحیّر اور گہرائی زیدی صاحب قابلِ تحسین ہیں۔

بھائی گلزار! ایک اور اہم بات کا اعتراف نہایت ضروری ہے۔تین سو صفحات کی تلخیص، ۴۵ صفحے میں سمیٹنا ادارت کا کمال ہے۔میں نے یونیورسٹی میں طویل عرصہ تک صحافت کا درس بھی دیا ہے اور عملی طور پر ادارت کے فرائض سے بھی گزرا ہوں۔مختلف مضامین اور قد آور دانشوروں، شاعروں، تنقید نگاروں اور ادیبوں کو سمیٹنا اور اس طرح تلخیص کرنا آسان کام نہیں۔اس فن اور ہُنر کو وہ ہی سمجھ سکتے ہیں جو اس کا شعور رکھتے ہیں۔میں ہمیشہ فن اور ہُنر کا کشادہ دلی سے عمر بھر اعتراف کرتا آیا ہوں۔ہر فنکار، شاعر، ادیب، افسانہ نگار جو حرف اور لفظ لکھتا ہے اُس کا احترام مجھ پر واجب ہے۔

جانِ عزیز! مخاطبہ میں سوال نہیں بلکہ بلّم اور برچھیوں کے وار تھے۔میں بہت سخت جان ہوں جھیل گیا۔صبر اور کشادہ دلی سے ان کا استقبال کیا، میں تمہارا شکر گزار ہوں۔میری شخصیت پر پُر اصرار سے پردے پڑے ہوئے تھے انہیں تم نے ہٹا دیا۔گلزار! تم نے سود وزیاں سے بے نیاز، میری انگلی پکڑ کر عہد کے جس قرض کو چکانے کی سعی کروائی ہے اُس کے لیے شکریہ بے معنی لفظ ہے۔

یہ دور دُنیاداری اور مادہ پرستی کا ہے، تم نے جو قدم اُٹھایا ہے وہ ایک مثالیہ ہے۔میں نے ۳۲ سال میں کسی رسالے میں نہ کچھ بھیجا اور نہ ہی کسی ایڈیٹر کو خط لکھا مگر تم نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس سکوت اور خاموشی کو توڑ دوں۔تمہاری وفاداری، خلوص ادب کی سربلندی کا یہ جذبہ قابلِ تحسین و دادطلب ہے میں نے ایک شعر اپنے شاعر دوست مشیر طالب کے لیے اُس کی نظموں پر لکھا تھا:

عہد کی تاریخ لکھنا چھوڑ دو یہ قلم، کاغذ، سیاہی زہر ہے

تمہارے مخاطبہ نے نہ صرف میری سوچ تبدیل کی بلکہ دل کے زخم چاک بھی ہوئے اور مرہم بھی بنے، کیونکہ جو صورتِ حال میں چھوڑ کر آیا تھا وہ آج بھی قائم ہے:

کھیت ہوں، کھلیان ہوں یا شہر ہوں کہ گاؤں ہوں
غم زدہ آتی ہیں صبحیں، نوحہ گر جاتی ہے شام

جانِ عزیز! کرسٹوفر جان کاڈویل اور کانڈسکی کی طرح زندگی کی معنویت میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔ان حضرات نے مارکس اور اینگلز کو پڑھ کر Clloeseion سے نکل کر Reality کی راہ نکال لی تھی اور مغرب نے فیوڈالزم اور سرمایہ داری سے نجات کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا مگر مجھے عقیدوں کی پیروی اور تقلید کا روگ گھیرا ہوا ہے۔منبر سے جاگیرداری اور سرمایہ داری کو اس طرح تقویت دیتے ہیں کہ اس زنجیر کے ٹوٹنے کے امکانات زندگی کی معنویت تلاش کرنے والوں کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔نئے علوم جہاں بدعت ہوں، اجتہاد کی راہ پر بندشیں ہوں تو وہاں بے امانی کی فصیلیں ہی رہ جاتی ہیں مگر اب دریدہ جسموں کی رفوگری کے لیے تازہ ہوا کی ضرورت ہے:

سوزنِ مذہب نہیں ہے ظلمتِ شب کا علاج
روشنی کے خواب لاؤ، فلسفے بھی کچھ نئے

جانِ عزیز گلزار! مجھے اہلِ قلم اور قارئین کا تو علم نہیں میں اپنی بات پہنچانے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں مگر نیویارک کے حلقہ ارباب ذوق کے مشترکہ جلسہ میں تمہارے اس کام کو بے حد سراہا گیا۔Face Book اور یہاں کے اخبارات میں بھی تمہاری بڑی پذیرائی ہوئی ہے۔تمہارے اس اعزاز کے لیے شکریہ فضول سا لفظ ہے''چہارسُو'' کے اس ادبی اور علمی سفر میں اہلِ قلم کو تمہارے ساتھ کھڑے رہنا چاہیے۔اس رسالہ کی بقا اور ترویج کے لیے ہاتھ بٹانا چاہیے۔

جانِ عزیز! اب وقت آ گیا ہے نشتر فضا میں بکھرے رہنے کے بجائے ہمیں اختلافات و تنازعات مل جُل کر طے کر لینے چاہیے۔برصغیر کی اس تقسیم کو جذباتی رنگ دینے کے بجائے افہام اور تفہیم سے کام لینا چاہیے۔نئے علوم اور اجتہاد کو ملحدانہ اور کافرانہ رویہ قرار نہیں دینا چاہیے۔نیا عہد ہمارے

دروازے پر دستک دے رہا ہے۔اس دستک پر غور کرنا چاہیے۔

آخر میں بیٹی فرح کامران کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جس نے گلزار تم سے مجھے مستقل رابطہ میں رکھا۔اس کے ساتھ تمام اہلِ قلم اور قارئین کا شکریہ۔

یونس شرر (نیویارک)

میرے گلزار، سدا بہار۔

چہارسو کے ذریعے تم نے میرے لیے تقویت کا ایسا سامان فراہم کر رکھا ہے کہ جس کے بعد مجھے نوے برس کی عمر میں بھی کسی قسم کے وٹامن یا ٹانک کی قطعاً ضرورت نہیں۔جب بھی نیا چہارسو آتا ہے تو میں بھوکے شیر کی مانند اپنے شکار پر ٹوٹ پڑتا ہوں اور جو تخلیقات میرے دل کو زیادہ بہاتی ہیں اُنہیں ایک سے زائد بار پڑھ کر اپنی طلب مٹاتا ہوں۔

سب سے اہم بات چہارسو کی یہ ہے کہ وہ ہر بار ایک ایسی شخصیت کی خدمت میں قرطاس اعزاز پیش کرتا ہے کہ جن میں سے اکثر مجھ جیسے پرانے پیپے کے مشاہدے میں بھی نہیں آئی ہوتی۔اس بار پروفیسر یونس شرر صاحب کو تلاش کرنا اور بھرپور طریقے سے اُن کی خدمت میں قرطاسِ اعزاز سجانا بڑا کارنامہ ہے۔یونس شرر صاحب ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ ایک دور کا نام ہے جس کا اندازہ اُن کا انٹرویو پڑھ کر ہوا۔جس محنت سے آپ نے اُن کی زندگی کو کھوجا اُسی دیانت داری سے اُنہوں نے آپ کے سوالات کے جوابات دے کر قاری کو خوب خوب نہال کیا۔شرر صاحب کی بابت لکھے گئے مضامین بھی لاجواب ہیں اور شرر صاحب کی شاعری نے تو بہت ہی لطف دیا کہ ہم پرانے لوگوں کو آج کی شاعری اُس قدر لطف نہیں دیتی جس قدر کلاسیکی شاعری دیتی ہے۔

افسانوں میں تو تم نے میدان خوب مارا ہے۔ہر افسانہ تمہارے اندازِ فکر کا نمائندہ ہوتا ہے مگر قاری کے لیے اُس میں پڑھنے اور سمجھنے کے لیے بہت کچھ نیا بھی ہوتا ہے۔میرے خیال میں ''سینے میں چھپا سانپ'' اردو افسانے کی تاریخ کا نہایت منفرد افسانہ ہے اور اس کو فراموش کرنا مشکل ہوگا۔ڈاکٹر اختر آزاد نے بھی اردو ادب کی تلخ صورت حال کو اپنے افسانے میں بہت چابک دستی سے پیش کیا ہے۔اُن کی جرأت کو سلام۔سالک جمیل صاحب بھی کامیاب رہے ہیں۔محترمہ سیمیں کرن سے میں زیادہ واقف نہیں ہوں مگر چہارسو میں جتنے افسانے بھی نظر سے گزرے ہیں اُس میں اُن کی خلاقانہ سوچ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔زیرِ نظر افسانہ بھی آج کے دور کی بھرپور نمائندگی کر رہا ہے۔اور یہ نئی افسانہ نگار طیبہ ولایت خان کون ہے؟ ان کے بارے میں یہی کہنا چاہوں گا کہ اگر یہ ریاضت اور مطالعہ کرتی رہی تو مستقبل کا اہم نام بن سکتی ہے۔

تابش خانزادہ کے بارے کیا کہوں انہوں نے قاری کو ایسا جھپا مارا ہے کہ کوشش کے باوجود اُن کی گرفت سے قاری نکل نہیں سکتا اور اپنا سوہنا منڈا ڈاکٹر فیروز عالم جس سادگی اور سلاست سے طبّی مضامین سپردِ قلم کر رہا ہے میں سمجھتا ہوں چہارسو کے قارئین کے لیے یہ بہت بڑا تحفہ ہے۔آپا جمیلہ شبنم کے بارے کیا کہوں قدرت نے اُن کے قلم میں ایسی تاثیر رکھی ہے کہ پڑھنے والے پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔

شاعری بھی ہر بار کی طرح اس بار اعلیٰ معیار کی ہے۔منظر ایوبی، محمود الحسن، غالب عرفان، اختر شاہجہاں پوری، شاہین، تبسم انوار، عبداللہ جاوید، ڈاکٹر حسن منظر اور ڈاکٹر ریاض احمد کی شاعری نے بہت لطف دیا۔میری طرف سے دیپک کنول جی کو مبارکباد پہنچا دیجئے کہ انہوں نے نہایت کم وقت میں بہت ساری تفصیل سری دیوی کے بارے میں دے کر اہم فریضہ انجام دیا۔

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

پیارے گلزار صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو شمارہ مارچ اپریل بنام یونس شرر وصول ہوا۔آپ نے بیڑہ اٹھا یا ہوا ہے کہ آپ ان تمام اہلِ قلم کو قارئین سے متعارف کروائینگے جنکی نگارشات نے اردو ادب کو سجایا ہے اور وہ آنے والی صدیوں تک زندہ و جاوید رہینگی مگر جو بہ وجوہ خود پس منظر میں چلے گئے ہیں یونس شرر صاحب سن ساٹھ کی دہائی کا بہت معتبر نام تھے۔یہ بدقسمتی تھی کسی وجہ سے حیدرآباد سندھ اور سندھ یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والوں کو کل پاکستان کے تناظر میں بڑی پذیرائی نہیں مل سکی حالانکہ اس دور میں اردو ادب کے حوالے سے وہاں بڑا کام ہو رہا تھا۔میں خود اسی زمانے میں جام شورو حیدرآباد میں تھا اور مجھے شرر صاحب سے دور کی واقفیت تھی۔وہ طلبہ تنظیموں میں اور ادبی سرگرمیوں میں بیحد فعال تھے۔بحرحال آپ قابل ستائش ہیں کہ آپنے انہیں وہ عزت دی جس کے وہ بجاطور پر مستحق ہیں۔

اب شمارے کے دوسرے مندرجات کے متعلق کچھ۔۔۔سب سے پہلے تو آپ کے افسانے ''سینے میں چھپا سانپ'' پر اپنی رائے۔ایک تو آپ کمال کے عنوانات رکھتے ہیں جو قاری کو فوراً ہی جکڑ لیتا ہے۔اور پھر کہانی کی ابتدا ایسے جملوں سے ہوتی ہے جو شروع ہی میں جھٹکا لگا دیتے ہیں۔دو افراد کے درمیان مکالمہ پر مبنی یہ کہانی میرے لئے تو روح فرسا تھی اور یقین جانئے اسے پڑھ کر میرا تو دل دھڑکنے لگا تھا کیونکہ ایک ڈاکٹر ہونے کے لحاظ سے میں تو ڈر گیا تھا کہ کہانی کہاں جا کر اختتام پذیر ہوگی، شروع کی علامات اور پھر ان علامات کا رفتہ رفتہ آگے بڑھنا میرا دل دھڑکا رہا تھا اور میں اس معصوم بچے کی زندگی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔مجھے اس کہانی نے اس قدر متاثر کیا تھا کہ میں اس میں الجھ کر رہ گیا تھا ایک ڈاکٹر ہونے کے لحاظ سے مریض کا جگہ جگہ ٹھوکریں کھانا، محلے کی فارمیسی سے جن اور بھوت اتارنے تک جو اسکو اور اسکے کنبے کے ساتھ ہوا اس سے میرا سر شرم سے جھک گیا۔خاص اس وجہ سے کہ ایسا ہوتا ہے، پاکستان میں یہ دن رات ہوتا ہے اور مریض اور اسکے لواحقین اسی طرح دربدر کی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔آپ نے کمال سچائی سے اس کی تصویر کشی کی ہے۔ہمیں میڈیکل کالج میں بہت سی چیزوں کے ساتھ یہ سختی سے سکھایا گیا تھا کہ اپنی حدود کو پہچانو اور شروع ہی میں یہ سمجھ لو کہ یہ معاملہ ہماری صلاحیت سے باہر ہے۔وقت اور پیسے کے زیاں سے پہلے مریض کو فوراً کسی ایسے سنٹر میں منتقل کرو جہاں

مریض کو بروقت تشخیص اور طبی امداد بہم پہنچائی جاسکے۔ یہ اس بچے کے ساتھ نہیں ہو سکا۔ کاش ''نکڑ'' پر دکان کھولے ڈاکٹر یہ جان لیں کہ تشخیص اور علاج میں لمحوں لمحوں کی دیر زندگی اور موت کے درمیان فرق کے برابر ہے۔ آپ نے بڑی چابک دستی سے کہانی کو ''ایک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا'' کے مصداق ایسے موڑ پر ختم کیا کہ اس کا بار قاری ہی پر ڈال دیا کہ پھر کیا ہوا۔ کیا خوب۔ آپ کے انداز بیان پر بس اس قدر ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے قاری کی نگاہوں کے سامنے ایک فلم چلا دی ہے اور تمام واقعات ایسے لگتے ہیں کہ وہ اسکی نظروں کے سامنے ہو رہے ہوں۔۔اس قیامت خیز کہانی کے لئے مبارکباد۔

دیگر مشمولات میں آپا جمیلہ شبنم کا کاروان مصطفی بہت ہی دل کو چھو لینا والا رپورتاژ ہے، یونس جاوید کا فرانس بڑ واقعتی ہمارے منہ پر تماچہ ہے، میں بھی یہی کچھ نجی محفلوں میں کہتا ہوں اور ''ہم'' جو خود پر تنقید نہیں برداشت کر سکتے میرے منہ پر طمانچہ مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ تسنیم کوثر صاحبہ کی تحریر بہت ہی متاثر کن تھی جو انکی یادوں پر مشتمل تھی مگر افسانے کی تعریف پر پوری نہیں اترتی۔ ''نوری'' پڑھ کر واجدہ تبسم اور عصمت یاد آ گئیں۔ آغا قزلباش کا دل کا ٹکڑا بہت خوب تھا۔ دیگر تحاریر معیاری تھیں۔ میں نوید سروش، ڈاکٹر ریاض، یوگی بھائی صاحب، رینو بہن اور دیگر کا احسان مند ہوں کہ وہ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

نوٹ: ہوسکتا ہے کہ قارئین نے ''پولیو'' کو بعد از وقت قرار دیا ہو مگر آج ہی ڈان اخبار میں پڑھا کہ اس سیزن کا پہلا کیس بلوچستان میں پایا گیا ہے۔ اب یہ بچہ زندگی بھر سڑکوں پر رینگے گا۔

فیروز عالم (یو۔ایس۔اے)

ڈیئر جاوید بھائی، سلام مسنون۔

چہارسو جب بھی ملتا ہے تو میں اُس میں کھو جاتا ہے۔ پسند کی اتنی چیزیں ہوتی ہیں کہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کسے اوّلیت دی جائے۔ آپ نے یونس شرر صاحب کی بابت بہت سارا مواد جمع کر کے ہم جیسوں کے لیے بہت سہولت پیدا کر دی بلکہ میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ایک طرح سے دعوت شیراز کا اہتمام کر ڈالا۔

آج کل یہاں ٹارگٹ کیلنگز کا موسم چل رہا ہے۔ سرکاری اہلکار کسی بھی شخص پر گولی چلا سکتا ہے۔ اس خوف و دہشت کی فضا میں لکھنے پڑھنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ یہی سبب ہے کہ سال بھر میں چند ایک ہی افسانے لکھ پایا ہوں۔ جبکہ ناول توجہ چاہتا ہے، یکسوئی اور مکمل ذہنی مرکزیت۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ لوگ پرسکون اور پُر امن علاقے میں رہتے ہیں۔ دعا کیجیے کہ ہمارے ہاں بلکہ پورے پاکستان میں امن و امان قائم ہو۔

آغا گل (کوئٹہ)

جناب گلزار صاحب، السلام علیکم۔

اس بار آپ نے اپنے معتبر رسالے ''چہارسو'' میں پروفیسر یونس شرر کو قرطاسِ اعزاز پیش کر کے نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا میں اردو کے شیدائیوں کے دل جیت لیے ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ شرر صاحب ہمارے درمیان نیویارک میں رہتے ہیں۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ۲۰۱۱ء میں میری تیسری کتاب ''بساط'' کی تقریب رونمائی کی صدارت شرر صاحب نے فرمائی تھی۔ چہارسو کی یہ اشاعت ایک رسالہ بلکہ پھولوں کا خوبصورت گلدستہ ہے۔ آپ نے جس محنت اور جانفشانی سے شرر صاحب پر مضامین جمع کیے اور بہترین کلام کا انتخاب شائع کیا اس کے لیے ہم اردو والے آپ کے احسان مند ہیں۔ آپ اور چہارسو کا نام آج کل نیویارک میں گونج رہا ہے۔ عزیزہ فرح کامران نے آپ کی کاوش کو نہایت عمدہ الفاظ میں فیس بک پر بھی سراہا ہے۔

جمیل عثمان (نیویارک)

محترم گلزار جاوید، سلام مسنون۔

چہارسو باقاعدگی سے موصول ہو رہا ہے جسے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ اس بار پروفیسر یونس شرر کے بارے میں تفصیلات پڑھ کر بہت سی نئی باتیں علم میں آئیں۔ پچھلی بار مسرور جہاں کا گوشہ بھی بھرپور تھا۔ ماشاء اللہ انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ کیسے کر لیا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

مسرور جہاں کا افسانہ ''خواب در خواب'' بہت دلگداز ہے۔ بہت سے بدنصیبوں کا ہجرت کا موسم ختم ہی نہیں ہوتا۔ دوسرا افسانہ ''کہاں کا عشق'' میں مرد کی فطرت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ ہم اپنی نانی دادیوں سے ایک محاورہ سنا کرتے تھے ''بیوی کی موت اور کہنی کی چوٹ'' محسوس بہت ہوتی ہے لیکن درد بھی جلد ختم ہو جاتا ہے۔ پھر بھی سبھی مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ دیگر افسانے بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں جیسے انگوٹھی میں جڑے نگینے۔ شموئل احمد کا ''چھُوا کا حلالہ'' حقیقت کے قریب افسانہ ہے۔ اس دنیا میں غریبوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا ہے کیونکہ معاملہ غریب کی جورو سب کی جورو والا جو ہوا۔ نیئر اقبال کا افسانہ ''محبت''، مشتاق اعظمی کا ''وہ ایک لمحہ'' عمدہ افسانے ہیں۔

زہریلا انسان بہت دلچسپ اور پُر اسرار ناول ہے۔ دل چاہتا ہے جلد سے جلد انجام معلوم ہو جائے۔ ''ایک صدی کا قصہ'' دیپک کنول کا بے حد معمولات افزا سلسلہ ہے۔ ہر بار وہ کسی ایک اداکار کی زندگی کے سبھی گوشوں سے روشناس کراتے ہیں جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اداکاروں کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ افسانے سبھی قابلِ تعریف ہیں مگر ''سینے میں چھپا سانپ'' اپنی طرز کا نہایت منفرد افسانہ ہے جس کا بیان بھی قاری کو باندھے رکھتا ہے۔

سیما پیروز (لاہور)

گلزار بھائی، السلام علیکم۔

گزشتہ کل حلقہ ارباب ذوق نیویارک کے تحت چہارسو یونس شرر نمبر کی رونمائی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ شرکاء کی تعداد بھی کافی تھی اور سبھی نے دل کھول کر آپ کی کاوش کی پذیرائی کی اور آپ کے انداز کو پسند بھی بہت کیا۔ تقریب بہت سے حوالوں سے یادگار رہی جس نے شرر صاحب کو بھی بہت خوش کیا۔ تخلیق کار کو اس کے علاوہ دیا بھی کیا جا سکتا ہے آپ نے تو عملی طور پر شرر

صاحب کی بہت خدمت کی ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں بس اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ آپ کو اس کارِ خیر کے لیے جزائے خیر عطا فرمائے۔

فرح کامران (نیویارک)

پیارے بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسوٗ'' کے تازہ شمارے کے ساتھ آپ کا محبت نامہ جو ایک تعزیت نامے سے زیادہ دل سے دل کی راہ کا ثبوت تھا ملا۔ میری مرحومہ بیٹی کے غم کو تازہ کر گیا ٹھیک ہے کہ آپ کے الفاظ یقیناً دلی ہمدردی کے ثبوت تھے لیکن ''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں''! گلزار بھائی آپ بھی اس طرح کے غموں کو سہہ چکے ہیں لیکن بھلا ''موت سے کس کو رستگاری ہے؟'' اللہ آپ کی محبت کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین ثم آمین

یونس شرر کے نام قرطاسِ اعزاز کا مطالعہ میرے لیے معلومات کا خزانہ نکلا لیکن ''خواب آنکھیں'' یوم ولادت/ تاریخ ولادت سے آنکھیں چرا گئیں۔ اس کا سبب تو یقیناً خود یونس شرر ہی ہوں گے۔ خاکہ نگاری کے مشہور نام نے جو تحریر ''اُداس کا شام کا نوحہ گر'' میں تحریر کی ہے وہ شرر صاحب کی ذات باصفات کی توضیح ہے۔ پھر محترمہ صفورا الخیری کا ''ہم جماعت ہم سخن'' بھی مختصر لیکن جامع تعارف تھا۔ شہناز خانم عابدی کے تینوں افسانچے ایک سے بڑھ کر ایک تھے جو دل کو چھوتے ہوئے گزرے۔ گذشتہ شمارے میں بھی آپ نے افسانچوں کا اعلیٰ معیار برتا تھا۔

''یوم الحساب'' یسٰین احمد کا ایسا افسانہ تھا جس میں میاں بیوی کے تعلق کی اصل قرآن شریف کے الفاظ ''تم ایک دوسرے کا لباس ہو'' کی توجیح و توضیح کی گئی ہے۔ آپ کو ایسا افسانہ چھاپنے اور محبی یسٰین احمد کو اتنا خوبصورت افسانہ لکھنے کی مبارکباد پیش ہے۔ آج کے جعلی پیروں کا پردہ چاک کرتا ہوا افسانہ ''سینے میں چھپا سانپ'' پسند آیا جو ہے تو قدرے طویل مگر افسانے کی بنت کا تقاضا بھی تھا اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ سید تقی عابدی نے شاعر برق وآشیاں ''سعید شہیدی'' پر جو بھی لکھا وہ کم لکھا نہ معلوم یہ بزرگ شاعر اب تک حیات ہیں یا نہیں۔ مجھے حیدرآباد (دکن) میں قیام کے دوران کئی بار ان کے کلام سے محظوظ ہونے کا موقع ملا تھا نہ صرف شاعری بلکہ بلا خیز ترنم بھی اُن کے برق وآشیاں کی شان تھی۔ دیپک کنول نے حسبِ معمول سری دیوی کی زندگی پر روشنی ڈالی لیکن اتنی خوبصورت اور جاندار اداکاری کی حامل اس ساحرہ کا قصہ مختصر مختصر لگا۔ ڈاکٹر یونس جاوید نے تاریخ کا طمانچہ جو ہماری قوم کو رسید کیا ہے وہ لمحہ فکریہ ہے کاش یہ ضرب ہمارے دماغوں کی چولیں ہلا سکے۔

غالب عرفان (کراچی)

اچھے بھائی گلزار جاوید، سلامت رہو۔

''چہارسوٗ'' مارچ اپریل ۲۰۱۸ء موصول ہوا۔ یادآوری کا شکریہ۔ جوں جوں اس کے صفحات پر دل ودماغ کے کارناموں کو وقفے وقفے سے دیکھوں گا آپ کا شکریہ ادا کروں گا کہ دنیا میں ہمارے وہی عزیز ہم سے خالص کرم فرمائی کرتے ہیں جو ہمیں ہماری ذاتی زندگی سے پرے دھکیل کر فنکاروں، قلم کاروں کی نگارشات میں دائیں بائیں اور سامنے پیچھے کے کرداروں اور واقعات سے بہرہ ور کرتے ہیں۔ اور ہمیں سانس لینے کا حوصلہ دیتے ہیں۔

طفیل اختر (لاہور)

مدیرِ محترم، سلام مسنون۔

محترمہ مسرور جہاں کا قرطاسِ اعزاز ''چہارسوٗ'' کے تخلیقی و تہذیبی، علمی وادبی تسلسل کا گرانقدر اضافہ ہے۔ کاروانِ مصطفیٰ ایسے مقدس سفر کا احوال پڑھ کر اپنے ایسے ہی سفر یاد آجاتے ہیں جو روحانی سرشاری اور وجدانی کیف سے معمور کئے رکھتے ہیں بلاشبہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ خصوصی فضل وکرم التفاتِ الٰہی سے ہی میسر آتا ہے۔

''واہ جائے خوب است'' کے حیرت انگیز انکشافات سے مطالعہ دلچسپ ہو گیا اور واقعی ٹیکسلا میوزیم کی سیر کو جاتے ہوئے واہ کا پرسکون ماحول اور آتش کا مصرعہ ''ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں'' دونوں ہی متاثر کرتے ہیں۔ آفاقی اقدار سے سجی گلزار صاحب کی نظم کتابیں پڑھ کر ہمیشہ کی طرح یہ احساس تروتازہ اور یقین بے اندازہ ہو گیا کہ کتابیں صرف پیار ہی نہیں کرتیں بلکہ اپنی بے اعتنائی و کم التفاتی سے مغموم ومتاسف بھی ہوتی ہیں۔ ''پس اشک'' کا نہایت توجہ طلب پہلو مسلم معاشرے سے نسوانی تعلیم وتربیت اور اس کی ترغیب وتدریس کے لیے جدوجہد کرتے رہنا ہے جو ہمیشہ سے ہی وقت کی بہت اہم ضرورت رہی ہے۔

امرتا پریتم جی کا خاکہ متعلقہ خصوصیات پہ محیط اچھا تاثراتی مضمون ہے جس میں نئے لکھاریوں کے لیے ان کا فراخدلانہ رویہ بھی شامل ہے۔ ''پولیو'' سے متعلق نہایت ہی معلومات افزا مفید اور تدارک کی آگہی لیے ہوئے مضمون تھا خدا کرے کہ سب اس سے مستفید ہوں اور صحت محافظ کے لیے ہر گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں تاکہ پاک سرزمین پولیو سے مستقل طور پر پاک ہو جائے۔ بساطِ بشاشت طنز ومزاح کا خوشگوار امتزاج ہے۔ موجودہ رس رابطے میں سورۃ التین کی بجائے سہواً سورۃ الم نشرح لکھا گیا۔۔۔ اعتذار۔ موجودہ شمارے میں ہی غزل کے دوسرے شعر کی درست ترتیب یوں ہے:

''جب طے ہے ہو چکا تو پھر رکھتا حجاب کیا''

شگفتہ نازلی (لاہور)

ہمیشہ کھلے رہنے والے عزیز گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

گل نظر، خوشبو افتاد ''چہارسوٗ'' ملا ہے۔ اس کے مطالعے سے دلی مراد برآئی ہے۔ آپ جانیں دلی مراد حسنِ مطالعہ کے علاوہ کچھ اور نہیں قرطاسِ اعزاز پروفیسر یونس شرر کے نام سے موٗنی اور موٗمنی قدروں کا حامل ہے۔ ''شرر ساماں''

شاعری دیکھی اور پڑھی لطف آیا۔غزلوں کے بعض شعر تو دل میں اترے جاتے ہیں اور دماغ کے ہوکر رہ جاتے ہیں جیسے یہ شعر:

نرم ہالا چاند کا تنہائی اور جنگل کی شام
رتجگوں کے سائباں میں خواب کا سا اہتمام

''اداس شاموں کے نوحہ گر'' کی شرر انگیز ''روشن امکانات کی شاعری'' دور سے دیکھو تو عجیب ، قریب سے دیکھو تو غریب ہے یعنی عجیب و غریب۔ یہ نرالا پن یونس شرر کی فطری اخلاص مندی میں بھرا پڑا ہے۔افسانے چہارسو رنگ ہیں۔جو سمجھ میں نہ آئے اسے پھر پڑھتا ہوں''سینے میں چھپا سانپ'' خاصا رنگین ہے ڈر ہے کہیں خواب میں آ کر ڈس ہی نہ جائے۔شاعری کے انتخاب میں آپ کا ذہن رسا کارگر ہے بلکہ کارفرما ہے۔سری دیوی سے متعلق ''جذباتیہ'' دوبار پڑھا دیپک کنول پسند کے موضوع پر جی جان سے فدا ہو جاتے ہیں۔ان کے قلم کی کاٹ دل کو لگتی ہے۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

برادرم گلزار صاحب، آداب۔

اردو کے چاہنے والوں کا ہر دل عزیز''چہارسو'' کا تازہ شمارہ برائے ماہ مارچ اپریل ۲۰۱۸ء موصول ہوا۔ پڑھ کر دل کی ادبی تشنگی کو راحت سی محسوس ہوئی۔غزلوں نظموں کے علاوہ مضامین اور افسانوں نے اپنے اچھوتے رنگ سے اپنا اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کیا۔قارئین کے خطوط معلوماتی اور اصلاح پر مبنی ہونے کی صورت میں اپنا تاثر چھوڑتے ہیں۔دیپک کنول جی کا مستقل فلمی کالم ہر بار کی طرح اس بار سری دیوی کی داستاں زندگی پر قابل غور ہے۔خدا اُسے جنت نصیب کرے۔

افسانوں میں ''دل کا ٹکڑا'' جہاں ایک ماں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے دل کو جھنجھوڑتا ہے وہاں دوسری جانب آپ کے افسانے''سینے میں چھپا سانپ'' نے قارئین کے دل میں ایک گدگدی سی پیدا کرتے ہوئے نیم حکیم کے کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ بیماری پاکستان میں ہی نہیں ہندوستان میں بھی اسی طرح پھیلی ہوئی ہے۔قدم قدم پر ہر بشر اپنے آپ کو ڈاکٹر تصور کرتے ہوئے ایک بیمار کو نجات تو کیا آخر میں تانترکوں کی جھولی میں ڈال کر اُسے جہنم تک پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں۔''گلی کے اُس پار'' اور ''نوری'' دونوں افسانے موجودہ دور کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔کم سن بچیوں پر جو ظلم آج ہمارے سماج میں ہو رہا ہے فرح کامران کی نظم ''ہائے زینب'' میں اُس درد کو اپنے قلم سے لفظوں میں بیان کر کے داد کی حق دار ہیں۔ڈاکٹر ریاض احمد کی نظم بھی ماں باپ کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ آپ نے جس محنت اور لگن سے ''چہارسو'' پروسا ہے پڑھ کر مسرت ہوئی یا یوں کہیے کہ بھارت اور پاکستان کے علاوہ غیر ممالک سے بھی ادبی تحفے تحریر کے طور پر نصیب ہوتے ہیں۔ڈاکٹر فیروز عالم کا کالم بیماریوں سے آگاہی کراتے ہوئے ایک اچھا مددگار ثابت ہوتا ہے۔

امرناتھ دھمیجہ (لدھیانہ، بھارت)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ اپنے علمی و ادبی وقار کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ آپ نے ایک گمشدہ نگینے کو چمک دمک کے ساتھ قرطاسِ اعزاز عطا کیا ہے۔ پچھلے بیس برسوں میں ادب میں شامل ہونے والے طلبہ و قارئین کے لیے یونس شرر صاحب کا گوشہ تحفۂ خاص ہے۔''براہِ راست'' میں علم و ادب کے علاوہ سماجیات، سیاسیات اور مختلف نظریات پر مفید معلومات، آپ کے سوالات کے طفیل ملی ہیں۔میں اُن کے اس نظریے سے متفق ہوں:

''میرا خیال ہے مجیب کے چھے نکات مان لیے جاتے تو پاکستان نہ ٹوٹتا۔''(ص۔۱۰)

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ، ڈاکٹر اسلم فرخی، نیئر جہاں، واصف حسین واصف اور دیگر کی تحریریں یونس شرر صاحب کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف ہے وہاں یہ تحریریں کسی اعزاز سے بھی کم نہیں۔ یہ مضامین صاحبِ گوشہ کے فکر و فن کی تفہیم اور امکانات کو روشن کرتے ہیں۔فاری شانے غزلوں اور عطیہ سکندر علی نے نظموں کا انتخاب محنت سے کیا ہے۔موضوعات کا خاص خیال رکھا ہے۔مقتل میں کہاں رکنا، زمین کا نوحہ، ذلت کا قرض وغیرہ میں ہمارے سماج کی معاشرتی اور سیاسی تلخیاں ہیں۔

ڈاکٹر اختر آزاد کا افسانہ''اسکین'' معاشرے کے ایک اہم شعبے کی شرمناک پستی کا ترجمان ہے۔ ہمارے ملک میں بھی بعض یونیورسٹی سے ایسی خبریں آتی رہتی ہیں۔سلیم آغا قزلباش کا افسانہ''دل کا ٹکڑا'' بھی ایک تکلیف دہ کہانی اس لیے ہے ہم بے حسی کی کس منزل پر کھڑے ہیں۔افسانے کے اختتام پر اُمید کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔تسنیم کوثر کا افسانہ B.I.G.M.86 ایک الگ فضا کا خوبصورت افسانہ ہے۔تسنیم کوثر کے ہاں موضوعات کا تنوع انہیں تازہ دم رکھتا ہے۔بھائی گلزار جاوید کے افسانوں کی موجودہ عہد میں سب سے بڑی خوبی موضوع کو انفرادیت عطا کرنا ہے۔اہم موضوعات کو اتنی آسانی اور روانی سے کہانی کا روپ دیتے ہیں قارئین تحریر کی خوبصورت گرفت سے آخر تک نہیں چھوٹ نہیں پاتا۔''سینے میں چھپا سانپ'' انہوں نے جس مہارت سے ڈاکٹر ز، ہومیو، حکیموں، فقیروں اور لیبارٹریز کی لوٹ مار اور مریض اور اُس کے والد کی شرافت اور بے بسی نمایاں کی ہے وہ لاجواب ہے۔ایسی تلخ حقیقت کے باوجود تحریر کو بوجھل نہیں ہونے دیا۔سید محمد عباس کاظمی نے''بلتستان کی امراؤ جان ادا'' کی داستان ایک عجیب کیفیت سے بیان کی ہے۔تحریر کی داد دینی پڑے گی۔

عبد اللہ جاوید کی نظم ''تاراج بستیاں'' حسن منظر کی ''صیہونی حکم نامہ'' اور فیصل عظیم کی نظم''عالم سوز''، نظمیں کیا ہیں ہمارے سماجی اور سیاسی نوحے ہین۔ان نظموں کی فکری بالیدگی کمال کی ہے۔فرح کامران نے''ہائے زینب'' میں روح کو تڑپا دیا ہے۔انجم جاوید کی نظم''حسنِ فطرت'' سے تازگی محسوس ہوئی۔

خطوط میں غالب عرفان، رینو بہل اور آغا گل کے خط بہت اہم ہیں۔ نیئر اقبال علوی صاحب کا شکریہ۔

نوید سروش (میرپورخاص)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

مارچ اپریل ۲۰۱۸ء کا چہارسوایک ایسی شخصیت سے موسوم ہے جو شعلہ بیان مقرر ہیں اور طلبہ تحریکوں اور بعد میں سیاسی جماعت سے منسلک رہنے کے باعث کراچی کے ایک بڑے اور تاریخی جلسۂ عام میں مادرِملت فاطمہ جناح کی تقریر کے دوران کرسی صدارت پر براجمان تھے۔

یونس شرر گزشتہ نصف صدی سے ہنگامہ خیز زندگی بسر کرنے اور انقلابی فکر کے ساتھ احساس کی نزاکت، عصری آگہی، مشاہدہ کی وسعت، تشبیہات، استعارات کے ذریعہ نظم وغزل کی زبان میں تا دیر زندہ رہنے والی شاعری کے میدان میں کارفرما ہیں اور ایک بلند مقام پر فائز ہیں۔ ان کی دلچسپ شخصیت کے یہ تمام پہلو قارئین کی نذر کرنے پر آپ شکریہ کے مستحق ہیں۔ یونس شرر کی شخصیت کے مختلف پہلوان کے ہی اس شعر میں پرو دیئے گئے ہیں:

ابر ، سایہ، دھوپ ، بجلی اور بادل کی گرج
اب یہ سارے رنگ برساتوں کے مجھ میں آ گئے

شمارہ میں بہت اچھے افسانے اور شاعرانہ کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر اختر آزاد کا افسانہ ''اسکین'' معاشرہ میں کالی بھیڑوں کی کہانی ہے جو اعلیٰ تعلیم تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن اخلاقی طور پر نہایت گھٹیا زندگی بسر کرنا ان کا مقدر ہوتا ہے۔

سلیم آغا قزلباش نے ''دل کا ٹکڑا'' لکھ کر ایک ماں کی شدید جذباتی کشمکش کا منظر پیش کیا ہے جو نفسیاتی عوامل کی بدولت اس کی شخصیت بدل دیتی ہے۔ مشتاق احمد وانی نے ''آثارِ قیامت'' میں برتی فوج کے ہاتھوں رونگٹے کھڑے کر دینے والے اندوہناک مظالم کا منظر نامہ لکھا یہ جو وہاں کے مسلمان بچوں، عورتوں اور مردوں پر کئی سال سے بلا روک ٹوک جاری ہے۔ جن سے ہر دردِ دل رکھنے والا انسان شدید متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سیمیں کرن کا افسانہ ''گلی کے اُس پار'' میں معاشرہ میں اخلاقی قدروں سے عاری لوگوں کے سامنے اور درمیان سے گزرتے ہوئے ان معصوم بیٹیوں کے انجانے خوف کا منظر پیش کرتا ہے جو نہایت نفسیاتی اور جذباتی کیفیت پر مشتمل ہے اور جس سے اکثر گھر میں بیٹھے ہوئے والدین وغیرہ بے خبر رہتے ہیں۔ سالک جمیل براڑ نے ''جیون داتا'' میں سیکولر انڈیا میں ہندو اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں کے خوف کے سایہ میں گزرتی ہوئی زندگی اور بلوائیوں کے حملوں میں قتل وغارت کی تصویر کشی کی ہے کاش انسان دوسرے مذاہب والوں کے حالات وجذبات کو اپنوں کی طرح سمجھنا اور تعاون کرنا سیکھ لے۔ شاید انہی خدشات کے پیشِ نظر بزرگ رہنما نے قراردادِ پاکستان منظور کر کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے قیام کو ممکن بنایا مگر ان کروڑوں مسلمانوں کا کیا کیا جائے جواب بھی انڈیا میں ہندوؤں کے رحم وکرم پر ہیں گو کہ ان میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں مگر وہ بھی اقلیت میں ہیں۔

''نوری'' افسانہ میں طیبہ ولایت خان نے گھریلوں ملازموں کی کئی باتوں اور خفیہ حرکات وسکنات کا جس تفصیل سے ذکر کیا ہے اس نے تو ہر ملازم کو مشکوک بنا کر ایک کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے۔ معلوم نہیں یہ معلومات انہیں کیسے ملیں یا تصوراتی انداز میں انہیں کہانی کا مواد بنایا گیا ہے۔ جیسا بھی ہو یہ منظر نامہ افسوس ناک ہے اور سب کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔

یسٰین احمد نے ''یوم الحساب'' کے نام سے جو کہانی لکھی ہے بہت دلچسپ اور جذباتی لمحات کا بیانیہ ہے ایک وفا شعار بیوی نے بیس سال کا عرصہ نہایت خوبی سے اپنے بچے کی صحیح پرورش اور سسرال کی مخلصانہ خدمت کرتے ہوئے فرض شناسی کی عمدہ مثال پیش کی مگر اُس کا شوہر مالی حالات اچھے ہونے کے باوجود مزید کمائی کی خاطر بیوی کو جلد بلانے کا وعدہ کر کے امریکہ چلا گیا اور اس طرح بیس سال ٹال مٹول کرتے کرتے وہیں گزار دیئے۔ جس کے بعد اُس کی واپسی کے دن بیوی کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا کیونکہ بیس سال کے رت جگے، تنہائیاں اور آنسوؤں کی کوئی بھی قیمت یہ سب کچھ نہیں بھلا سکتی تھی اور اُس نے گلہ شکوہ کر کے تلخی پیدا کرنے کے بجائے انتہائی قدم شوہر کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی اُٹھا لیا جو دل پر بہت اثر انداز ہوتا ہے۔ کہانی میں عبرت اور سبق قابلِ غور ہے۔

آپ نے اپنے افسانہ ''سینے میں چھپا سانپ'' میں انتہائی دلچسپ اور انوکھے انداز میں معاشرہ کے ایک اہم مسئلہ کو اجاگر کیا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں توہم پرستی اور ناخواندگی نے کئی مسائل کو جنم دیا ہے۔ ہمارے ہاں بے شمار افراد علاج کے لیے پیروں فقیروں، عاملوں اور مزاروں کا رخ کرتے ہیں اور اپنے مسائل میں اضافہ کر کے انہیں شدید تر بنا دیتے ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار نوجوان عقیل ہے جس کے سر درد کا علاج ماں نے اسپرو کی گولی سے شروع کیا اور پھر مختلف ڈاکٹروں، ہومیو پیتھ اور حکیموں کے علاج ومشورہ سے گزرتے ہوئے بات جعلی پیروں اور عاملوں تک جا پہنچی۔ اگر اچانک پولیس وہاں نہ پہنچتی تو جسم سے بدروح نکالنے کے لیے زنجیروں میں جکڑے کوڑے کھاتے کھاتے یہ طریقہ علاج اُسے زندگی کی قید سے ہی آزاد کر دیتا مگر پولیس کا سُنتے ہی یہ نام نہاد عامل فرار ہو گئے۔ یہ کہانی عوام الناس کی آگاہی کے لیے ایک بہترین کاوش ہے اور اس اہم مسئلہ کی ترجمانی اس سے بہتر طور پر شاید ہی کی جا سکتی ہو۔

'بلتستان کی امراؤ جان ادا'' سکردو سے سید محمد عباس کاظمی نے ایک حیرت انگیز اور سچی داستان قارئین کے لیے تحریر کی ہے جس سے پہلے اکثریت لاعلم تھی۔ جس تفصیل وانداز میں اُنہوں نے تمام داستان رقم کی ہے وہ بہت متاثر کن اور قابلِ تعریف ہے۔ البتہ اس المیہ کہانی کو پڑھنے والے محسوس کرتے ہوں گے کہ یہ پہلی امراؤ جان ادا کے مقابلے میں کہیں زیادہ جذباتی اور المناک واقعات کا ایسا تسلسل ہے جو اگر ایک فلم کی صورت میں پیش کیا جائے تو دیکھنے والوں کا رش تصور میں لایا جا سکتا ہے۔ کاظمی صاحب کا شکریہ کہ انہوں نے اس

تمام واقعہ سے ہموطنوں کو آگاہ کیا جسے پڑھ کر دکھ بھی ہوتا ہے اور حیرت بھی۔

آپا جمیلہ شبنم کا سفرنامہ ''کاروانِ مصطفیٰ'' عقیدت اور روحانی محبت کے پھول لئے قارئین کے لیے بہت دلچسپ پیرایہ میں تحریر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے ''الزہائمر'' یا مرضِ نسیاں عوام کی آگاہی کے لیے بہتر انداز میں جو معلوماتی مضمون لکھا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔

شاعری میں اچھا کلام شامل کیا گیا ہے جس میں پروفیسر یونس شرر، شاہین، عرش صہبائی، حیدر قریشی، رؤف خیر، ایم کے بھان تمنا، رومانہ رومی، عبداللہ جاوید اور امرناتھ دھمیجہ شامل ہیں۔ اس سارے کٹھن اور محنت طلب عمل سے گزر کر نیا شمارہ قارئینِ چہارسو کی نذر کرنے پر آپ بجا طور پر شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

گلزار جاوید صاحب، آداب۔

چہارسو کا حالیہ شمارہ جناب یونس شرر کے نام سے منسوب ہوا ہے۔ سوالات کے جواب دیتے ہوئے شرر صاحب نے قمر علی عباسی (مرحوم) کے لیے جو زبان و بیان اختیار کیا اُسے پڑھ کر حیرت اور صدمہ ہوا۔ اول تو سوال کے جواب میں قمر علی عباسی کو گھسیٹنا ہی زیادتی ہے۔ جواب من وعن اُسی طرح دیا جا سکتا تھا بغیر اُن کا نام شامل کیے:

وہ بات سارے فسانے میں جسکا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

اُس تحریر کو پڑھیں تو قمر علی عباسی نے کہیں نہیں لکھا ہے کہ مرحومہ عذرا پروین کے خلاف الیکشن لڑا گیا بلکہ یہ بتایا کہ یونس شرر جب یونیورسٹی کے الیکشن میں کھڑے ہوئے تو کتنی جانفشانی سے عذرا پروین صاحبہ نے اُن کو جتوانے کے لیے کیمپینز میں حصہ لیا۔ کسی بھی الیکشن میں اپنے پسندیدہ اُمیدوار کو جتوانے کے لیے کوئی بھی کام کر سکتا ہے اس میں سینئر جونیئر کی تخصیص نہیں ہوتی۔ ایک اور سوال کے جواب میں شرر صاحب نے قمر علی عباسی کی ''نفسیات'' کی جس طرح تشریح کی ہے کاش وہ اپنے بیان اور زبان پر توجہ کر لیتے۔ قمر علی عباسی ہمیشہ وکٹری اسٹینڈ پر کھڑے رہے۔ اپنے زمانے کے سندھ یونیورسٹی کے پسندیدہ ترین طالب علم، تقریری مقابلوں میں ڈھیروں انعامات، ٹرافیاں حاصل کرنے والے، پبلک سروس کمیشن سے منتخب ہو کر ریڈیو پاکستان کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہے۔ اخبار جنگ میں کالم کی ابتدا کی تو ۱۹۹۲ء میں وزیر اعظم پاکستان سے بہترین کالم نگار APNSV ایوارڈ حاصل کیا، پانچ مرتبہ رائٹرز گلڈ ایوارڈ ملا اور ۲۰۰۰ء میں صدرِ پاکستان نے تمغہ امتیاز سے نوازا۔ دیگر اعزازات ان گنت ہیں۔ بتیس (۳۲) سفرنامے تحریر کر کے اردو زبان میں سفرناموں کو نئی زندگی دی۔ پچاس کے قریب کتابیں تحریر کیں۔ ان Achievements کا نہ وہ ذکر کرتے نہ نازاں ہوتے ہمیشہ یہی کہتے میں اس قابل ہرگز نہ تھا جتنا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نوازا۔ ہر ایک کو پڑھنے اور لکھنے کی ترغیب دیتے کسی کی بھی کتاب چھپ کر آتی تو اس طرح خوش ہوتے جیسے یہ ان کی اپنی کتاب ہو۔ جس شخص کی سوچ اور رویہ یہ ہو وہ بھلا کسی سے کیسے عناد رکھ سکتا ہے۔ قمر علی عباسی کا اپنا اشاعتی ادارہ تھا جس کے زیرِ اہتمام معیاری کتب اور رسائل شائع ہوتے۔ پاکستان میں بچوں کے لیے کیسٹ کہانی کا اجراء بھی پہلی بار انہوں نے کیا۔ بچوں کے ادب کے حوالے سے کئی ایوارڈ ملے۔

قمر علی عباسی کراچی سے نیویارک پہنچے تو اہلِ نیویارک نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ صحافی اخبارات کے ایڈیٹرز، رائٹرز نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس طرح پذیرائی کی کہ نیویارک میں ہونے والی ہر ادبی تقریب کی صدارت یہ کرتے لوگ انہیں ''قمر علی عباسی'' کی جگہ ''صدر علی عباسی'' کہتے۔ ان کی تقریریں سننے دُور دُور سے آتے اور یہی بات یہاں رہنے والے کچھ حضرات کو بالکل پسند نہیں آئی اور برسہا برس سے یہاں تھے مگر جو اسٹارڈم اللہ تعالیٰ نے قمر علی عباسی کے حصے میں رکھ دی تھی وہ ان کو نہیں ملی۔ اپنے منفی جذبات اور خواہشات کا اظہار عجیب انداز سے کرنے لگے۔ قمر علی عباسی کے کالم دنیا میں چھپنے والے تقریباً تمام اخباروں میں چھپتے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ ان کے لیے کیوں نہیں لکھتے جو بلاوجہ آپ کے لیے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں ''میں اُن میں سے نہیں ہوں''۔ چھ لفظوں میں اُنہوں نے کہانی ختم کر دی۔ اُنہوں نے اپنے قلم سے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی۔

''یونس شرر۔ یاروں کا یار'' یہ عنوان ہے قمر علی عباسی کی تحریر کا لکھتے ہیں ''یونس شرر کا شمار سندھ یونیورسٹی کے چند ذہین اور ممتاز طلباء میں ہوتا ہے، یہ شعلہ بیان مقرر، آتش نفس شاعر، پر جوش لیڈر اور ایک مخلص انسان ہے، ہمارا اس کا ساتھ برسہا برس کا ہے۔ یونیورسٹی آتے ہی یونس شرر نے اسٹوڈنٹ یونین کا انتخاب لڑا اور بُری طرح ہار گیا۔ اس موقع پر ہم نے ایک شعر کہا:

مجبوریوں پہ اس کے سوا کچھ نہ ہو سکا
یونس شرر کو ووٹ دیا اور رو دیئے

اس کی گونج بہت دنوں تک رہی، کچھ عرصے وہ ناراض رہا پھر سب ٹھیک ہو گیا۔ قمر علی عباسی نے جانتے تھے کہ ''سب ٹھیک نہیں ہوا'' لگ بھگ پانچ دہائیوں سے نجانے کن باتوں کا غبار اب تک ذہن و دل پر چھایا ہوا ہے۔ نوعمری، لڑکپن کی ہلکی پھلکی مذاق کی باتوں کو اتنے عجیب پیراہن پہنائے جا رہے ہیں۔ قمر علی عباسی اس معاملے پر بھی ہنس کر کہہ دیتے ''کہنے دو جو کہہ رہا ہے، دوست ہے میرا''۔ یونس شرر صاحب کو شاید یاد ہو کہ جب وہ ہر چیز سے کنارہ کش ہو چکے تھے تو قمر علی عباسی نے نیویارک میں کتنی ان کی حوصلہ افزائی کی تھی کہ ان کو اپنی صلاحیتوں کو مخفی نہیں کرنا چاہیے باہر آئیں مشاعروں میں تقریبات میں شرکت کریں۔ قمر علی عباسی نے کسی سے کینہ، بغض، نفرت نہیں پالی۔ لوگوں کی کامیابیوں پر شاداں وفرحاں ہوئے۔ ایسے شخص کی اس دنیا سے جانے کے بعد تذلیل کی جائے۔ اللہ تعالیٰ بھی ہر جانے والے کا پردہ ڈھانپ دیتا ہے انسانوں کی بھلا کیا حیثیت۔

نیلوفر عباسی (نیویارک)

...... افسانوں کے دریچوں سے جھانکتی زندگی ......

کہانی کے فن کے بارے میں بہت سی باتیں کی گئی ہیں۔نظریات پیش کیے گئے ہیں۔وہ سب اپنی جگہ ہیں،اور اُن کی اہمیت بھی اپنی جگہ،لیکن یہ طے ہے کہ لکھنے والا۔۔۔کوئی بھی لکھنے والا کسی نظریے کو پیشِ نظر رکھ کر کہانی نہیں لکھتا،لکھ ہی نہیں سکتا۔کہانی لکھتے ہوئے تو اُس کے سامنے بس زندگی ہوتی ہے،اصلی زندگی۔۔۔اچھی بُری، وہ جیسی بھی ہے۔اس کا ثبوت آپ کو شہناز خانم عابدی کے اس دوسرے مجموعے ''افسانوں کے دریچوں سے جھانکتی زندگی'' کے ان افسانوں سے بھی پوری طرح مل سکتا ہے۔

شہناز خانم عابدی نے اپنے افسانوں کو،ان میں بیان کیے گئے ماجرے کو اور پیش کیے گئے کرداروں کو بیان کرنے، سنانے اور دکھانے کے لیے کسی نظریے،آرائش یا بناوٹ کا سہارا نہیں لیا ہے۔وہ سیدھی اور صاف کہانی لکھتی ہیں۔اس لیے ان کے بیان میں فلسفہ نہیں ہے اور نہ ہی کرداروں میں کوئی اجنبیت ہے۔قاری انہیں پڑھتے ہوئے خیال کی وادیوں میں نہیں،ٹھوس زمین پر رہتا ہے۔یہ افسانے زندگی کا آئینہ ہیں اور یہ کردار حقیقی انسانوں کا عکس ہیں۔ان کے دکھ سکھ سچے اور کھرے ہیں۔اس لیے ان کا اثر قاری محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔یہی کہانی کی کامیابی ہوتی ہے۔

اسد محمد خاں

''افسانوں کے دریچوں سے جھانکتی زندگی'' شہناز خانم عابدی کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے، پہلا مجموعہ ''خواب کا رشتہ'' تھا۔

فکشن، لکھنے والے فن کی وہ صنف ہے جس کے پیچھے چھپے ہوئے اس کے خالق کو اگر پوری طرح دیکھا نہیں جا سکتا ہے تو اس کی جھلک ضرور پائی جا سکتی ہے۔اور اس معاملے میں اگر مصنف نے مالِ مسروقہ پڑھنے والے کے ہاتھ میں نہیں دیا ہے تو لکھا ہوا لکھنے والے سے رو رعایت نہیں کرتا۔

شہناز خانم عابدی کی تخلیق کی دنیا وسیع دنیا ہے وہ اس میں رہی ہیں،اس میں بسنے والوں کو جانتی ہیں،ان کے ساتھ ہنس سکتی ہیں، رو سکتی ہیں اور بن پڑے تو۔۔۔کردار ہی کے روپ میں۔۔۔مداخلت بھی کر سکتی ہیں۔یہ آخری بات انہیں واقعات کا محض کیمرا بن جانے سے بچا لیتی ہے۔

سندھ ہو یا کینیڈا، یہ نہیں لگتا کہ وہ وہاں کی نہیں ہیں۔اپنے کرداروں سے وہ پہلے سے طے کی ہوئی نہ غیریت برتی ہیں نہ ان کی طرف داری جو نیشنلزم کے شکار ادیبوں کے یہاں دیکھنے میں آتی ہے۔مشاہدہ، بیان میں سچائی اور سیدھا سادا حسن ادائیگی، مطلب ان کی تحریر کے عناصر ہیں۔نفس موضوع (تھیمز) کا قحط اس فکشن نگار کے یہاں نہیں ہوتا ہے جو اپنے خول میں بند نہ ہو،شہناز خانم عابدی نہ اپنی ذات میں گم ہیں (انٹروورٹ) نہ ان کے یہاں تھیمز کی کمی ہے۔

حسن منظر

ماہنامہ
چہارسُو
راولپنڈی
سنو رادھیکا
مادھو کوشک
رینو بہل
شب نشین
شاہین
خزاں کا گیت
(افسانے)
فیروز عالم
یہی دسمبر کا مہینہ تھا
چُپ دی بُکل